ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی

# ساغرِ ادب

مظفرپور

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

ساغرِ ادب

Vol. 02, Issue 05, April to June 2020

مُدیر (اعزازی) ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 02, Issue : 05
April to June 2020

Quarterly

# SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Dr. Syed Alay Zafar

ASSOCIATE PROFESSOR
UNIVERSITY Deptt. OF URDU
B.R.A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001
BIHAR (INDIA)

Edited, Printed, Published and Owned by **Kahkashan Yasmin**,
**Printed at :** Indian Arts offset, Basement of State Bank of India, Mahendru
Ashok Raj Path, Patna : 800 006 (Bihar) & **Published From** Husaina House,
Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura, P.O. Ramna, Muzaffarpur - 842002 (Bihar)

**Editor (Hon.) : Dr. Syed Alay Zafar** Mob. : 94300 84261

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

Quarterly
SAGHAR E ADAB Muzaffarpur
(Peer - Reviewed Urdu Journal)

جلد : ۲ شمارہ : ۵ اپریل تا جون ۲۰۲۰ء

مُدیر(اعزازی) : ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر مُدیر : کہکشاں یاسمین

زرِتعاون

فی شمارہ : 200روپے،سالانہ800روپے(بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) ،تاحیات10,000روپے، دیگر ممالک60ڈالر

صفحات : ۲۰۸

تعداداشاعت : ۵۰۰

سرِورق : سیّد آلِ محتشم ، سیّدآلِ حاشر و فائزہ ظفر

کمپوزنگ : محمد امام الدین امامؔ، مظفرپور۔62061 43783

**Bank Details**

SAGHAR E ADAB, SB. A/c No. 3751050251
IFSC : CBIN 0284935
Central Bank of India, L.S. College Branch, Muzaffarpur (Bihar)

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراء سے ’’ساغرِ ادبُ‘‘ کے مُدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
کسی بھی قابل اعتراض تحریر یا دیگر متنازعہ معاملات کی قانونی چارہ جوئی صرف مظفر پور عدالت ہی میں ہوگی۔

خط وکتابت وملنے کا پتہ

The Editor
SAGHAR E ADAB
Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura
P.O. - Ramna, Muzaffarpur - 842 002 (Bihar) India
Mob. 94300 84261, 90062 53903

ISSN : 2582 - 3612

سہ ماہی

# ساغرِ ادبُ مظفر پور

(پیئر ریویوڈ اُردو جرنل)

اپریل تا جون ۲۰۲۰ء

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر
ایسوسی ایٹ پروفیسر
پوسٹ گریجویٹ شعبہ اُردو
بی۔آر۔اے۔بہار یونیورسیٹی، مظفر پور
بہار(انڈیا)

## مجلسِ اِدارت

پروفیسر ابوذر عثمانی (رانچی) — پروفیسر نجم الہدیٰ (مظفرپور)
پروفیسر علیم اللہ حالی (پٹنہ) — پروفیسر فاروق احمد صدیقی (مظفرپور)
پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور) — پروفیسر رئیس انور (دربھنگہ)
پروفیسر حمید سہروردی (گلبرگہ) — پروفیسر قاضی حبیب احمد (چنّی)
ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی (ہزاری باغ) — ڈاکٹر منظر حسین (رانچی)

## مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال (گیا) — ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ — ڈاکٹر جلال اصغر فریدی (مظفرپور)
ڈاکٹر محمد بہلول (دھلی) — ڈاکٹر سیّد محمد حبان الحق (مظفرپور) — ڈاکٹر احمد معراج (کولکاتا)



**ویب سائٹ**

www.saghareadab.in

**ای میل**

saghareadab@gmail.com
syedalayzafar@gmail.com


اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زرِ سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے ہیں۔ (ایڈیٹر)


ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹر یس **کہکشاں یاسمین** نے انڈین آرٹس آفسیٹ، بیسمنٹ آف اسٹیٹ بینک آف انڈیا، مہندرو، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ''ساغرِ اَدب''، حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ۔ سعد پورہ پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور۔ 842 002 (بہار) اِنڈیا سے شائع کیا۔

**مُدیر** (اعزازی) : **ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر**






# ترتیب


| نمبر شمار | رشحاتِ قلم | اربابِ قلم | صفحات |
|---|---|---|---|
| | اداریہ | ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر | ۶ |
| ۱ | حمد | پروفیسر نجم الہدیٰ | ۸ |
| ۲ | نعت | پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ | ۹ |
| ۳ | عطا کاکوی کی غزل گوئی | پروفیسر فاروق احمد صدیقی | ۱۰ |
| ۴ | ساختیات اور مصنّف کی فشائے تخلیق اور قرأت | پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی | ۱۶ |
| ۵ | وکیل اختر: ناقدری کی صلیب پر لٹکا ایک شاعر | پروفیسر محمد محفوظ الحسن | ۲۰ |
| | ادبِ لطیف کا اہم فنکار: مجتبیٰ حسین | ڈاکٹر محمد کاظم | ۲۷ |
| ۶ | غالب اپنے خطوط کی روشنی میں | ڈاکٹر مظہر کبریا | ۳۳ |
| ۷ | شہرِ سخن کا مسافر: نذیر فتح پوری | ڈاکٹر محمد دانش غنی | ۳۷ |
| ۸ | فیض احمد فیضؔ کی شاعرانہ انفرادیت | ڈاکٹر محمد افروز الہدیٰ | ۴۷ |
| ۹ | جدیدیت، مابعد جدیدیت: چند باتیں | ڈاکٹر نسیم احمد نسیم | ۵۳ |
| ۱۰ | محی الدین قادری زور کی لسانی خدمات | ڈاکٹر وصی احمد شمشاد | ۵۶ |
| ۱۱ | قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری ''آگ کا دریا'' کی روشنی میں | ڈاکٹر احتشام عالم | ۶۰ |
| ۱۲ | ناوک حمزہ پوری بحیثیت رباعی نگار اور تاریخ گو | ڈاکٹر مبارک حسین | ۶۵ |
| ۱۳ | بیکل اُتساہی کی نعتیہ شاعری | ڈاکٹر شبیر احمد | ۷۰ |
| ۱۴ | نواب سیّد محمد آزاد بحیثیت نثر نگار | ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن | ۷۵ |
| ۱۵ | افسانوی ادب میں غیاث احمد گدّی کا مرتبہ | ڈاکٹر شبنم پروین | ۷۹ |
| ۱۶ | کلیم عاجزؔ کی غزلوں کا اِنفراد | ڈاکٹر رعنا کوثر | ۸۴ |
| ۱۷ | میرؔ کی غزلوں میں عصری حسیّت کے عناصر | ڈاکٹر زینت آرا | ۸۸ |
| ۱۸ | حسن عسکری کا انتقادی شعور | افروز بانو | ۹۳ |
| ۱۹ | عصرِ حاضر میں ضلع نالندہ کی شعری خدمات | ڈاکٹر محمد شاہنواز رضوی | ۹۹ |
| ۲۰ | سردار جعفری کی نظمیہ شاعری | ڈاکٹر نور سیما رضوی | ۱۰۵ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۱ | جوشؔ کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی | ڈاکٹر افشاں نگار اجمل | ۱۰۹ |
| ۲۲ | منفرد فکر و اسلوب کا شاعر : فراقؔ | ڈاکٹر سائرہ بانو | ۱۱۳ |
| ۲۳ | پریم چند کے فکشن کا اسلوب | شاہنواز خان نمکین | ۱۱۸ |
| ۲۴ | اقبال کی فکر پر مولانا رومی کے اثرات | ڈاکٹر محمد رضوان | ۱۲۳ |
| ۲۵ | علامہ اقبالؔ کی شاعری کا کلیدی عنصر | ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ | ۱۲۶ |
| ۲۶ | قومی یکجہتی | ڈاکٹر ریحان احمد قادری | ۱۳۲ |


**(گوشۂ ریسرچ اسکالرس)**


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۷ | اُردو افسانہ نگاری میں خواتین کا حصہ: ایک جائزہ | ڈاکٹر نجم الدین | ۱۳۵ |
| ۲۸ | سفینۂ غم دل: ایک تنقیدی جائزہ | روشن جہاں | ۱۳۹ |
| ۲۹ | شائقؔ مظفرپوری کی غزل گوئی | محمد شاہد | ۱۴۳ |
| ۳۰ | مظہر امام کی شاعری ''زخم تمنا'' کے حوالے سے | محمد رضوان | ۱۴۹ |
| ۳۱ | جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کا مختصر جائزہ | سیّدہ تفسیر فاطمہ | ۱۵۳ |
| ۳۲ | ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری ''خلش بے نام سی'' | آسماں خاتون | ۱۵۹ |
| ۳۳ | تانیثی سروکار اور عصمت کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' | حُسن جہاں | ۱۶۴ |
| ۳۴ | مولانا شبلیؔ نعمانی کے اثرات اردو ادب پر | لطیف الرحمٰن | ۱۷۲ |
| ۳۵ | جدید ترین غزل کا شاعر : عبید الرحمٰن | گل شمع آرا | ۱۷۵ |
| ۳۶ | شمالی بہار میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش | ثمینہ خاتون | ۱۷۹ |
| ۳۷ | ادب اور جذبات | محمد آصف انصاری | ۱۸۴ |
| ۳۸ | سرسیّد کی ادبی خدمات | شبیر عالم | ۱۸۹ |
| ۳۹ | پروین شاکر کی غزل گوئی | سُنبل شاداب | ۱۹۳ |
| ۴۰ | ساغرِ ادب کا چوتھا شمارہ ( آپ کی نظر میں ) | | ۱۹۶ |






# اِداریہ

الحمدللہ ''ساغرِ ادبؔ'' کا پانچواں شمارہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اِس دَور میں جب شہیر روزگار کورونا وائرس (Covid-19) کی قفل بندیاں اور چیرہ دستیاں شباب پر ہیں ہم اللہ کے فضل و کرم سے ''ساغرِ ادبؔ'' کے رطلِ گراں کی جاں پروری اور ادب نوازی کی سرمستیاں لُنڈھانے اور لُٹانے میں کامیاب ہیں۔ عہد حاضر میں جب بیشتر لوگ گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے ہیں، انہیں پرورشِ لوح و قلم کے زیادہ مواقع مل رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر کھرا اُترنے کے لئے اِرتکازِ خیال کی زیادہ سہولتیں میسّر ہیں، جو آمد و رفت کی کثرت کی راہ کُھل جانے پر کم ہو جاتیں۔ جسم متحرک ہوتا تو سکون کی یہ دولت کہاں میسّر ہوتی۔ گویا شر میں بھی خیر کا پہلو ہے۔ اللہ کے قہر میں بھی بندوں کی بھلائی کے کچھ پہلو مُضمر ہوتے ہیں۔ اِسی کو مصلحت خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

اِس شمارے میں حسب سابق موضوعات کا اچھا خاصا تنوع ہے، لیکن ایک فرق ہے۔ بعض مضامین کو دیکھ کر آپ کو ایسا لگے گا کہ بطور خاص ''ساغرِ ادبؔ'' کے اِسی شمارے کے لئے لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ یعنی مضمون نگار نے اِرتکازِ خیال کے لئے کافی پُرسکون لمحات فارغ کئے ہیں اور جو کچھ لکھا ہے بہت ڈوب کر لکھا ہے گویا اگر یہ حجرہ نشینی اور عزلت گزینی نہ ہوتی تو وہ اِس طرح ذہن و دل مرکوز کر کے نہیں لکھ پاتے۔

ہمارے لئے یہ دَور انتہائی رنج و محن اور اندوہ و قلق کا دَور بھی ہے، جس میں اردو نثر میں طنز و مزاح کے لاثانی اہلِ قلم مجتبیٰ حسین کی رحلت ہوئی۔ بقول شخصے روتے ہوؤں کو ہنسانے والا اپنے پیچھے بے شمار قدردانوں اور سوگواروں کو روتا ہوا چھوڑ گیا۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد کاظم کا انتہائی اہم مضمون ''ادب لطیف کا اہم فنکار مجتبیٰ حسین''، اِس شمارے کی زینت ہے۔ دیگر مضامین کے موضوعات میں تنوع ہے لیکن اہلِ قلم جو اِس شمارے میں شامل ہیں، غالباً آپ کے لئے نئے نہیں ہیں۔ اگر کوئی نام آپ کو نیا لگتا ہو تو وہ درحقیقت جانا پہچانا ہی ہے۔

ریسرچ اسکالرس کے مضامین بھی اِس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ نئے لکھنے والوں میں بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ ابھی اُن کے نمودار ہونے، پنپنے اور پروان چڑھنے کا وقت ہے۔ خدا کرے اُن کا یہ ذوق اور بالیدہ ہو۔

اُمید ہے کہ اگلا شمارہ بھی ہم آپ کی اُمیدوں کے مطابق پیش کر سکیں گے اور اس شمارے کے بارے میں بیش قیمت تاثرات جاننا چاہیں گے تا کہ ہم اسے اگلے شمارے میں شائع کر سکیں۔

یہ کورونا وائرس (Covid-19) بھی عجیب چیز ہے۔ عالمگیر بیماری ہے۔ موذی، مہلک، متعدّی اور پریشان کُن۔ اِس نے اقتصادی مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ سارے عالم میں لاک ڈاؤن نے معاشی بُحران پیدا کر دیا

ہے۔ یومیہ مزدور، ٹھیلے پر سامان بیچنے والے خوانچہ فروش، سائیکل رکشا اور آٹو رکشا چلانے والے، سامان ڈھونے والے قلی اور مزدور، کارخانوں میں کام کرنے والے ملازم لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں بھوکوں مر رہے ہیں۔ اونچی عمارتیں بنا کر دوسروں کو دینے والے چھوٹے موٹے مزدور آج بے سروسامان ہیں۔ اُن کے سروں پر آسمان نہیں ہے۔ پیروں تلے سے زمیں سرک گئی ہے۔ ریل کی پٹری پکڑ کر پیدل گھر جانا چاہتے ہیں بمبئی سے بہار تک۔ تلنگانہ سے یو۔پی۔ تک۔ تو ریل کی پٹری پر چلنا شروع کرتے ہیں اور کوئی مال گاڑی آ کر انہیں کچل ڈالتی ہے۔ سڑکوں سے ہو کر جانا چاہتے ہیں تو بے لگام تیز رفتار ٹرک سے کچل کر مارے جاتے ہیں۔ دوسروں کے لئے کھیتوں میں مزدور کی حیثیت سے غلّہ اُگانے والوں کو ایک وقت کی روٹی کے لئے کسی اہلِ خیر یا کسی حکومت کے ٹکڑوں کے لئے قطار لگا کر بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ اس صورتحال نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے قفل بندی ہو رہی ہے، تخمین وظن کے ماہرین کے نزدیک بیماری سے زیادہ اموات فاقوں سے مرنے والوں کی ہو رہی ہے۔ اور اگر یہی عالم رہا تو بیماری پیچھے چھوٹ جائے گی۔ پوری دنیا میں بھوکوں مرنے والے کروڑوں کروڑ لوگ ہوں گے۔ جن کو کورونا وائرس (Covid-19) کی نہیں دوسری عام بیماریوں کی دوا بھی نہیں مل سکے گی۔ مختلف خبروں کے درمیان ایک خبر یہ بھی آئی کہ جسمانی فاصلے بڑھا دئے گئے۔ جو لوگ باہر نکلتے تھے گھر میں رہنے پر مجبور کر دئے گئے۔ ایک گھر میں رہنے والوں کے درمیان ''دو گز کی دوری، بہت ضروری'' جیسے فارمولے پر کیسے عمل ہوگا۔ عجیب وغریب خبروں میں ایک خبر یہ بھی آئی کہ اس کورونا وائرس کی وجہ سے پوری دنیا میں کروڑوں کم عمر جوڑے والدین بننے والے ہیں۔ اخبار مذکور کا گلہ یہ تھا کہ ولادت کی سہولتیں اس لاک ڈاؤن میں دستیاب نہیں ہوں گی۔ بعض بچے پیدائشی طور پر کمزور پیدا ہوتے ہیں، بعض سرجری سے پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں انکیوبیٹر (Incubator) میں رکھا جاتا ہے اس کے اخراجات کے متحمل سب لوگ نہیں ہو سکیں گے۔ لاک ڈاؤن چلتا رہے گا جولائی تک اور ولادتوں کا سلسلہ فروری مارچ سے امکانات شروع ہونے کے بعد چلتا رہے گا نومبر دسمبر تک۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے کیا یہ ایک انسانیت کے لئے لمحۂ فکریہ نہیں ہے۔ شاعر و ادیب کا دل و دماغ رکھنے والوں کے لئے دعوت غور و فکر دینے کا یہ موضوع بہت ہی مہتم بالشان ہے۔ ہم اگلے شمارے کے لئے اہلِ قلم کو تسوید و تحریر کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کرونا وائرس نے عید الفطر کو بھی متاثر کیا ہے۔ ''نمازیں گھر میں پڑھیں'' تو ہم نے پڑھ لی نماز۔ ملنا ملانا بھول گئے۔ کہاں کا معانقہ، کورونا میں گلے ملنا؟ ارے خواب و خیال ہے بھائی۔ مصافحہ بھی مت کیجئے۔ دور سے صاحب سلامت، مبارکباد، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ عجیب صورت حال ہے۔ اس پر بھی اظہار خیال ہو سکے تو کیجئے۔

**۵/جون ۲۰۲۰ء** **ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر**

ISSN : 2582 - 3612



## پروفیسر نجم الہدیٰ

# حمد

## لا اِلٰہ اِلّا اَنْتَ یَا اَللہُ

خالقِ ارض و سما ، تیرے سوا کون ہے!
مالکِ روزِ جزا ، تیرے سوا کون ہے!
جب بھی بھنور میں گھرا ، تو نے سہارا دیا
ذاتِ صمد اے خدا ، تیرے سوا کون ہے
یار ہیں یوں تو سبھی ، کون کرے یاوری
مرجع و مولیٰ مرا ، تیرے سوا کون ہے!
زخم لگائے کوئی ، درد بڑھائے کوئی
میرے دکھوں کی دوا ، تیرے سوا کون ہے!
جرم و خطا بے شمار ، بخش دے آمرزگار
بخشنے والا شہا، تیرے سوا کون ہے!
کون ہے جو بخش دے ، بے طلب و بے حساب
صاحبِ وہب و عطا ، تیرے سوا کون ہے!
زر ہے کسی کے لئے ، اور کسی کا رسوخ!
نجم کا حاجت روا ، تیرے سوا کون ہے!

☆

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر عبدالمنّان طرزیؔ

# نعت شریف

کوئی آرزو نہیں ہے، کوئی مدّعا نہیں ہے
بلا شبہ تو بشر ہے، تو کبھی خدا نہیں ہے

ہے خدائے پاک مُعطی، ہے تو ہی قسیمِ نعمت
کوئی ہے جو دشمنوں کو دے قبائیں اور دُعائیں

وہ کہاں سے پائے منزل، جو نہ آئے تیرے در تک
یہ فلک، یہ ماہِ تاباں، یہ کواکبِ درخشاں

تو ضیائے شمعِ ایماں، تو جمالِ بزمِ عرفاں
یہ عروجِ ماہِ اَسریٰ، یہ شکوہِ سّرِ اَدنیٰ

رُخِ مصطفیٰ کے جلووں سے ہو بہرہ مند وہ بھی
اے ضیائے ماہِ طیبہ! کوئی اک کرن ادھر بھی

یہ یہاں کی کامیابی، نہ وہاں کی کامرانی
وہی زندگی سنوارے، وہی عاقبت بنائے

تری رحمتوں پہ شاہد ہے دعائے اِھْدِ قَوْمِی
ابھی دعویٰ محبت، نہیں معتبر ہے طرزیؔ

مَیں غلامِ مصطفیؐ ہوں، مرے پاس کیا نہیں ہے
کوئی کیا بتائے لیکن، تو کیا ہے کیا نہیں ہے

''ترے در سے ہاتھ خالی، کوئی لوٹتا نہیں ہے''
تری رحمتوں کی آقا، کوئی انتہا نہیں ہے

وہ خدا کا بھی نہ ہوگا، جو رسول کا نہیں ہے
ترے نورِ حق نما سے، کسے کیا مِلا نہیں ہے

ترے حسن کا تبسّم، کہیں نارسا نہیں ہے
تری طرح لامکاں تک کوئی بھی گیا نہیں ہے

مری چشمِ نم کا قطرہ، جو ابھی گرا نہیں ہے
ابھی ظلمتوں سے خالی مرا گھر ہوا نہیں ہے

جو دل و نگہ کا مرکز ترا نقشِ پا نہیں ہے
ترے راستے سے ہٹ کر، کوئی راستہ نہیں ہے

کہ رسول تیرے جیسا، کوئی دوسرا نہیں ہے
ترا خونِ دل بھی آنسو، ابھی بن سکا نہیں ہے

☆☆☆





پروفیسر فاروق احمد صدیقی

# عطا کاکوی کی غزل گوئی

(جمالِ غزل کے حوالے سے)

پروفیسر عطا کاکوی (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۸ء) اُردو کی ایک کثیر الجہات شخصیت کا نام ہے۔ ایک بافیض اُستاذ، شاعر، مبصر، مدوّن اور محقق کی حیثیتوں میں اُنہوں نے اپنی پہچان بنائی۔ اور تاعمر اہلِ علم وادب کے لئے مرکزِ توجہ بنے رہے۔ ان اوصاف وکمالات کے علاوہ وہ بہت ساری شخصی اور ادبی خوبیوں کے بھی حامل تھے۔ یعنی ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اُردو کے ساتھ فارسی میں بھی اُن کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ان دونوں میں ان کی وقیع خدمات تقریباً پون صدی پر مشتمل ہیں۔ اتنی طویل مدت تک بہار میں شاید ہی کسی کی ادبی وابستگی رہی ہو۔ اس لئے پورے یقین واعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُردو کے اُن اکابر شعروادب میں مقامِ اِمتیاز پر فائز ہیں، جن کے وجود پر ہماری تاریخِ ادب اُردو کو ناز وافتخار رہے۔ اور خاص دبستانِ نعت بہار کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو وہ اپنے اُستاد جناب شادؔ عظیم آبادی کے اس معروف شعر کے حوالے سے اپنا تعارف کراتے سنائی دیں گے۔ (زبان قال سے نہ سہی، زبان حال سے ہی سہی) ؎

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کو نہیں نایاب ہیں ہم　　تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

انہوں نے اُردو، فارسی کی کئی نسلوں کی ذہنی پرورش اور علمی وادبی قیادت کی ہے۔ بہار میں اُن کے تلامذہ اور فیض یافتگان کا سلسلۂ نجوم نظر آتا ہے۔ جن میں سے چند کے سامنے راقم نے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ ایک بار میں نے براہِ راست بھی اُن سے استفادہ کیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ لفظ زَبان درست ہے، یا زُبان۔ انہوں نے فوراً جواب عنایت فرمایا کہ دونوں طرح سے درست ہے۔

اس وقت میرا موضوع عطا کاکوی کی شاعری ہے۔ اس لئے ان کی دیگر حیثیات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک شاعر ہی نہیں، استاد الشعراء تھے۔ لیکن بوجوہ اُن کے ہم عصروں میں جمیلؔ مظہری، پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی کے بعد ہی ان کا نام آتا ہے۔ یہ کسی ناقد ومحقق یا ادبی

جیوری کا فیصلہ نہیں، بلکہ زمانے کا فیصلہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جمیلؔ، پرویزؔ اور اجتبیٰؔ کی تثلیث کی ایک زمانے میں بڑی دھوم تھی، مگر عطا کاکوی اس میں کبھی شامل نہیں کئے گئے۔ حالانکہ مجموعی خدمات کے لحاظ سے وہ ان تینوں پر فائق تھے۔ حاصلِ بحث یہ کہ ان کا شاعرانہ مقام و مرتبہ ان اصحابِ ثلاثہ کے بعد ہی آتا ہے اور آج بھی اہلِ علم و ادب کا مجموعی تأثر یہی ہے۔

عطا کاکوی کا ادبی سفر ہی شاعری سے شروع ہوتا ہے اور شاعری میں بھی غزل، نظم اور رباعی کو انہوں نے بطورِ خاص وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور ان تینوں میں بھی صنفِ غزل سے ان کو زیادہ دلچسپی اور فطری مناسبت رہی ہے۔ وہ خود ہی رقمطراز ہیں :

''میری طبیعت کا میلان نظموں کی بہ نسبت غزلوں کی طرف زیادہ ہے اور
غزلوں کے بعد رُباعیوں کی طرف۔''

(بحوالہ عرضِ حال کاروانِ خیال۔ مجموعۂ منظومات)

اُن کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''جمالِ غزل'' کے نام سے ۱۹۷۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں ''پیشِ گفتار'' کے عنوان سے یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں :

یہ مجموعہ ''جمال غزل'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے۔ اگر بااسم مسمّٰی ہے تو
آپ کا حسنِ ظن ہے، ورنہ اپنے خیال میں نہ تو اس میں حسنِ افکار ہے اور نہ
حسنِ گفتار بلکہ محض آپ بیتی ہے۔

اپنے شعروں ہی میں کہتا ہے وہ اپنا احوال　　　　اُس کے شعروں کو وہ سمجھے جو عطا کو سمجھے''

راقم کے مطالعے اور جائزے کے مطابق سطور بالا میں حضرتِ نے عطا انکسار سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ اس مجموعۂ غزل میں حسنِ افکار بھی ہے۔ حسنِ گفتار بھی اور آپ بیتی بھی۔ میں اپنی بات حسنِ گفتار سے شروع کرتا ہوں۔

یہ تو مسلّم ہے کہ شاعری اگر شعری لطافت اور حسنِ بیان سے محروم ہو تو وہ فکرِ منظوم کا سپاٹ نمونہ کہلائے گی اور ادبی کوڑے دان اس کی مناسب جگہ ہوگی۔ طرزِ بیان کی تازگی، طُرفگی اور لالہ کاری ہی کسی شعر یا شاعری کو حیاتِ دوام عطا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم یکھیں تو عطا کاکوی کی غزلیں ہمیں مایوس نہیں کرتیں۔ دراصل اس رخ سے تفہیم عطا کی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے ورنہ صد جلوہ رُو برو ہے جو مژگاں اُٹھایئے کا پُر کیف منظر نظر آئے گا۔ یہ جوشِ عقیدت میں نعرۂ مستانہ نہیں، حقیقت کی جستجو اور اُس کا برملا اعتراف ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کلیاں جو تبسم کی چٹکیں، ہونٹوں پہ چمن گلریز ہوا　　　　پھیلی جو ہوا میں ضو اُس کی، تو نشّہ نکہت تیز ہوا





پھولوں کی مہک، بُلبل کی چہک سے خاک بہلتا دل اپنا　　　　کم بخت چمن کا یہ منظر تو اور اشک انگیز ہوا
ہے داغِ دل میرے سینے میں ارغواں کی طرح　　　　ہرا بھرا میرا صحرا ہے گلستاں کی طرح

اسرارِ الم ہیں پردہ نشیں، آنکھوں سے نہ افشاں ہو جائیں　　　　ہو دل میں ہجومِ غم لیکن، چہرے پہ تبسم پیدا کر

وہ پیکرِ مہر و ماہ و انجم میں اپنا جلوہ کھا رہے ہیں　　　　طرح طرح سے میری متاعِ نظر کو وہ آزما رہے ہیں

چمن میں رنگِ گلاب ہوکر، فضا میں کیفِ سحاب ہوکر　　　　کسی حسیں کا شباب ہوکر، جمالِ رعنا دکھا رہے ہیں
کہیں ہے وہ گل میں رنگ ہوکر، کہیں ہیں مئے میں ترنگ ہوکر　　　　کبھی نگہ میں خدنگ ہوکر، وہ میرے ل میں سما رہے ہیں

یہ ایک دو غزل کا رنگ نہیں، بلکہ ''جمالِ غزل'' میں شامل تقریباً تمام غزلوں کے دو تین اشعار جمالیاتی حسن اور شاعرانہ آب و رنگ سے مزیّن اور معمور نظر آتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے کیوں کہ میرؔ و غالبؔ کی بھی تمام غزلوں کے تمام اشعار فنی اور ادبی محاسن کے آئینہ دار ہوں، ایسا نہیں ہے۔ میں پھر اپنی اس بات پر اصرار کر رہا ہوں کہ عطا کاکوی کے غزلیہ اشعار کی جمالیات کا احاطہ کرنے کی آج تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی ہے۔ یہ یقیناً حیرت و افسوس کا مقام ہے

اور اب میں ان کے حسنِ افکار کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اہلِ علم و فہم پر یہ نکتہ روشن ہے کہ شاعری کبھی طرزِ ادا کی دلکشی کی وجہ سے ادب کے دربار میں مسند نشیں ہوتی ہے اور کبھی فکر و احساس کی نُدرت کی بدولت دلوں پر راج کرتی ہے اور اگر ان دونوں چیزوں یعنی فکر و فن کا حسین لبادہ اوڑھ کر نمودار ہوئی تو پھر کیا کہنا ہے۔ اس کو شاہکار کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ زمان و مکان کے حدود و قیود کو توڑ کر پورے آفاق میں محترم بن جاتی ہے۔

''جمالِ غزل'' کی پہلی غزل کا یہ مطلع ملاحظہ ہو جس میں فکرِ بلند اپنے عروج پر ہے۔ اس میں تہہ داری بھی ہے۔ ساتھ ہی اس پر ابدیت اور آفاقیت کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔

چھپے ہوئے پہ بھی ظاہر جمال ہے کیسا !　　　　جمالِ یار کا حسنِ کمال ہے کیسا !

حسنِ افکار کے حوالے سے یہ شعر بھی توجہ طلب ہے۔

قابلِ رشک اسی شخص کا ایمان ہوا　　　　دیکھ کر آپ کا چہرہ جو مسلمان ہوا

تاریخِ اسلام کی روشنی میں اس ایک شعر میں جو بات کہہ دی گئی ہے اس کی صداقت پر عالمِ بالا کے ساکنین بھی جھوم اُٹھے ہوں گے۔ اپنے ایک شعر میں وہ زندگی کرنے کا یہ قیمتی مشورہ دیتے ہیں کہ۔

دو روزہ زیست کو اتنا نہ سوگوار بنا غم و الم کو بہر حال خوشگوار بنا

اس شعر پر فارسی کے بلند پایہ شاعر مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے اس شہرۂ آفاق شعر کا عکسِ جمیل مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ۔

زندگی در گردنم افتاد بیدلؔ چارہ نیست شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن

ہر صاحبِ نظر محسوس کرسکتا ہے کہ عطا نے اپنے شعر میں جو حیات آفریں پیغام دیا ہے اس کی صداقت مسلم ہے۔ان کا یہ شعر بھی کتنا ولولہ انگیز اور زندگی بدوش ہے ۔

خدا کا شکر کہ پائے طلب ہے ایذا کوش وہ جادہ کیا کہ نہ ہو جس میں کوہ یا دریا

بہت ممکن ہے کہ یہ شعر کہنے کی تحریک ان کو آتش کے درجہ ذیل شعر سے ملی ہو، جو اُن کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں ۔

تھکے جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتشؔ گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

بہرکیف عطا کے شعر کی فکری معنویت ہر دور میں محسوس کی جائے گی کہ رہِ حیات میں مصائب و آلام کے سَرِ پُرغرور کو خاک میں ملا کر ہی کامیابی وشادمانی ملتی ہے اور یہ کام عزمِ راسخ اور بلند حوصلہ سے ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس مزاج وقماش کے سینکڑوں اشعار جمالِ غزل میں موجود ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ مقصود نہیں۔

ہماری تنقیدِ جدید اِن دنوں شاعر کے کلام میں عصری حسیت کی تلاش وجستجو پر بڑی کڑی نظر رکھتی ہے۔عصری حسیّت سے مراد ہے عصری زندگی کو درپیش، گونا گوں مسائل ومصائب سے واقفیت اور اُس کی اپنے کلام میں فنکارانہ عکاسی وترجمانی جو انسانی زندگی کی تعمیر وتزئین میں مثبت کردار عطا کرسکے۔عطا کاکوی کے دور میں اس کی یہ اہمیت نہیں تھی جو آج ہے۔اس کے باوجود ان کی غزلوں میں کچھ ایسے اشعار موجود ہیں جو عصری حسیّت سے معمور نظر آتے ہیں اور آج کے ملکی اور بین الاقوامی مُہیب حالات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں اشعار ذیل دیکھیں ۔

جہاں ہر روز ہو تماشا رقصِ بسمل کا وہاں خوں سے بھرا قاتل کا داماں کون دیکھے گا

جلا جو اُس کا نشیمن تو پھر بنائے کہاں چمن کو چھوڑ کر بُلبل غریب جائے کہاں

ہاتھوں سے لُٹاتے تھے عطاؔ کل جو زر و مال آنکھوں سے لُٹاتے ہیں وہی لعل و گہر آج





رہے تھے جس چمن میں کل بہار گُلفشاں ہوکر ہوا اُکھڑی کچھ ایسی، رہ گئے وقفِ خزاں ہوکر

ہے عبرت کا تماشہ انقلابِ دہر تو دیکھو ہوا اُکھڑی کچھ ایسی رہ گئے وقفِ خزاں ہوکر

یہ دیکھنا ہے کہ ہوتا ہے کون شرمندہ مری نظر سے نظر تم ملا کے دیکھو تو

کرے کوئی کس پہ اب بھروسہ، ہوا عدو جس کو دوست سمجھا خدا ہی حافظ ہے کارواں کا، جو راہبر تھا وہ راہزن ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ عطاؔ کاکوی کی غزلوں میں اپنی شعری وادبی روایات کا بڑا احترام ملتا ہے۔ انہوں نے گل وبلبل کے مضامین بھی باندھے ہیں اور حسن وعشق، اخلاق وتصوف، سیاست اخلاق ومُدن اور پند وموعظت کی باتیں بھی کی ہیں، لیکن بڑے سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ۔وہ جانتے تھے کہ غزل کی شریعت میں کُھل کر باتیں کرنا ممنوع ہے۔رمزیت اور ایمائیت اُس کی روح ہے۔باالفاظِ دگر صنفِ غزل میں ع

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی ست

اس نکتہ کا فنکارانہ مظاہرہ اشعار ذیل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے ۔

خدا جانے بھرا تھا درد کیا بلبل کے نالوں میں کہ جن کو سن کے پھولوں نے گریباں چاک کرڈالا

ہونٹوں پہ اس کے بادۂ گلرنگ کا فروغ جیسے چمن میں بھور کو کھلتا ہوا گلاب

دیکھ کے میرے جوشِ جنوں کو دور بیاباں بھاگے ہے شور مری زنجیرِ پا کا سن کے زنداں بھاگے ہے

اپنے ملک کے موجودہ حالات کے تناظر میں اُن کی ایک غزل ملاحظہ ہو جس کا ہر شعر اِک مقام سے ہے۔ یہ غزل یقیناً آج سے کوئی نصف صدی پیشتر کہی گئی ہے۔ کیونکہ جمالِ غزل کی اشاعت ہی ۱۹۷۰ء میں ہوئی ہے۔اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی حالات سے دل برداشتہ ہوکر شاعر نے جو باتیں کہی تھیں ان کی اہمیت ومعنویت آج بھی علیٰ حالہٖ باقی وبرقرار ہے۔(بلکہ ان کی شدت اور حدّت میں کئی گنا اضافہ ہی ہوا ہے۔) پھر بھی شاعر کے جذبۂ حب الوطنی اور رجائیت پسند طبیعت کو داد دیجئے کہ اپنے ملک ہندوستان سے غیر معمولی محبت، وفاداری اور والہانہ لگاؤ پر وہ کس قدر مسرور ومطمئن ہے اور یہی ذہن ومزاج آج بھی ہر مسلمان شاعر اور شہری کا ہے۔غزل پڑھئے اور سر دُھنئے ۔

محروم ہیں خود اپنے چمن میں ثمر سے ہم بیٹھے ہیں پھر بھی آس لگائے شجر سے ہم

تیرے ستم کا دے نہ سکے ایک بھی جواب مجبور ہوکے حکم قضا و قدر سے ہم

اب دل کو حادثات کا احساس تک نہیں — ہنس ہنس کے جور سہنے لگے، بے خطر سے ہم
وہ پوچھتے پھریں کہ دُکھا ہے کسی کا دل — واقف نہ تھے خود اپنی فغاں کے اثر سے ہم
ظلمت تو دور ہوگی ذرا آشیانے کی — خائف ہوں کیوں تبسم برق و شرر سے ہم
ہمت سے کام لیں تو نہیں تیلیوں کی خیر — سمٹے قفس میں کیوں رہیں بے بال و پر سے ہم
اِک شاخ جل گئی تو کریں دوسری تلاش — مجبور ایسے بھی تو نہیں بال و پر سے ہم
اب اے عطا وہ طبع سخن آفریں کہاں — بے کیف ہیں نظارۂ شام و سحر سے ہم

یہ آج کی آواز ہے جس میں زور وشور، قوت وتوانائی اضطراب و التہاب ، بلند حوصلگی اور استقامت محسوس کی جاسکتی ہے۔ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا اور یاسیت کے شکار لوگوں کو بطورِ خاص یہ غزل جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اسی لئے میں پورے تیقن کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عطا کا کوی اپنی غزلیہ شاعری کی بدولت بھی زندہ رہیں گے ان کے ایک مقطع پر میں اپنی گفتگو ختم کر رہا ہوں کہ ؎

میرا ذمہ جو نہ اشعارِ عطا آئیں پسند — کھول کر بھی تو ذرا دیکھئے دیواں اُس کا

**Prof. Farooque Ahmad Siddiqui**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur - (Bihar)
Mob. : 98356 60835





پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

# ساختیات اور مصنّف کی فشائے تخلیق اور قرأت

ساختیات، پس ساختیات اور ردّ تشکیل کے ساتھ امتزاجی تنقید اور تخلیقیت پسند تنقید کے کئی اہم ناقد اُردو کے دامن کو وسیع کرتے رہے ہیں۔ ان میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، فہیم اعظمی، نظام صدیقی، ریاض صدیقی، قاضی قیصر الاسلام، جاوید حیدر جوئیہ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

ساختیات اور مصنف کی فشائے تخلیق اور قرأت کی معنی یابی کے عمل کو نشان زد کرتے ہوئے جوئیہ نے وقوع و وجود کو نشان زد کیا ہے اور قدر متن اور معاشرتی سطح پر کلچر کے نشانات کا ساختیاتی مطالعہ دیدہ ریزی سے پیش کیا ہے۔

نشان (Sign) کی شرائط درج ذیل ہیں :

- ☆ اس کی مادی صورت ہو یعنی اسے محسوس کیا، سنا، دیکھا، سونگھا یا یکجا کیا جا سکے۔
- ☆ اپنے بجائے کسی دوسرے یا دوسروں کی نمائندگی کرے۔
- ☆ بطور نشان متفقہ طور پر کلچرل میں مسلّم اور زیر استعمال ہو۔

جاوید حیدر جوئیہ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

> ’’ہمیں اپنے اردگرد بہت سے نشانات نظر آتے ہیں۔ مثلاً چوک میں یا کسی موڑ پر نصب سرخ، پیلی اور سبز بتیاں بالترتیب رُک جائیں، آگے بڑھنے کے لئے تیار ہو جائیں اور آگے بڑھنے کی نمائندگی کرتی رہیں ۔ یہ بتیاں نشان ہیں۔ اسی طرح پگڑی، عزت ووقار اور بزرگی کا نشان ہے۔ سبز وسفید پرچم ایک ملک وقوم کا نشان ہے۔‘‘

دراصل معنی (Meaning) ان نشانات کے مادے (Material) میں نہیں بلکہ اس خیال (Notion) میں ہے جو ان سے ایک کلچرل نے مل جُل کر وابستہ کیا ہے، سوسئر نے نشان کے مادی حصّے (Material form) کو ’’دال‘‘ (Signifier) اور اس سے وابستہ خیال کو ’’مدلول‘‘ (Signified) کہا ہے۔ جب کہ خود ’’شئے‘‘ جس کی نمائندگی کی گئی ہو Referent کہلاتی

ہے۔ نشان جس ''شئے'' سے بنتا ہے اس کا تعلق معنی سے نہیں ۔ گویا نام دینا من مرضی والا (Arbritrary) کام ہے۔اس طرح ایک دال کے بیشتر مدلول اور ایک مدلول کے متعدد دال ممکن نہیں ۔دراصل ساختیات میں زیادہ تر نشان کے اسی تصور کو کلچر کے مطالعے کے لئے برتا گیا ہے۔ویسے کلچر میں ادب، مصوری، موسیقی، لوگوں کے معاشی، سیاسی، جمالیاتی اور تفریحی رویے، عقائد، اقدار، رسوم ورواج سب شامل ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جو کچھ ماضی اور تاریخ سے ایک سماج میں موجود ہے وہ بھی کلچر کا حصہ ہے۔ایک اور زاویے سے دیکھیں تو کاروباری لوگوں کا کلچر، زراعت سے وابستہ لوگوں کا کلچر، صنعت و حرفت سے منسلک اَفراد کا کلچر اور شہر اور گاؤں کے اور ان کے مخصوص علاقوں میں لوگوں کے اپنے اپنے کلچر ہیں۔ ہر کلچر کے افراد ایک دوسرے سے باہم تبادلۂ معانی (Communication) کرتے ہیں جو ان کے اپنے کلچر کے نشانات کے ذریعے ہوتا ہے۔

سوسیئر کی فکر یہ ہے کہ نشانات کا ماضی ان کے حال ہی میں موجود ہوتا ہے۔! اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نشانات لمحۂ موجود میں جن اصول وقوانین کے ذریعے معنی دے رہے ہوتے ہیں، وہ ماضی یا تاریخ سے گزر کر آئے ہوتے ہیں اور ان اصولوں پر سب کا اتفاق ہو چکا ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہر کلچر کی زبانیں نشانات پر مشتمل ہوتی ہیں اور متفق علیہ قوانین کے تحت اور ان کی رو سے لمحۂ حاضر میں کارفرما ہوتی ہیں۔ لہٰذا نشانات کا مأخذ (Origin) جاننے سے ساختیات سروکار نہیں رکھتی بلکہ نشانات کی حامل زبان کے اصول وقواعد کی کھوج لگا کر وہ سب کچھ جاننا چاہتی ہے جسے اس کلچر کا فہم عالم (World View) کہتے ہیں۔اس طرح ساختیات یک زمانی (Synchronic) ہے۔ اصطلاح میں متن کلچر کے کسی بھی نشانیاتی یا معنیاتی نظام ( Signifying System) کا وہ حاصل (outcome) ہے جو ''پڑھا'' جائے۔ یعنی یہ ایک کلچر تشکیل (Construction ہے۔اس کی تمہید اس طرح ہو سکتی ہے کہ چونکہ ہر نشانیاتی یا معنیاتی نظام ایک زبان رکھتا ہے۔اس لئے ''پڑھا'' جا سکتا ہے۔ ٹیلی ویژن کا پروگرام ایک الیکٹرونک متن ہے۔اخبار کی خبر صحافتی متن ہے۔گاؤں کا کوئی میلہ دیہاتی رسمی متن ہے۔ایک صنعتی نمائش کمرشیل متن ہے۔ویڈیو یا آڈیو، سی۔ڈی۔ یا کیسٹ، سمعی وبصری متن ہیں، انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ ورچوئل (Virtual) سمعی وبصری متن ہے۔غزل، افسانہ، ناول، نظم، کتاب سب متون ہیں۔کلچر کے افراد متون کی زَد میں ہیں۔انسانی شعور ان ہی متون سے تشکیل پاتا ہے۔یعنی مختلف Signifiers اور Signifieds مختلف انواع کی زبانوں کے یہاں موجود رہتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے ژاک لاکاں کے نظریے کو پیش نظر رکھیں تو لاشعور بھی زبان کے ساتھ ہی وجود میں آجاتا ہے اور زبان کی طرح کام کرتا ہے۔ ہر متن کچھ رسوم یعنی کنونشنز کو بروئے کار لا کر

ISSN : 2582 - 3612



لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

ادب کی ساختیاتی تشکیل وقرأت کے اصول کے تحت ساختیات میں متن بین المتونیت کا حامل ہوتا ہے اور ''لفظ'' لٹریچر کی زبان کا نشان ہے۔اس کی زَد (Range) پیراڈائم کہلاتی ہے۔ساختیات میں یہ (Paradigmatic) چناؤ کہلاتا ہے۔اس کی اور Syntagm دریافت کرنے کی ساختیاتی قرأت میں بہت اہمیت ہے۔متون میں کوڈ اور ربطی رشتے کی مماثلت اور قربت کو واضح کرتے ہوئے استعارہ (Metaphor) اور مجاز مرسل (Metonymy) کے تحت وجود میں آنے والے اصول کی تفصیل اس طرح ہے کہ زبان کے کئی اصول ہیں جن سے ایک ہی Message کو کئی طرح سے کوڈ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً، زید نے بکر کا کام کیا، اسے اگر یوں لکھا جائے کہ بکر نے زید سے کام لیا تو معنیٰ کم وبیش ایک ہے۔لیکن ان کی ترکیب (S y n t a x) بدل گئی ہے۔ جس سے نشانات کے Paradigmation اور Syntagmetic دونوں رشتوں میں فرق آیا ہے۔نوام چامسکی کا کہنا ہے کہ زبان کے غیب حصے میں ایک گرامر ہے جو انفرادیت کو جنم دیتی اور نشانات کے رشتوں کی تقلیب کرتی ہے۔ گویا ان کی نوعیت بدل ڈالتی ہے۔ وہ اسے نشانات کی تقلیبی گرامر ( Transformational Grammer) کا نام دیتا ہے اور زبان کی اس غائب ہیئت کو اہلیت (Competence) کہتا ہے۔

اس طرح ایک فن پارے میں کئی کوڈ سامنے آتے ہیں جو ایک جملے سے لے کر استعارہ، تمثیل، کردار، علامت، کرداروں کے رویوں، ان کی خصوصیات اور کلچر کے مختلف معنیاتی نظاموں سے ان کرداروں کے رشتوں اور دیگر صنائع بدائع سے فن پارے کا متن بناتے ہیں۔ اس لئے ادبی تحریروں میں زبان کا Communication System بدل بھی جاتا ہے۔اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ اس متن کو کیسے پڑھتا ہے، ساختیات میں قاری (Reader) کی اہمیت مرکزی ہے، زبان کی اہمیت لکھنے کی ہے اور لکھاری محض ذریعہ ہے۔یعنی Language Writes not Writer، لکھت لکھتی ہے، لکھاری نہیں۔ لکھے ہوئے کو بغیر لکھاری کا نام ظاہر کئے ہوئے پڑھا جا سکتا ہے اور معنیٰ کے مناظر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔اسی تناظر میں رولاں بارت لکھتا ہے :

''Ther Author is Dead,۔مصنف مر چکا ہے۔''

بارت نے گوشت پوست کی انسانی ہستی کی موت کا اعلان نہیں کیا بلکہ لکھاری پر نشانیاتی زبان اور لسانیات کی برتری بتائی ہے اور یہ بات ان قضایا کا منطقی نتیجہ ہے جو ساختیات اپنے مطالعے کے لئے بروئے کار لاتی ہے۔یعنی لکھنا، بولنا زبان کی وجہ سے اور اس کی رو سے ہے اور زبان کسی کی شخصی ملکیت نہیں، کلچر سے آئی ہے، اس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اب کوئی ''شخص'' نہیں ہے جو لکھتا ہے، بلکہ ایک موضوع

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

(Subject) ہے وہ تحریر کا ایک لمحہ ہے۔ Linguistically, the author is never more than the instance writing. Just as/is nothing other than the instance saying/ Language knows a "subject" not a "person" and this subject , empty outside of the every enunciation which definesit, suffices to make laguage , hold together, suffices that is to say, to exhaust it.........."

(the death of the Author : Roland Barthe)

ویسے بارت نے لکھاری کا اثبات بھی کیا ہے۔ ''نام'' ضروری ہے کہ اسے ایک Norm کا درجہ حاصل ہے۔ اور ایک نام بطور ایک لسانی نشان کے دوسرے ناموں سے فرق (Difference) کا رشتہ قائم کرتا ہے اور پہچان کراتا ہے۔ ''یہ'' اعتباطی (Arbitrary) تو ہے لیکن سماجی سطح پر اس کے کچھ پہلو Ethical جہت بھی رکھتے ہیں۔

**Prof. Manazir Ashiq Harganvi**
Kohsaar, Bhikanpur - 3
Bhagalpur - 812 001 (Bihar)
Mob. : 94309 66156





پروفیسر محمد محفوظ الحسن

# وکیل اختر - ناقدری کی صلیب پر لٹکا ایک شاعر

وکیل اختر کے بارے میں میری معلومات نہیں کے برابر ہے۔

معلومات سے مراد یہ ہے کہ ان کا تعلق بہار کے کس علاقے سے تھا، ان کے والدین کا نام کیا تھا نیز ان کے خاندانی حالات کیسے تھے، ان کی تعلیمی لیاقت کیا تھی، انہوں نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور انہوں نے تدریسی زندگی کا آغاز کب اور کہاں کیا، ان کی گھریلو زندگی کیسی تھی، آس پاس کا ماحول کیسا تھا؟ ان کی شادی ہوئی تھی یا نہیں۔ ان کی اولاد بھی ہے یا نہیں یہ باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ کسی فنکار کے بارے میں ان تمام امور سے واقفیت کے بغیر جو کچھ لکھا جائے گا اس میں شاید وہ صداقت اور اثر نہ ہو جوان جانکاریوں کے بعد تحریر کئے گئے مضامین میں ہوتا ہے۔

مجھے بدنام نظر صاحب نے صرف یہ اطلاع دی کہ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل تھے اور جواں مرگی کا شکار ہوئے، کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور ان کی ابھی جینے کی خواہش تھی مندرجہ ذیل شعر کی قرات کے بعد اس کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

کسی صورت کوئی صورت نکالو مجھے بے موت مرنے سے بچالو

لیکن موت کا وقت معین ہے اور وہ اپنے وقت پر آئی اور وکیل اختر کو ہم سے جدا کر گئی۔ وکیل اختر کی نہ تو ان کی زندگی میں اور نہ ان کی موت کے بعد وہ قدر کی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ ادیبوں اور ناقدوں کی بے حسی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے ''اقدار'' نے چند صفحات پر مشتمل ایک گوشہ ان کی موت کے بعد شائع کیا تھا اور شاید کسی اور رسالے نے بھی گوشہ نکال کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ مگر اس کے بعد پھر پلٹ کر نہ تو مغربی بنگال میں جہاں انہوں نے زندگی کی آخری سانس لی اور نہ ہی بہار میں جہاں ان کی پیدائش ہوئی ان کے ادبی قد و قامت کو متعین کرنے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کی کوشش ہوئی۔ حالانکہ ہم بہاریوں کی مردہ پرستی مشہور ہے مگر وہ بھی اس سلسلے میں عصبیت کا ہی شکار رہی۔ اب وکیل اختر کے دوست جناب بدنام نظر نے وکیل اختر کے کلام کو یکجا کر کے شائع کرنے کی پہل کی ہے، شاید ان کی یہ پہل ہماری بے حسی کو تازیانہ لگانے میں کامیاب ہو جائے اور وکیل اختر کی شخصیت اور شاعری کو ایک نئی پہچان اور مقام مل سکے۔

شاد عظیم آبادی، ضیا عظیم آبادی اور کئی دیگر شعرا کی طرح وکیل اختر کو اس کا احساس تھا کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں پہچانی ، بے حد ذہین وذکی الحس شاعر تھے ، خود بینی اور خودنگری کی اس ناقدر شناسی کا اظہار انہوں نے اپنی غزلوں میں کیا ہے ۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اسی خیال نے پاگل بنادیا مجھکو  کوئی سمجھتا مجھے کوئی سوچتا مجھکو

انہوں نے ناقدرشناسوں کو خبر دار بھی کیا ہے ۔

زمانہ تجھ سے ملے گا تو خود بتادے گا  نہ پوچھ مجھ سے زمانے سے کیا ملا مجھکو

خودنگری اور خودشناسی بڑی اچھی بات ہے اگر وہ احتساب کے دائرے میں رہے یا رکھی جائے ورنہ یہ دونوں صفات انسان کو انسانیت سے کوسوں دور کردیتے ہیں۔وکیل اختر کی نگاہ اس جانب بھی تھی انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نہایت حسین پیرایے اور منفرد انداز میں ایسے لوگوں کو متنبہ کیا ہے وہ کہتے ہیں ۔

کچھ لوگوں کو دنیا کی نظر کھا گئی اختر  اور کچھ لوگوں کو برباد کیا خودنگری نے

میری یہ ذاتی رائے ہے کہ وکیل اختر کو دنیا کی نظر کھا گئی ورنہ وہ شاید اتنے خودنگر نہ تھے کہ اپنی بربادی کی راہ خود منتخب کرتے ۔

فی الوقت میرے سامنے وکیل اختر کی غزلوں اور نظموں کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے، جس میں کل ۲۵/غزلیں اور پانچ نظمیں شامل ہیں ۔غزل کے کل اشعار کی تعداد ۱۶۸/ ہے ۔کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ وکیل اختر کی شاعری کا لہجہ حزنیہ بھی ہے اور طربیہ بھی انہوں نے جس انداز میں غموں کی تصویر کشی کی ہے اور جس طرح ان کو انگیز کیا ہے اس کو بڑی ندرت سے اپنی غزلوں میں پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے ۔

ان کی غزلوں کا طربیہ لہجہ بھی متاثر کرتا ہے چند اشعار ایسے بھی زیر مطالعہ آتے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وکیل اختر نے عشق بھی کیا ہے حسن سے مرعوب بھی ہوئے مگر محبوب کی پہچان بتانے سے کتراتے رہے ہیں عشق کی جوت ان کے دل میں بھی جلتی تھی اور حسن کے جلوؤں کی نیرنگ سامانی نے انہیں بھی کبھی اسیر زلف وابرو کیا تھا ۔

صنف غزل میں اپنی پہچان بنانا اور بھیڑ میں پہچان لیا جانا بہت مشکل اور دشوار ہے مگر وکیل اختر کی شاعری کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے لب ولہجے اور حسن بیان کی ندرت کی وجہ سے بھیڑ میں بھی سربلند نظر آتے ہیں ۔ان پچیس غزلوں میں بہت سارے ایسے اشعار ہیں جو کل بھی زندہ تھے، آج بھی ان کی معنویت میں کمی نہیں آئی ہے اور کل بھی ان کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، بڑے شاعر اور بڑی شاعری کی یہی پہچان ہے کہ وہ ہمہ





وقتی ہو، وکیل اختر کے یہ اشعار ہر زمانے کے لئے ہیں اور بعض بعض اشعار تو ایسے ہیں جیسے وکیل اختر آج کا منظرنامے لکھ رہے ہوں جو کل بھی اپنی تروتازگی اور ندرت خیالی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنانے میں کامیاب ہوں گے ۔چند اشعار جو ہمہ گیریت کے حامل کہے جاسکتے ہیں ملاحظہ ہوں ۔

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا  اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا
آپ کے دور مسیحائی میں  کوئی بیمار نہ اچھا ہوگا
عجیب موڑ رہ زندگی میں آیا ہے  کس طرف نہ کوئی راستہ دکھائی دے
وہی ہے پیاس وہی بے بسی وہی آنسو  یہ شہرزیست مجھے کربلا دکھائی دے
صرف درسی کتاب پڑھنے سے  آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا
قتل وغارت گری جا بجا دیکھئے  بخشش رہبر و رہنما دیکھے
یوں تو تنہائی میں گھبرائے بہت  مل کے لوگوں سے بھی پچھتائے بہت
ہم فراز دار تک تنہا گئے  دو قدم تک لوگ ساتھ آئے بہت
اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے  جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے
جہالت کا منظر جوراہوں میں تھا  وہی بیش وکم درس گاہوں میں تھا
جو خنجر بکف قتل گاہوں میں تھا  وہی وقت کے سربراہوں میں تھا
زندگی کے اداس لمحوں کو  لوگ خوشیوں میں بھول جاتے ہیں

ایک شعر کسی شاعر کو زندگی بخشنے کے لئے کافی ہے وکیل اختر کی پچیس غزلوں کے یہ بارہ اشعار نہ صرف وکیل اختر کو ادبی طور پر زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں بلکہ منفرد انداز کے خوش اسلوب بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے ان کی پہچان بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، آپ قومی اور بین الاقوامی منظرنامے پر نظر رکھئے اور آج سے پچاس ساٹھ سال قبل کہے گئے وکیل اختر کے یہ اشعار پڑھئے تو آپ کو وکیل اختر کی عظمت کے اعتراف میں ہچک محسوس نہیں ہوگی ،اور ان کی ناقدرشناسی آپ کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کردے گی مندرجہ بالا اشعار میں مشاہدے کی گہرائی، تجربے کی صداقت اور جذبے کا خلوص ہے جن کی وجہ سے یہ اشعار دل میں گھر کر جاتے ہیں۔بیان میں حسن بھی ہے اور زبان میں روانی وبرجستگی کے ساتھ شگفتگی اور نغمگی بھی دل کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔

شیلی نے کہا تھا ''ہمارے بہترین نغمے وہ ہیں جو ہمارے غمگیں ترین جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اس نقطۂ نظر سے اگر وکیل اختر کی شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کی غزلوں میں حزنیہ اشعار کی تعداد بھی کم نہیں نظر آئے گی ۔انہوں نے غموں کی ترجمانی جن مختلف انداز اور تیور میں کی ہے وہ بے حد متاثر کن

ہیں۔ان میں آہ کراہ سسکی اور بے بسی کو اس انداز سے شعریت کا لباس پہنایا گیا ہے کہ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ان کے ان حزنیہ اشعار میں باشعور اور حساس لوگوں کے دلوں کو ہاتھوں میں لینے کا ہنر پوشیدہ ہے۔یہ اشعار سوچنے پر اکساتے ہیں ان میں زندگی کی سچائیاں ہیں اور صداقتیں انسانی بے بسی اور مجبوری کا درد موج زن ہے۔ان میں ٹیس ہے،محسوسات،مشاہدات اور تجربات کا امتزاج ہے۔مگر اس سے پہلے یہ اشعار ملاحظہ کرلیں آپ کو وکیل اختر زندگی اور موت کا فاصلہ وفرق بتاتے ہیں۔

ہنس رہا تھا ابھی وہ ابھی مر گیا    موت اور زیست کا فاصلہ دیکھئے
فرق حیات و موت نہ پوچھو    ایک ہے طوفاں ایک ہے ساحل

اور اب حزنیہ اشعار کے مختلف رنگ وروپ دیکھ لیں۔

رہگزار زندگی کی کون سی منزل ہے یہ    ہر تصور زندگی کا درد بنتا جائے ہے
زندگی جب موت سی آئے نظر    آدمی کیسے نہ گھبرائے بہت
پوچھتی رہتی ہے ہرسمت مرانام وپتہ    میرے ہی جسم میں ہر درد کا گھر ہو جیسے
شہر دل تھا جو کبھی شہرنگاراں کی طرح    اب ہے ویران کسی گور غریباں کی طرح
یوم ماتم کی طرح میرا ہر اک دن گذرا    مری ہر رات کٹی ہے شب ہجراں کی طرح
میں زمانے کے ہراک غم سے ملا ہوں یارو    کوئی غم بھی تو نہیں ہے غم جاناں کی طرح
گریباں چاک آنکھیں نم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے    دل برباد کا ماتم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
اگر آہ وفغاں پیہم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے    تمھیں کہہ دو تمہارا غم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
خرد کی آندھیاں ان کا تغافل اپنی مجبوری    تمناؤں کی لو مدھم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
ہم خوشی میں روئے ہیں غم میں مسکرائے ہیں    زندگی میں ایسے بھی کچھ مقام آئے ہیں
گذار دی غم دوراں میں زندگی اپنی    میرے نصیب میں شاید نہ مسکرانا تھا

میں نے گذشتہ سطور میں لکھا ہے کہ وکیل اختر کی شاعری میں طربیہ لہجہ بھی ملتا ہے اور وہ بھی عشق میں مبتلا رہتے ہیں مگر وہ عشق کس سے کرتے ہیں کس سے کیا ہے اس کا اظہار بھی نہیں کرتے۔صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں،کی طرح وہ بھی یہ کہتے ہیں۔

اک نور مجسم کے پرستار ہیں اختر    یہ کہہ نہیں سکتے ہیں وہ بت ہے یا خدا ہے

میں چند عشقیہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ یہ عشق کس سے ہے اور کیسا ہے اور کتنا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612



نہ جانے رات گئے کس کی نقرئی آواز    کھنکتی ہے مرے کانوں میں چوڑیوں کی طرح
جو میں کہوں تو یہ کس کو یقیں آئے گا    کس کا جسم مہکتا ہے گلشنوں کی طرح
تنگ پیراہن خوشنما دیکھئے    شہر کی خوب صورت بلا دیکھئے
جب بھی اٹھے ہے تری رنگین یادوں کی گھٹا    دل کے ویرانے پہ رنگ ونور برسا جائے ہے
ذکر حسن یار کیا ہو دوستو المختصر    جو بھی اس کو دیکھ لے ہے دیکھتا رہ جائے ہے
اس کی بزم ناز سے اختر اٹھوں ہوں جب کبھی    یوں لگے ہے جیسے دل سینے میں بیٹھا جائے ہے
نکہت ورنگ میں ڈوبا ہوا شاداب بدن    موسم گل میں گلستاں کی سحر ہو جسے
احمریں ہونٹوں پہ معصوم تبسم کی ضیا    ابن مریم کی دعاؤں کا اثر ہو جیسے
تم کو پانے کے لئے تم کو بھلانے کے لئے    دل میں اور عقل میں اک جنگ رہی ہے برسوں
اپنے ہونٹوں کی دہکتی ہوئی سرخی بھر دو    داستان عشق کی بے رنگ رہی ہے برسوں
ادا نرالی تھی انداز کافرانہ تھا    غضب کا حسن قیامت کا مسکرانا تھا
نگاہ ملتے ہی دل میرا ہوگیا گھائل    کسی کے تیر نظر کا غضب نشانا تھا

وکیل اختر کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں کی مختلف جہتیں آپ کو زمانے کے نشیب وفراز سے ملاتی ہیں۔دل سے نکلی ہوئی درد بھری آوازیں سنائی دیتی ہیں وہ سیدھے دل پر اثر کرتی ہیں اور قاری کی آنکھوں کو نم کرتی چلی جاتی ہیں۔

ان کی عشقیہ شاعری میں آپ محبوب کے سراپا کو بھی دیکھیں گے،کنگن کی کھنکتی ہوئی صدائیں بھی آپ کو مسحور کریں گی اور سرخ ہونٹوں کا معصوم تبسم اس کی نرالی ادا اور کافرانہ انداز سے آپ بھی گھائل ہوں گے کیونکہ اس کی مسکراہٹ قیامت خیز ہے۔اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے ایک بار جو دیکھ لیتا ہے وہ گھائل ہو کر ہی رہتا ہے۔اردو کی روایتی عشقیہ شاعری کی اثر پذیری سے انکار کی گنجائش نہیں رہتے ہوئے بھی وکیل اختر کی فکری ندرت اور ان کے تخیل کی پرواز کی پیش کش کے انوکھے پن سے انکار کرنا بھی مشکل ہے،عشقیہ شاعری میں استعمال کے گئے ان کے الفاظ وتراکیب تشبیہات واستعارات کی طرفگی اور نرالے پن کا بھی انکار ممکن نہیں ہے،کہہ سکتے ہیں کہ وکیل اختر اپنے طرز کے اکیلے ایسے غزل کے شاعر ہیں جن کی بے وقت جدائی نے ایک بڑے غزل گو شاعر سے اردو شاعری کو محروم کردیا۔

وکیل اختر کی زنبیل میں پانچ نظمیں بھی ہیں یہ پابند بھی ہیں اور آزاد بھی،غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی فکر وفن کا بہترین امتزاج پیش کرتی ہیں۔ان کی پانچ نظموں میں سے دو نظم آپ کے ذوق وشوق اور فہم وفراست کی نذر کرتا ہوں آپ ان کا مطالعہ کریں اور ان کے مواد وہیئت کے فکری اور فنی رچاؤ،لفظوں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کا انتخاب اور ان کے استعمال کا سلیقہ اور ہنرمندی ان کے تفکر کی تازہ کاری اظہار بیان کی برجستگی نازک خیالی زبان کی روانی سلاست اور شگفتگی کا لطف لیں اور فیصلہ خود کریں کہ ان نظموں کا خالق اگر باضابطہ نظم نگاری کرتا تو کس حیثیت کا حامل ہوتا۔

پہلی نظم کا عنوان ہے ''ایک سوال''

مسجدوں مندروں اور گرجوں شوالوں کو تم
جس طرح چاہو مسمار کردو
اس لئے کہ
تم تو روز ازل سے
کتنے معبود کتنے معابد
بناتے مٹاتے بناتے چلے آرہے ہو
اس لئے کہ تمہیں اب خلاؤں میں بھی قصر سازی کا فن آچکا ہے
اپنے ذہن رسا زعم تحقیق سے پوچھ کر یہ بتاؤ
روز ازل سے اب تک
خون کا کوئی قطرہ بنایا ہے تم نے

دوسری نظم کا عنوان ہے ''ایک نظم''

تم یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو
رنگ و نور کی محفل میں بھی
کیوں میں پیہم
کھویا کھویا سا رہتا ہوں
رویا رویا سا رہتا ہوں
تم یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو
اک مدت سے کیوں ترے زردی مائل سوکھے پتے جیسے چہرے پر
کوئی رنگ نہیں چڑھتا ہے
تم یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو

ISSN : 2582 - 3612



تھکی تھکی آنکھوں سے میری
ویرانی کے حیرانی کے چشمے کیوں پھوٹا کرتے ہیں
آخر
اتنی ساری باتیں تم کیوں مجھ سے پوچھ رہی ہو
میں یہ تم سے پوچھ رہا ہوں!

مذکورہ دونوں نظموں کے پس منظر، مزاج و ماحول کو ذہن کے نہاں خانے میں تلاش کیجئے اور دریا میں ڈوب کر موتی نکال لیجئے۔

اور آخر میں یہ دو متضاد خیالوں کے اشعار کا لطف بھی لیجئے اور وکیل اختر کی فکری پختگی اور فنی دسترس کی داد دیجئے۔ صداقت بیاں اور جرأت اظہار کا آپ بھی مظاہرہ کیجئے۔

شاعر باشعور اے اختر حال سے بے خبر نہیں ہوتا
وہ بھی ادیب شاعر و ناقد ہے ان دنوں شعر و ادب سے جس کا کوئی واسطہ نہیں

وکیل اختر نے اپنی بات کہدی اب باری آپ کی ہے، دیکھا چاہئے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

بحیثیت مجموعی وکیل اختر نے اپنے احساسات، جذبات، خیالات، حادثات، سانحات، مشاہدات اور تجربات کو فن کی بھٹی میں تپا کر غزل و نظم کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔ جس میں عصری حسیت بھی ہے اور تغزل و تفکر کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں فلسفیانہ آہنگ بھی۔ عشق اور زندگی کے نشیب و فراز کی المنا کی اور حزن و اضمحلال کو اس چابکدستی سے فنکاری کے خراد پر چڑھایا ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں کے الفاظ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لفظوں کی تراش خراش ہو یا صنعتوں کے استعمال میں بے ساختگی اور برجستگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ وکیل اختر کی شاعری کل بھی وقت کی پکار تھی آج بھی اس کی مقبولیت برقرار ہے۔ اور کل بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوگی -ایک شاعر کی حیثیت سے ناقدین ان کو کس پائدان پر رکھیں گے یہ وہ جانیں۔ میری نظر میں وہ ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا جانا چاہئے اور ان کو وہ مقام ملنا چاہئے جس کے وہ مستحق ہیں۔

**Prof. Md. Mahfoozul Hasan**
Former Head
University Deptt. of Urdu
Magadh University
Bodh Gaya (Bihar)
MOb. - 94308 40627

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر محمد کاظم

# ادب لطیف کا اہم فنکار: مجتبیٰ حسین

اردو میں طنز و مزاح اور ڈراما کی ابتدا تقریباً ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ اگر ہم مرزا غالب کو اردو کا پہلا نثری طنز و مزاح نگار تسلیم کرتے ہیں اور اس کے نقوش ان کے خطوط میں تلاش کرتے ہیں تو یہ 1840 کے بعد کا زمانہ طے پاتا ہے۔ اسی طرح واجد علی شاہ کو اگر ابتدائی ڈراما نگار مان لیتے ہیں تو اس کا زمانہ بھی یہی مانا جاتا ہے۔ گویا عوام پر براہ راست اثر انداز ہونے والی دو اہم اصناف ایک ساتھ بام ادب پر نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن ایک طرف طنز و مزاح کو پھکڑ اور بازارو کہہ کر اس سے منھ موڑ لیتے ہیں تو دوسری جانب ڈراما کو غیر مہذب کہہ کر اس پر کفر کا فتویٰ لگانے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ لیکن دونوں ہی فن اپنا سفر کامیابی سے طے کرتے ہوئے آج اس مقام پر آ پہنچا ہے کہ بعض مقام پر یہ اردو کی شناخت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کو عوام تک پہنچانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

اگر ہم مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو کا پہلا طنز و مزاح نگار تسلیم کرتے ہیں تو اس صنف کی عمر کم و بیش 175 برس طے پاتی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان 175 برسوں میں زیادہ سے زیادہ تیس طنز مزاح نگار اپنے فن کا جادو دکھاتے نظر آتے ہیں، اگر انھیں بھی شمار کر لیں جن کی تحریر میں ضمنی طور پر یہ عناصر در آئے ہیں۔ طنز و مزاح نگار کے طور پر جن ادیبوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے ان کی فہرست مختصر ہے۔ ایسے فنکاروں میں اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے علاوہ خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، ابن انشا، ابراہیم جلیس، احمد جمال پاشا، فجر تونسوی، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن، کنہیا لال کپور، عامر عثمانی، یوسف ناظم، عطاء الحق قاسمی، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین اور پرویز یداللہ مہدی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ موجودہ دور پر نظر ڈالتے ہیں تو مشتاق احمد یوصفی اور مجتبیٰ حسین کا سر زیادہ بلند نظر آتا ہے۔

اردو میں طنز و مزاح کی نثری روایت پر نظر ڈالیں تو دو طرح کے پیرائے دکھائی دیتے ہیں۔ اول وہ جن میں واقعات کے ذریعے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ یہاں حسن بیان پر زیادہ اور لطف بیان پر کم توجہ دی





جاتی ہے۔ اس طرز کے نمائندہ مزاح نگاروں میں پطرس بخاری سرفہرست نظر آتے ہیں۔ دوسرا پیرایہ وہ ہے جس میں واقعات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور مزاح نگار الفاظ سے کھیلتا ہے اور زبان کے مخصوص استعمال سے مزاح پیدا کرتا ہے۔ اس پیرایہ کو اپنانے والوں کی نمائندگی رشید احمد صدیقی کرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین نے ان دونوں پیرائے کے امتزاج سے اپنا اپنا منفرد طرز ایجاد کیا ہے۔ دونوں کا طریقہ کار اور اسلوب مختلف ہے۔ اردو میں طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ان دونوں مزاح نگاروں نے اسے اس دوسرے درجے سے نکال کر بلند مقام عطا کیا ہے اور منظوم طنز و مزاح کی روایت (جس میں ذاتی حملوں کو فوقیت دیتے ہوئے اپنے حریف کو نیچا دکھانے کی روش نظر آتی ہے) کے برخلاف انسان کو موضوع بنا کر اسے سماج کے چوکھٹے میں دیکھا اور پیش کیا ہے۔

طنز و مزاح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مزاح کے لیے ذہانت بہت ضروری ہے اور طنز کے لیے سماجی شعور۔ مزاح کا ایک خاص حربہ مبالغہ ہے۔ کامیاب مزاح نگاری کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایسے کرداروں کو خلق کرے جن کی پوری شخصیت مزاح سے بھرپور ہو اور جن کی ہر بات میں شگفتگی ہو۔ اگر طنز نگار سنجیدہ ہو جائے تو اس پر بوجھل پن کا الزام عائد ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے ذرا بھی ضرورت سے زیادہ شوخی دکھائی تو اس کی تحریر پھکڑ پن کے زمرے میں آجاتی ہے۔

یہ تمام نکات مجتبیٰ حسین کے ذہن میں موجود ہیں اس لیے ان کے یہاں طنز و مزاح نگاری سے متعلق جتنی خوبیاں ہوسکتی ہیں وہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ بلا کے ذہین ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے دوستوں اور ہم عصروں نے نہ صرف اپنی گفتگو میں بلکہ تحریری طور پر بھی پیش کیا ہے۔ ان کی محفلوں کو یاد کر کے نہ صرف خود لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ اپنے شناساؤں کو بھی محظوظ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بزلہ سنجی اور حاضر جوابی کے بہت سے لوگ قائل ہیں۔ دوستوں کی محفل میں وہ بظاہر دوسروں سے الگ تھلگ بیٹھے نظر آتے لیکن دوران گفتگو درمیان میں کوئی ایسا جملہ اچھال دیتے کہ محفل گلزار ہو جاتی۔ حیدرآباد کے اورینٹ ہوٹل میں پیش آنے والے بہت سے واقعوں میں سے ایسے ہی ایک واقعے کا ذکر ڈاکٹر رؤف خیر نے اپنے تازہ ترین مضمون حیدرآباد کے ادبی اڈے، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی کے ڈائمنڈ جوبلی سال، نومبر 2016 میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''اورینٹ میں مجتبیٰ کے آجانے سے رونق آجاتی تھی۔ سلیمان اریب اپنی بیوی صفیہ کی علمیت کا ہر جگہ ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ چاہے کوئی سیاسی مسئلہ ہو، سماجی معاملہ ہو یا ادبی بحث ہو، ہر معاملے میں اریب کہتے کہ 'صفیہ کا بھی یہی خیال ہے'۔ ایک دوست نے زچ ہو کر ان سے کہا 'یار یہ کیا، ہر معاملہ میں

صفیہ کا بھی یہی خیال ہے،صفیہ کا بھی یہی خیال ہے، کہے جاتے ہو۔تم بڑے بے وقوف ہو۔ دوسری طرف سے ایک بے تکلف دوست نے لقمہ دیا''صفیہ کا بھی یہی خیال ہے''۔اریب اس لطیفے کا خود بھی لطف لیا کرتے تھے۔

اور ینٹ کا ایک اور دلچسپ لطیفہ بہت مشہور ہے۔ پہلی بار شاذ تمکنت کو کشمیر میں کل ہند مشاعرہ پڑھنے کی دعوت آئی ،ساتھ ہی ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی انھیں بھیجا گیا۔ وہ دعوت نامہ اور ٹکٹ لے کر اور ینٹ ہوٹل پہنچے تاکہ احباب پر رعب جمائیں۔ ادھر احباب نے نظر انداز کرنے کی سازش رچی۔شاذ آئے اور احباب کی ایک میز پر کشمیری مشاعرے کا دعوت نامہ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی رکھا۔ چائے منگائی۔ بیرا جب پانی کے گلاس رکھ رہا تھا تو شاذ کہنے لگے:'ذرا سنبھل کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھا ہوا ہے'۔چائے آئی تو پھر شاذ کہنے لگے:'میاں ذرا سنبھال کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ کہیں زد میں نہ آئے'۔ پھر بھی احباب نے چپ سادھے رکھی۔ بازو والی میز پر کسی نے زبردست قہقہہ لگایا۔مجتبیٰ نے کہا:'یارو ذرا سنبھل کے، یہاں ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھا ہوا ہے، کہیں اڑ نہ جائے'۔اس پر پھر جو چاروں طرف قہقہے ابل پڑے دیکھنے کے تھے۔''

مجتبیٰ حسین کو سماج کا گہرا شعور ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں سماج میں موجود ہر اس برائی کو اجاگر کیا ہے جس سے انسان کو خوشی میسر آئے۔انھوں نے ضرورت کے تحت مبالغہ سے بھی کام لیا ہے لیکن اسی حد تک جتنے سے ہاضمہ خراب نہ ہو۔انھوں نے بے شمار ایسے کردار خلق کئے ہیں جن کی ہر بات نہ صرف شگفتگی سے پر ہے بلکہ پوری شخصیت ہی مزاح کا مکمل نمونہ ہے۔ واقعہ نگاری تو کوئی ان سے سیکھے۔ان کی تحریر میں موجود بعض واقعے محض فرضی ہیں لیکن یہ ان کی فنکاری اور پیش کش کے کمالات ہیں کہ آپ کسی بھی صورت میں اسے فرضی نہیں مان سکتے۔ کیوں کہ وہ اصل واقعے سے کہیں زیادہ حقیقت سے قریب نظر آتا ہے۔ان کی تحریر میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔لیکن نہ تو انھوں نے اپنے قاری و سامع کو بوجھل پن کا احساس ہونے دیا اور نہ ہی آپ ان کی تحریر کو کسی بھی صورت میں پھکڑ پن کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ مجتبیٰ حسین طنز و مزاح نگار سے پہلے ایک سنجیدہ کہانی کار کے طور پر اپنی پہچان بنا چکے تھے اور موت کو موضوع بنا کر کئی کہانیاں لکھ چکے تھے۔ اگر ان کہانیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنے میں دقت ضرور محسوس ہوگی کہ ایسے موضوعات پر کہانی لکھنے والا اتنا بڑا اور معتبر طنز و مزاح نگار ہو سکتا ہے۔لیکن ان

ISSN : 2582 - 3612



کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے کالم''شیشہ و تیشہ'' جوان کے فرضی نام سے شائع ہونا شروع ہوا تھا، سے لے کر آج تک شائع ہوئے کالم میں بھی اس سنجیدگی اور شوخی کو برقرار رکھا ہے۔مثال کے طور پر ابتدائی اور موجودہ تحریر کے دو مختلف اقتباسات دیکھیں :

''سمجھ میں نہیں آتا کہ چوری کرنا ہی تھا تو اس نوجوان نے مگر مچھ کے بچے کی ہی چوری کیوں کی؟ مگر مچھ نہ تو کتے کی طرح وفادار جانور ہے اور نہ بکری اور گائے کی طرح وہ دودھ دیتا ہے اور نہ بلی کی طرح چوہے پکڑتا ہے۔مگر مچھ کو بین الاقوامی شہرت عطا کرنے والی واحد خصوصیت اس کے وہ آنسو ہیں جو ظاہر ہے نہ کسی کی آنکھ کا نور ہیں اور نہ کسی کے دل کا سرور ہیں۔اس کے علاوہ جب سے انسانوں نے خود مگر مچھ کے آنسو بہانے کا فن سیکھ لیا ہے اس وقت سے یہ جانور اس خصوصیت سے بھی محروم ہو گیا ہے۔سویڈن کے اس مجرم نے مگر مچھ کس سرقہ غالباً اسی لیے کیا ہوگا کہ عادی مجرم بننے کے بعد اظہار ندامت کے لیے مگر مچھ کے آنسو بہانا سیکھ لے۔''

(شیشہ و تیشہ، روزنامہ سیاست، ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۲)

''سیمیناروں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہوتا۔تبھی تو مختلف موضوعات پر بلکہ کبھی کبھی تو ایک ہی موضوع پر وقفہ وقفہ سے کئی سیمیناروں کے انعقاد کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے جس کے بعد بفضل تعالیٰ وہ موضوع مزید پیچیدہ، گنجلک اور بے قابو ہو جاتا ہے بلکہ بعض مقالہ نگار حضرات تو جان بوجھ کر کچھ ایسی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں کہ مستقبل میں کئی سیمیناروں کے دروازے اپنے آپ کھل جائیں۔ پیٹ کے لیے آدمی کو کیا نہیں کرنا پڑتا۔تاہم آس بھی بڑی بری چیز ہے اور امید پر دنیا قائم ہے۔کیا عجب کہ کسی سیمینار سے واقعی کوئی نتیجہ برآمد ہو جائے۔ برا وقت پوچھ کر تھوڑا ہی آتا ہے۔''

(کتاب نما، اپریل ۲۰۰۴، صفحہ۔۶۵)

مجتبیٰ حسین کی تحریر کی چند نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محاکات نگاری اور پیکر تراشی کے تمام وسائل مثلاً تشبیہ، استعارہ، صفات و متعلقات فعل کو بروئے کار لاتے ہیں۔اسی کے ساتھ رعایت لفظی سے بخوبی کام لیتے ہیں۔کبھی وہ کسی غیر مرئی چیز سے تشبیہ دے کر داخلی احساس یا تجربے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کی تجسیم کر دیتے ہیں، کبھی تشبیہ کو اتنا پھیلا دیتے ہیں کہ وہ تمثیل بن جاتی ہے۔محاوروں اور کہاوتوں کا نہایت برجستگی اور معنی خیز پر مزاح طریقے سے استعمال کرنا ان کا خاص حصہ ہے۔محاورے، ایہام، ایہام تناسب اور صنعت تجنیس کے ساتھ بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔وہ اکثر محاوروں میں تحریف بھی کرتے ہیں لیکن اس کا انداز اتنا دلچسپ ہوتا ہے جو نہ تو بے معنی ہوتا ہے اور نہ ہی گراں گزرتا ہے بلکہ اس سے پر لطف مزاح پیدا ہوتا ہے۔اکثر اپنی تحریر میں وہ اشعار کے ساتھ ساتھ اس کی پیروڈی پیش کرتے ہیں۔پیروڈی دو طرح سے کرتے ہیں۔اول الفاظ کو بدلے بغیر مصرع کو من وعن پیش کرتے ہیں۔دوئم کبھی کبھی مصرع میں ایک یا دو لفظ بدل دیتے ہیں جس سے ایک خاص لطف کا احساس ہوتا ہے۔بعض اوقات انگریزی کا لفظ استعمال کرتے ہی اور کبھی کبھی اس کے ترجمے پیش کرتے ہوئے طنز ومزاح کے پیرائے میں اس کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مزاح کا تعلق براہ راست تہذیبی اقدار سے ہوتا ہے اور مجتبیٰ حسین کے اندر تہذیب کی قدریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خاکوں، کالموں یا دوسری تحریروں میں جس شخص کو کردار کے طور پر پیش کرتے ہیں یا جن کا ذکر کرتے ہیں ان پر تنقید بھی ہو تو انھیں کبھی برا نہیں لگتا۔یہ ان کے انداز بیان کی خوبی ہے جس کی وجہ سے شاید ہی کوئی شخص ہو جسے ان سے کبھی شکایت ہوئی ہو۔یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ زود نویس کی تحریر میں ہلکا پن آ جاتا ہے، لیکن مجتبیٰ حسین نے طنز ومزاح سے متعلق جہاں بہت سے دوسرے خیالات کو رد کیا ہے وہیں اس خیال کی بھی نفی کر دی ہے۔مجتبیٰ حسین زود نویس ہیں لیکن ان کی کوئی تحریر ہلکی نہیں ہے۔ان کی کسی بھی تحریر کو دیکھیں تو ایسا لگے گا کہ یہ موضوع خاص انھیں کے لیے تھا۔اس سے بہتر اس موضوع پر کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔

طنز ومزاح سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ہلکی پھلکی تحریر ہوتی ہے اور اس میں سنجیدگی کا فقدان ہوتا ہے۔مجتبیٰ حسین نے اسے بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ان کی تحریر کو پڑھتے وقت لطف ضرور آتا ہے لیکن جیسے ہی مضمون ختم ہوتا ہے اس میں ایک خاص سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے اور ہم اس موضوع پر غور وفکر کرنے لگتے ہیں۔مثال کے طور پر مجتبیٰ حسین کے الفاظ میں بزبان مرزا غالب یہ اقتباس دیکھیں :

''مرزا مجتبیٰ! ذرا ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔ دل لگی کا ایک قصہ اور سنو۔قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام رہتے تو یہیں خلد آباد میں ہیں لیکن تم حیرت کرو گے کہ آج تک ان ماہرین غالبیات سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔تینوں مجھ سے منھ چھپائے پھرتے ہیں۔ایک دن میں نے میر مہدی مجروح کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ بندگان خدا کبھی تو آن

ISSN : 2582 - 3612



ملو۔تینوں نے بیک زبان ہو کر میاں مہدی سے کہا: ہم کیوں غالب سے ملنے جائیں۔ہم تو ماہرین غالبیات ہیں۔کیا تم غالب اور ماہرین غالبیات کا فرق بھی نہیں جانتے۔غالب کو خود چل کر ہمارے پاس آنا چاہیے۔ غالب نے جو بھی زندگی گزاری تھی وہ تو ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ کو ہی اس کی طبعی موت کے بعد ختم ہوگئی۔اس کے بعد جس غالب کو ہم نے دریافت کیا ہے یا دوبارہ پیدا کیا ہے وہ تو ہماری تخلیق ہے۔غالب جیسے شخص کی زندگی کی بازیافت کے لیے ہم تینوں نے اپنی بیش قیمتی زندگیاں ضائع کی ہیں۔ ہمارے غالب کا اس غالب سے کیا تعلق جو ۱۸۶۹ سے پہلے اس دنیا میں زندہ تھا۔''

(مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم، مرتب: حسن چشتی، صفحہ۔۵۶)

مجتبیٰ حسین بیک وقت خاکہ نگار، کالم نگار، انشائیہ نگار، مضمون نگار، سفرنامہ نگار، واقعہ نگار اور کہانی کار ہیں اور ان تمام کا احاطہ کرتی ہوئی کم وبیش ان کی بیس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان کی ان خدمات کا احاطہ ایک مضمون تو کیا پوری کتاب بھی اس کے لیے ناکافی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان پر کئی تحقیقی مقالے لکھ کر اسکالرز ایم فل اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد کے زمانے میں مجتبیٰ حسین نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کی وجہ سے اب طنز ومزاح پر نہ صرف سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا ہے بلکہ اردو کی اہم صنف کے طور پر اسے قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ان کا سفر ابھی جاری ہے اس لیے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس صنف کو وہ بلند مقام حاصل ہوگا جو موجودہ دور کی بہت سی دوسری اصناف کے حصے میں اب تک نہیں آیا ہے۔

**Dr. Md. Kazim**
Associate Professor
Departement of Urdu
Delhi University, Delhi
Mob. : 98681 88463

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر مظہر کبریا

# غالبؔ اپنے خطوط کی روشنی میں

خطوط نویسی کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خطوط درخت کے پتوں، دھات کی برتنوں پر لکھے جاتے تھے۔ مگر جیسے جیسے انسانی تہذیب ترقی کرتی چلی گئی ویسے ویسے خط کا سلسلہ کاغذ اور پرنٹ سے ہوتے ہوئے ڈیجیٹل عہد میں داخل ہو چکا ہے۔

پندرہویں صدی میں خطوط نویسی کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے سے انگلستان کے جیمس ہاؤل (JAMES HAWL) کو مکتوب نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں مکاتیبِ ادب کے ایسے سرمائے موجود ہیں جن کا ادب میں بلند مقام ہوتا ہے۔

خط لکھنا ایک ایسا فن ہے جس کا کوئی مخصوص اُصول نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی مخصوص اُصول کی پابندی اس کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ اس فن کو برتنے کے لئے ایک دردمند دل رکھنے والے مکتوب نگار کی ضرورت ہوتی ہے جو کاغذ، قلم اور روشنائی کے سہارے اپنے ذہنی تاثرات اور قلمی کیفیات کو نہایت سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی اور سچائی کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ ہر زبان میں صرف ایسے ہی مکتوب نگار زندہ رہتے ہیں جن کے مکاتیب ادب میں اپنا مقام متعین کر پاتے ہیں۔

بلاشبہ اُردو ادب میں فنِ مکتوب نویسی کے امام مرزا غالب ہیں۔ غالب ایک نابغۂ روزگار تھے اُن کی شخصیت کثیرالجہات تھی اور اسی لئے حالیؔ نے غالب کو حیوان ظریف کہا ہے۔ غالب اپنے رتبہ اور مرتبہ سے آشنا تھے۔ اردو اور فارسی کے عظیم شاعر کے ساتھ ساتھ بہترین نثر نگار تھے۔ اس لئے غالب خود بھی کہتے ہیں کہ۔ ''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔'' ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کا غالب کی زندگی پر سب سے بُرا اثر پڑا کہ وہ تنہا رہ گئے۔ دوست، عزیز، شاگرد اور دوسرے ملنے والوں میں سے بیشتر مارے گئے، اپنی اس تنہائی کا غالب نے دردانگیز انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ میر سرفراز حسین کو اس طرح لکھتے ہیں :

> ''وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے۔ وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے۔ وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں





> آئے۔ مرے ہوئے کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔''

تفتہؔ سے یوں رقمطراز ہیں :

> ''مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہوگا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا آپ کا خط نہیں آیا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے خطوں کے ذریعہ اپنی خلوت میں جلوت اور اپنی تنہائی میں انجمن کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دن کا بڑا حصہ خط پڑھنے، ان کا جواب لکھنے اور لفافے بنانے میں صرف ہو جاتا۔ اپنے دل کا حال مرزا ہر گوپال تفتہؔ کو اس طرح بتاتے ہیں :۔

> ''...میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے پر جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جاناں کہ وہ شخص تشریف لایا۔ دن خطوط لکھنے، پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔''

غالب کے متعدد خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں مہر غالب، انتخاب غالب، عود ہندی، اردوئے معلی، مکاتیب غالب، خطوط غالب اور غالب کے خطوط ہیں۔ غالب کے یہ سارے خطوط 1828 سے 1848ء تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ کاظم علی خاں کے مطابق ان خطوط کی تعداد 873 ہے۔

غالب کے خطوط میں تجربات واحساسات کی لازوال کیفیتیں ملتی ہیں۔ غالب خطوط نویسی کو گفتگو کا بدل سمجھتے ہیں۔ اردو میں باقاعدہ خطوط نویسی سے بہت قبل غالب کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ خط میں تحریر کو تقریر کا آئینہ ہونا چاہئے۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ مرزا صاحب اپنی شاعری کی طرح اپنے مکتوبات کو چنداں وقیع نہیں سمجھتے تھے اور اس کی کم مائیگی کا احساس ان کو برابر رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب دوستوں اور شاگردوں نے اس کی اشاعت کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے سختی سے منع فرمایا اور اس کی طباعت کے خیال سے بھی اپنی ناپسندیدگی کا شدید طور پر اظہار کیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں مرزا تفتہ اور منشی شیو نرائن ان کی اجازت کے بغیر مکاتیب شائع نہ کر دیں۔ لہذا غالب اپنے ایک مکتوب میں منشی شیو نرائن کو تنبیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

''رقعوں کے چھاپے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس جانب
میں میری رائے پر تم کو اور مرزا تفتہ کو عمل کرنا ضروری ہے۔''

(خطوط غالب، مالک رام صفحہ۔ ۴۲۹)

غالب کی جب صحت خراب ہوگئی اور مالی پریشانیوں نے نت نئے مسائل پیدا کردیئے تو اردو مکتوب نگاری کو ذریعہ اظہار بنایا اور اردو ہی میں مراسلت و مکاتبت شروع کردی اور فارسی آہستہ آہستہ لکھنا ترک کردیا۔ اور یہ بھی اتفاق ہے کہ سیاسی و سماجی انقلابات نے زمانے کا رُخ بدل دیا۔ اُس وقت کی حکومت نے اردو کو ہندوستان کی دفتری اور سرکاری زبان قرار دیا۔ اور یہیں سے مدرسوں، تعلیمی درس گاہوں اور دفتروں میں اردو استعمال ہونے لگی اور آہستہ آہستہ اردو کی علمی و ادبی حیثیت مسلم ہوگئی۔

غالب کے اردو میں جتنے خطوط کی بازیافت ہوئی ہے۔ ان میں قدیم تینوں خط اگست ۱۸۴۹ء کا ہے جو ان کے رفیق مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔ غالب کو اس بات کا شرف حاصل ہے جیسا کہ معصوم عزیز کاظمی لکھتے ہیں :

''...اردو کا پہلا مطبوعہ خط ان کا تحریر کردہ ہے جو نامۂ غالب کے مطبع اموجان دہلی
میں شائع ہوا۔ غالب کے دستیاب شدہ اردو خطوط کی تعداد ۸۸۶ ہے اور یہ خطوط
مختلف اشخاص، اوقات اور ضرورت کے تحت رقم کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل
درج کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہی
جاسکتی ہے کہ ان خطوط میں غالب کی شگفتگی، برجستگی اور انفرادیت قائم ہے۔''

(دوماہی سہیل۔ کولکاتہ جنوری۔ فروری ۲۰۱۴ء)

اور یہ سچ ہے کہ غالب کے خطوط کی نثریں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ایک بھرپور جذبہ اور فکرو احساس بھی پایا جاتا ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔ غالب کے خطوط میں ذاتی تجربے اجتماعی بن جاتے ہیں۔ غالب کی آواز اپنے عہد کی پوری تابناکی کے ساتھ گونج معلوم پڑتی ہے۔ انسان اور انسانیت کی گونج زندگی کے مسائل کی گونج سماجی و تہذیبی و سیاستی حالات کی گونج مایوسیوں اور ناکمیوں کی داستان کی گونج اور یہ ساری گونجیں غالب کی نثری تحریروں میں خطوں کے ذریعہ سنائی پڑتی ہیں۔

غالب نے شاعری میں اپنی شخصیت کا علاحدہ بت تراشا تھا مگر خطوط کے اندر غالب کی دوسری شخصیت نظر آتی ہے۔ اس میں خودداری کے ساتھ ساتھ خوشامد پسند بھی نظر آتے ہیں۔ کبھی مایوسی و تنہائی کے شکار تو کبھی خوش رنگ کیفیت میں شرمسار نظر آتے ہیں۔ اور یہی غالب کو زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔

غالب کے خطوط میں زندگی، اپنی تمام تر دھڑکنوں، رعنائیوں، دلکشیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ نظر آتی





ہے۔ خطوط میں غالب ہمارے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں اور ہمارے دُکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ غالب انتہائی آسان الفاظ و القاب سے ہمیں رجوع کرتے ہیں اور یہ انداز ان کا دلبرانہ لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا کی ڈھیر ساری محبتیں نواز رہے ہیں۔ تکلفانہ گفتگو اُن کی نثری شخصیت کا ایک ساحرانہ خاصّا ہے۔ اور یہی ادائیں انہیں دوسروں سے ممیّز و ممتاز کرتی ہیں اور دلکش بناتی ہیں۔ اور میں اپنی بات خلیق انجم کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں :

''...غالب کے خطوط میں تجربات و احساسات کی رنگارنگی ہے۔ اجتماعی تجربے
بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی اور پورے عہد کی گونج بھی۔
خطوطِ غالب اُس عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین
سیاسی، سماجی، تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردّ عمل بھی ہیں اور ایک فرد کی
مایوسیوں، شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔''

(انتخاب خطوط غالب، مرتبہ: خلیق انجم)

**Dr. Mazhar Kibria**
Associate Professor
University Deptt. of Urdu
J. P. University, Chapra
Mob. - 91998 85800

ڈاکٹر محمد دانش غنی

# شہرِ سخن کا مسافر: نذیرؔ فتح پوری

ہمارے تعلیمی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں منعقد ہونے والے سیمناروں میں ہم نے ہمیشہ اساتذہ اور معروف و ممتاز اہلِ قلم کے فن اور شخصیت پر مقالے لکھے، پڑھے اور سنے۔ اس طرح ہم نے ہمارے بزرگوں کے فن اور شخصیت کو سمجھا اور سمجھایا۔ ان کی بے پناہ ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور آنے والی نسل کو بزرگوں کی خدمات سے روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس طرح ہم نے ماضی کے اوراق کھنگالے اور انھیں اپنی اپنی عبارتوں سے مزین کر کے زمانۂ حال کی پیشانی کا جھومر بنایا اسی لیے مجھے اس سمینار میں جناب نذیرؔ فتح پوری کے فکر و فن پر مقالہ خوانی کی دعوت دی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں پونے میں رہ کر گذشتہ پچاس سال میں نذیر صاحب نے اردو کے تعلق سے جو تخلیقی، تحقیقی اور ترسیلی خدمات انجام دی ہیں یہ مقالہ ان کی خدمات کا پونا کالج کے عہدے داران کی جانب سے بہترین اعتراف ہے۔ آج کے اس سمینار سے پورے ملک میں یہ پیغام جائے گا کہ ہمیں اپنے ساتھی شعرا و ادبا کی جانب بھی بہ نظرِ التفات دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر شہر میں دو چار قلم کار تو ایسے موجود ہی ہیں جنھوں نے اپنی خوبصورت جوانی اور اپنی محنت کی کمائی اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دی تھی۔ بے شک نذیر فتح پوری ان میں سے ایک ہیں۔

نذیرؔ فتح پوری ایک ایسا ہمہ رنگ ادبی نام ہے جس کی شمولیت کے بغیر اردو شعر و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ فتح پور راجستھان سے لے کر پونے تک جو مشترک ادبی فضا نذیرؔ فتح پوری کے شعور کو پختگی و بالیدگی بخشنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی وہ ان کی ادبی شخصیت میں بنیادی رنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ادبی سطح پر نذیرؔ فتح پوری کی شخصیت کے کئی پہلو اور کئی جہتیں سامنے آتی ہیں اور ہر جہت ایک الگ فنکار سے متعارف کراتی ہے۔ مثلاً شاعر، نثر نگار، صحافی اور پبلشر۔ بظاہر الگ الگ نظر آنے والی ان جہتوں میں ایک ایسی برقی رو موجود ہے جو سب کو ایک ہی تار میں پرو دیتی ہے۔ جذبہ و شعور کو گوہرِ شعر میں منتقل کرنے کی تڑپ رکھنے والے کو طبیعت کے کیسے گداز، احساس کے کیسے کرب اور حق و ناحق کے کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ طنز سہنے والے کی روح کو کتنے نشتروں کی چبھن برداشت کرنی پڑتی ہے یہ اس کا دل ہی جانتا ہے، خود نوشت سوانح نگار کو حقیقت اور فن کاری کے پل کو کس طرح عبور کرنا ہوتا ہے اور ادبی صحافت و طباعت کے خارزار میں قدم رکھنے والے سے کس مزاج و منہاج، کیسی ادبی اور معاشرتی پرکھ اور کس معیار و وقار کا تقاضا ہوتا

ISSN : 2582 - 3612



ہے اس کا بجا طور پر اندازہ نذیرؔ فتح پوری کی ادبی شخصیت کے بھرپور مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

پونے شہر ان صاحبانِ علم و ادب کا احسان مند ہے جنھوں نے اپنے مولد و مسکن کو چھوڑا اور پونے کو اپنا مستقر بنایا۔ ایسے ہی مہاجرین میں نذیرؔ فتح پوری بھی شامل ہیں۔ وہ راجستھان جیسی سرزمین کے ایک تاریخی مقام فتح پور سے ۱۹۶۰ء میں پونے آئے۔ تعمیرات کے فن میں اپنا کمال درشاتے پونے کی علمی و ادبی فضا سے متاثر ہوئے تو یہاں کی صحت بخش آب و ہوا میں ان کے اندر پڑا ہوا ادنی سا فنکار ایک تنومند و توانا ادیب، شاعر اور صحافی بن کر نمودار ہو گیا۔

ہزاروں صفحات پر محیط نذیرؔ فتح پوری کی تخلیقات اور چالیس برسوں پر محیط ادبی صحافت ان کا ناقابلِ انکار ادبی اور لسانی کارنامہ ہے۔ پونا کالج سے ایروڑا اور وہاں سے لوہ گاؤں تک نذیرؔ فتح پوری نے اپنی گراں قدر اردو خدمات کا ایک خیاباں آراستہ کر رکھا ہے۔ وہ یہاں کے بزرگانِ علم و ادب کی صحبتوں کے فیض یافتہ ہیں اور نئی نسلوں کے تربیت کار بھی۔ پونے کے بہت سے اہلِ قلم انہی کے ساختہ پرداختہ ہیں۔

تقسیمِ ملک کے بعد پونے سے اردو کی ادبی صحافت کا آغاز سہ ماہی اسباق سے ہوا۔ اسباق کا اجرا ۹؍ مئی ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ اس کی ابتدا ماہنامہ سے ہوئی پھر یہ دو ماہ میں ایک بار شائع ہونے لگا۔ تب یہ ایک گروپ میں شائع ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ پورے پانچ سال تک کامیابی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ اس کے بعد کسی وجہ سے گروپ منتشر ہو گیا اور اسباق نذیرؔ فتح پوری کو سونپ دیا۔ پورے گیارہ افراد کا گروپ اور کہاں نذیرؔ فتح پوری اکیلے لیکن یہ ناقابلِ تسخیر پہاڑ نذیرؔ صاحب نے تنہا عبور کیا۔ اسباق آج بھی سہ ماہی شائع ہوتا ہے اور ایک ادبی وقار کے ساتھ ہند اور بیرونِ ہند کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ آج اسباق کی اشاعت کو پورے چالیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ مہاراشٹر میں ادبی رسائل کے حوالے سے یہ ایک تاریخی کارنامہ تصور کیا جائے گا۔ نذیر صاحب کے ساتھ کوئی ادارہ نہیں، کوئی گروپ نہیں، کوئی بزم نہیں نذیر صاحب آج بھی اسباق کو سجانے اور سنوارنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ قابلِ تقلید اور باعثِ فخر بات ہے۔ ادبی حلقوں میں اسباق کی وجہ سے پونے کی شناخت قائم ہوئی ہے۔ ہندوستان کے باہر بھی لوگ اسباق کی وجہ سے پونے کو پہچانتے ہیں۔ اسباق نے اپنی چالیس سالہ اشاعتی زندگی میں چند خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں جن میں سالِ اولین نمبر، ماں نمبر، سلور جوبلی نمبر، علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر قابلِ ذکر ہے۔ ماں کے موضوع پر پہلی بار اسباق ہی نے خاص نمبر شائع کیا تھا۔ ماہرِ غالبیات علامہ کالی داس گپتا رضا کے انتقال کو بیس سال ہو گئے لیکن اسباق کے علاوہ کسی بھی رسالے نے رضا صاحب کے فکر و فن پر نمبر شائع نہیں کیا۔ اسباق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے بہت سے اہم شعرا و ادبا پر خصوصی گوشے بھی شائع کیے ہیں جو علمی ادبی حلقوں میں کافی اہم تسلیم کیے گئے ہیں۔ یہ خبر بہت ہی اہم ہے کہ پونے کی محترمہ شمشاد جلیل

شاد پونے یونیورسٹی سے اسباق پر تحقیقی مقالہ قلم بند کر رہی ہیں جو عنقریب تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔

آج کے کتنے ہی مشہور و معروف فنکار اس بات کا فخر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی اولین تخلیق کو اسباق یعنی نذیر فتح پوری نے شائع کیا تھا۔ نذیر صاحب کی ذات کا سب سے بڑا وصف دوسروں کا اعترافِ کمال ہے۔ ''جگن ناتھ آزاد: ایک مستقل ادارہ''، ''جہانِ گیتا رضا''، ''دلدار ہاشمی: فن اور شخصیت''، ''امیں حزیں: شخص شاعر اور استاد'' وغیرہ ان کی ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے جو ان کے وصفِ خاص کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی اپنی تصانیف اور اسباق پبلی کیشنز کی مطبوعات کی فہرست قابلِ رشک ہے۔ اب تک پونے میں ان کا مدِ مقابل کوئی نہیں۔ وہ تو اردو زبان و ادب کے شیفتہ ہیں، ان کے سینے میں عشقِ زبان و ادب کی آتشِ جوالہ بھڑکی ہوئی ہے اور وہ اپنی ضیا پاشیوں سے پونے کے ادبی اور تعلیمی چہرے کو نمایاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ''شعرائے پونہ: ایک تحقیق'' کے عنوان سے پونے کے اردو شاعروں کا تذکرہ مرتب کیا۔ یہ تذکرہ پورے تین سو سال پر محیط ہے ایسے مقالے عام طور پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے لیے قلم بند کیے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب اور بھی نذیر صاحب نے مرتب کی جس کا عنوان ''پونہ میں اردو افسانہ: ایک تحقیق'' ہے۔ یہ تقریباً پونے میں اردو افسانے کا ایک صدی کا تذکرہ ہے۔ کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ پونے میں اردو افسانہ سو سال سے لکھا جا رہا ہے لیکن نذیر صاحب نے معتبر حوالوں سے اپنی تحقیق کو اعتبار بخشنے کی کوشش کی ہے۔ ان تصانیف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس شہر کی مٹی اور آب و ہوا سے والہانہ انسیت رکھتے ہیں اور جس طرح بھی بن پڑتا ہے پونے کے اردو چہرے کو ممتاز و منور بنانے کی سعیِ جمیل کرتے رہتے ہیں۔

نذیر صاحب نے پونے میں غالب کے ایک گمنام شاگرد حکیم خداداد خاں دہلوی کو بھی ان کے کلام کے ساتھ دریافت کیا ہے۔ حکیم صاحب غدر کے زمانے میں دہلی سے ہجرت کر کے پونہ آئے۔ پونے ہی میں زندگی گزاری اور پونے ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ اس سلسلے میں، میں نے جب نذیر صاحب سے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ حکیم خداداد خاں دہلوی کی چالیس غزلیں میں نے دریافت کی ہیں اور میں بہت جلد ان غزلوں پر ایک تفصیلی مقدمہ لکھ کر انھیں شائع کروں گا۔ مجھے امید ہے یہ کتاب بہت جلد منظرِ عام پر آئے گی۔ نذیر صاحب نے پونے ہی کو اپنی تحقیق و جستجو اور تذکرہ نگاری کا مرکز نہیں بنایا بلکہ اپنی جائے پیدائش کا بھی پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ ''تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی'' ایک ایسی کتاب ہے جس میں ان کے گاؤں فتح پور شیخاواٹی (راجستھان) کی ساڑھے پانچ سو سالہ تاریخ کا احوال درج ہے۔ نذیر صاحب کا لسانیات سے علاقہ نہیں ہے لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انھوں نے این سی پی یو ایل کے پروجیکٹ کے تحت ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' عنوان سے ایک حوالہ جاتی کتاب مرتب کی۔ بہار اردو اکادمی نے اس کتاب پر انھیں ''

ISSN : 2582 - 3612



قاضی عبدالودود ایوارڈ'' سے نوازا۔ یہ تحقیق کا باوقار ایوارڈ تھا جو نذیر صاحب کو ملا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر صاحب نے اپنے آبائی وطن شہر فتح پور کا حق بھی ادا کیا اور پونے جو ان کے عمل اور ان کی جد و جہد کا شہر ہے اس کا بھی پورا حق ادا کرنے کی قابلِ تقلید کوشش کرتے رہے۔

ویسے تو ادبی دنیا میں نذیر فتح پوری کا نام ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن ان کی دلچسپی ابتدا ہی سے فکشن نگاری سے بھی رہی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ تقریباً ۱۹۷۱ء کے آس پاس ماہنامہ خاتونِ مشرق دہلی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا فرض کا موتی''۔ اس کے بعد ماہنامہ گل کدہ نئی دہلی، ماہنامہ ندائے فلسطین نئی دہلی، سہ ماہی اسباق پونے، ماہنامہ شاعر ممبئی، ماہنامہ ایوانِ اردو نئی دہلی، ماہنامہ آج کل نئی دہلی اور دوسرے رسائل و جرائد میں بھی ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ اپنی گونا گوں ادبی مصروفیات کی وجہ سے نذیر صاحب پوری طرح افسانہ نگاری کی جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ۹۰ر کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی وہ اپنے افسانوں کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں لا سکے ہیں۔ ابتدا میں افسانہ نگاری کے دوش بدوش انھوں نے ناول نگاری پر بھی توجہ مرکوز کی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں ان کا پہلا ناول ''چٹانوں کے بیچ'' اور دوسرا ناول ''زخم اور آہیں'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد نذیر صاحب نے دو ناول اور لکھے ''چلتے چلتے'' اور ''کرن کا پیار'' لیکن مذکورہ دونوں ناول کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ ہم یہاں نذیر کے ناولوں اور افسانوں سے حوالے دینے سے معذور ہیں اور نہ ہی اہلِ نقد و نظر کی گراں قدر رائے ان کے بارے میں لکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ طوالت کا خوف مجھ پر مسلط ہے اور مجھے ہر حال میں سامعین کا وقت اور اپنی گردن بچانا ہے لیکن اتنا کہنے میں، میں حق بہ جانب ہوں کہ شاعری کی طرح نذیر صاحب فکشن کے میدان میں سنجیدگی اور تواتر کے ساتھ کام کرتے تو شاعر کی طرح وہ ایک معروف اور معتبر فکشن نگار بھی کہلاتے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نذیر صاحب نے ڈرامے بھی لکھے ہیں جو پونے میں اسٹیج پر پیش بھی کیے جا چکے ہیں۔ ان میں شاہ جہاں، آخری جام، زینت محل اور کل کا سورج جیسے ڈرامے اہم ہیں۔ اس کے علاوہ نذیر صاحب نے کچھ سفر نامے بھی لکھے ہیں۔ ایک سفر نامہ ''پونے سے رانچی کا سفر'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا سفر نامہ ''ایک سفر عمان کا'' کے عنوان سے وہ اپنے رسالے اسباق میں قسط وار شائع کر چکے ہیں۔ ان سفر ناموں کا مسافر جہاں سے گزرتا ہے منظروں کو اپنے لفظوں میں قید کر کے کاغذ پر بکھیر دیتا ہے جو بعد میں ایک خوبصورت تصویر بن جاتی ہے۔ نذیر صاحب آنکھیں کھول کر منزلوں کا تعین کرتے ہیں۔ یہاں مجھے نذیر صاحب کی ایک غزل کے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔ دیکھیے سفر ناموں کا یہ مسافر کیا کہتا ہے:

مسافر ہم سفر لگنے لگے ہیں　　سفر اب معتبر لگنے لگے ہیں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

میں اب نیندوں سے آگے جارہا ہوں    مرے خوابوں کو پر لگنے لگے ہیں

سفر کے عنوان سے نذیر صاحب کو محبت ہے۔یہی وجہ ہے انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کے ناموں میں لفظ سفر کو ملحوظِ خاطر رکھا۔مثال کے طور پر لمحوں کا سفر، سفر تا سفر تیسرا سفر، سفر مدام سفر اور نظم سفر وغیرہ۔

نذیر فتح پوری نے اپنی خودنوشت سوانح عمری بھی لکھی ہے جو''بیتے کل کا اک اک پل'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔اس کتاب میں نذیر صاحب کے بچپن کی معصوم وارداتیں شامل ہیں جس کے مطالعہ سے نذیر صاحب کی شخصیت اور ان کے خاندان کے تعلق سے وہ سب کچھ مطالعہ میں آیا جس سے ادبی دنیا قطعی واقف نہیں ہے۔اس کتاب سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ نذیر صاحب نے صرف پانچویں جماعت تک ہی تعلیم حاصل کی ہے۔اس کے علاوہ وہ کوئی تعلیمی سند نہیں رکھتے لیکن ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ دیکھ کر میں اکثر سمجھتا تھا کہ وہ بھی پی ایچ ڈی ہیں بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری انھیں اعزازی طور پر تفویض کی گئی ہے۔البتہ ان کے فکر وفن پر ایک ایم فل کا مقالہ اور دو پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاچکے ہیں۔

ادبی مضامین بھی نذیر فتح پوری نے کثرت سے قلم بند کیے ہیں۔ان کے مضامین کے دو مجموعے ''لفظوں کے سائے تلے (۱۹۹۵ء)'' اور''اعتراف (۲۰۱۲ء)'' کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔ان کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ نذیر صاحب تنقیدی شعور رکھتے ہیں لیکن محض کسی کی شخصیت کو دانستہ مسخ کرنے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی بلکہ اس میدان میں انھوں نے اعترافی مضامین زیادہ لکھے ہیں۔ان کی تلاش وجستجو کا دائرہ محدود نہیں ہے۔وہ اپنے آپ سے بڑھ کر اپنے ہم عصر اہلِ قلم کی تعریف وتوصیف میں زیادہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔انھوں نے جن ادبا وشعرا کے فکر وفن پر کتابیں مرتب کیں ان کی بھی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔طنز ومزاح کے میدان میں بھی نذیر صاحب نے گھوڑے دوڑانے سے پرہیز نہیں کیا اور خانہ بدوش کے عنوان سے بہت سے مضامین تحریر کیے جو مختلف ادبی رسائل کے اوراق پر اپنے ملیح طنز اور تبسم ریز مزاح کے ذریعے چمکتے دمکتے نظر آئے۔غزل، آزاد غزل، پابند نظم، آزاد نظم، دوہے، ماہیے، دوہا غزل، گیت، ماہیا گیت، دعا، نعت شریف، تضمینات، منقبت، قطعات، سہ سطری نظمیں شاید اور بھی کچھ ہوسکتا ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔ان اصناف کی تخلیق سے نذیر صاحب کی تخلیقی خلاقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یہ وہ دریا ہے جو چاروں سمتوں میں بہتا ہے، موجوں کے تھپیڑے جسے روک نہیں پاتے۔یہ اپنی کشتی کا خود ہی کھیون ہار ہے، بادباں اس کی دسترس میں ہے جس سمت چاہتا ہے اپنی کشتی کا رخ موڑ دیتا ہے۔





جو لوگ نذیر فتح پوری کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا ان سے تھوڑی بہت رسم وراہ رکھتے ہیں ان کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ادب میں کئی جہتوں میں اپنی خدمات انجام دینے والے نذیر صاحب کا باقاعدہ کوئی دفتر نہیں ہے۔نہ ان کے ساتھ کوئی کام کرنے والا ہے نہ ان کا ہاتھ بٹانے والا ہے۔وہ سارا کام تنہا ہی انجام دیتے ہیں۔ہم انھیں ''ون مین آرمی'' کہہ سکتے ہیں۔ایک ایسا سپاہی جس کے پاس نہ ہتھیار ہے، نہ خود اپنی حفاظت کے لیے کوئی سامانِ حرب لیکن پھر بھی یہ سپاہی اکیلا ہی میدانِ جنگ کے محاذ پر ڈٹا ہوا ہے۔نذیر صاحب نے اسباق پبلی کیشنز کے تحت اردو کی تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شائع کی ہیں۔اردو کے ساتھ ہندی اور مراٹھی کی بھی چند کتابیں شائع کی ہیں۔یہ سارا اشاعتی کام نذیر صاحب نے رضا کارانہ طور پر کیا ہے یعنی اسے پیشۂ تجارت نہیں بنایا بلکہ کم سے کم مصرف میں دوستوں کی کتابیں شائع کیں اور اس کے بہت سے ثبوت آپ کو مل سکتے ہیں۔اس اشاعتی کام کے لیے انھوں نے اسباق پبلی کیشنز جیسا غیر تجارتی ادارہ بنا رکھا ہے۔دوسروں کی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی کتابیں بھی اسباق پبلی کیشنز کے تحت ہی شائع کرتے ہیں۔ان کتابوں کی اشاعت میں ان کی ذہنی اور جسمانی محنت کو بڑا دخل ہے۔ایسے ہی محنت کش انسانوں کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی    یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

نذیر فتح پوری نے اپنے علم سے خود کے لیے بھی جنت بنائی ہے اور احباب کے لیے بھی۔۔۔۔۔نذیر ایک ایسے مسافر ہیں جو کارواں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے چاہنے والے کم نہیں۔اردو ہی نہیں ہندی اور مراٹھی کے قلم کار بھی ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

میں نے ابھی کہا کہ ایک بلند بانگ شاعر وادیب، صحافی، محقق ونقاد، خالص ادبی رسالے سہ ماہی اسباق کے مدیر اور فکشن نگار نذیر فتح پوری کی کئی ادبی جہتیں ہیں لیکن ان سبھی جہتوں پر بھاری پڑنے والی ان کی خوبصورت اور خوب سیرت شخصیت ہے جس میں بچوں کا ایک بہترین شاعر وادیب بھی سانس لیتا ہے۔جہاں کہیں انھیں احساس ہوا کہ بچوں کے لیے بھی کچھ لکھنا چاہیے انھوں نے ضرور لکھا جس کے نتیجے میں تین کہانیوں کے مجموعے''میرا دیش مہان (۲۰۱۳ء)''، ''پشاور کی ۱۷ کہانیاں (۲۰۱۵ء) اور''چھوٹا بچہ چھوٹی کتاب (۲۰۱۷ء)، دو ناول''امیر تیمور (۲۰۱۰ء)'' اور''امیر تیمور ہندوستان میں (۲۰۱۱ء)'' اور نظموں کا ایک مجموعہ''بچوں! آؤ گیت سنائیں (جس کے دو اڈیشن بالترتیب ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئے)'' جو صرف اور صرف بچوں کے لیے اشاعت پذیر ہوئے ہیں لیکن ان کتابوں کو بڑے بھی پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں اور بچوں کو کہانی یا نظم کی صورت میں سناتے ہیں۔

نذیر فتح پوری کہنہ مشق اور بزرگ شاعر ہیں۔اب تک ان کے بیس شعری مجموعے شائع ہوچکے

ہیں۔انھوں نے شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے بلکہ اپنی تخلیقی قوت و وسعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ نظم اور غزل دونوں پر یکساں قوت رکھتے ہیں۔ جہاں وہ اپنی نظموں میں ربط و تنظیم، وضاحت وصراحت حقیقت بینی اور جذئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہیں وہیں غزل کے اشاروں اور کنایوں کا فن بھی سمجھتے ہیں۔مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ وساغر کے رنگ میں کرتے ہیں۔وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ غزل اپنی عبارت، اشارت اور ادا کے اعتبار سے غالب کے محبوب کی طرح ہے۔غزل گنجینۂ معنی کا طلسم ہے، حدیثِ دلبراں ہے،صحیفۂ کائنات ہے اور بقول عبداللہ کمال بے مروت اور قاتل صنف بھی ہے۔ چنانچہ نذیرؔ فتح پوری کی غزل کے موضوعات میں محبت اور دلفریفتگی کے ساتھ کچھ نہ کچھ بغاوت کا اظہار بھی ہوتا ہے، ولولہ اور مایوسی بھی ہے، مسرتوں اور دکھوں کا سلسلہ بھی ہے، رشک وحسد سے کھیلنا، رہبری، رہزنی، ساحل اور طوفاں نیز روحانی وقلبی واردات ،غرض انھوں نے ماضی اور حال میں برتے جانے والے تمام غزلیہ موضوعات سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور اپنے معاصرین سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہے۔اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نذیرؔ فتح پوری نے مذکورہ موضوعات کو نہ صرف سلیقے سے پیش کیا بلکہ ان میں اپنے لہجے اور تخلیقی تجربے کی انفرادیت کا ذائقہ بھی شامل کر دیا ہے۔

یہاں ایک بات دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ نذیر فتح پوری غالب کے شیدائی نہیں بلکہ انھیں میر پسند ہے۔وہ خود اپنے ایک شعر کے ذریعہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

روشنی کی لکیر باقی ہے
میرؔ ہے تو نذیرؔ باقی ہے

میرؔ کے اسلوب میں نذیرؔ نے چند غزلیں بھی لکھی ہیں جن کے اشعار کانوں میں پڑتے ہی سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں اور پھر دیر تک ذہن و دل میں گونجتے رہتے ہیں۔ وہ خود بھی بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔سیدھے سادے، صاف ستھرے، موثر، معتبر۔۔۔۔۔سہل ممتنع کے کسے ہوئے سمبل شعر کی طرح، سادہ اور پرکار۔۔۔۔۔!چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اتنا مشہور مرے خون کا قصہ ہووے
سوئی انگلی میں چبھے، شہر میں چرچا ہووے

اس کو محسوس بھی کر لو تو یہ ہووے انجام
درد سینے میں اٹھے دکھ میں اضافہ ہووے

اوڑھ کر اپنے ہی احساس کو بس جائیں جہاں
کاش بستی سے پرے اپنا جزیرہ ہووے

پیاس نے چھین لی گھٹنوں کی توانائی نذیرؔ
کوئی دریا جو ملے راستہ ہلکا ہووے

◆◆◆◆

ہر روز نیا اک ستم ایجاد کرو ہو
آباد رہو ہو، ہمیں برباد کرو ہو

جس شہر میں ہر شخص ہے پتھر کا تراشا
اس شہر میں کس واسطے فریاد کرو ہو





برسا نہیں آنکھوں سے ابھی کرب کا ساون
کیوں ختم ابھی درد کی روداد کرو ہو

◆◆◆◆

اے ہمدمو ! کیوں زخمِ محبت سے ڈرو ہو
جب پھول کی پتی سے جگر چاک کرو ہو

دشمن کو بھی مارو ہو مگر دوست بنا کر
جو کام کرو ہو وہ سلیقے سے کرو ہو

بس چلتے چلتے وہ جو ملا تھا نصیب سے
ٹک میں نے بھی نبھائی وفا اس حبیب سے

◆◆◆◆

میں سرگراں ہی پھرتا رہا خارزار میں
مجھ کو کبھو سکوں نہ ملا اس دیار میں

اس طرح کے اور بھی جاندار اشعار ہیں جو ان کے شعری سرمائے میں موجود ہیں مگر نذیرؔ فتح پوری نے جس طرح میر کے اسلوب کو توسیع دینے کی کوشش کی اس نے انھیں بڑی حد تک روایت پسند ہی بنائے رکھا لیکن ان کے لہجے میں جدیدیت کے سبب توسیع تو ضرور ہوئی مگر کوئی بڑا اضافہ سامنے نہیں آیا۔اس کے برعکس ان کی شاعری بہت پیاری ہے۔جذبات کی شدت سے تپی ہوئی اور تجربات کی بھٹی میں پکی ہوئی، فکر انگیز، پرسوز اور ادراک وشعور میں رچی ہوئی۔رومان ومحبت کی رنگارنگ کیفیات فکرواحساس کی دھمک اور عصری حسیت کی آئینہ دار۔۔۔۔۔!

نذیرؔ فتح پوری کی نظم نگاری بھی قابلِ تحسین ہے۔نذیرؔ کی پابند نظموں کا مجموعہ ''نظم سفر'' کے نام سے ۲۰۱۴ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت اسلوب و آہنگ میں تحریر کردہ ان نظموں کا مطالعہ ذہن ودل کو روشنی عطا کرتا ہے۔اس مجموعے کی بہت سی نظمیں اپنے آپ میں انفرادی پہلو رکھتی ہیں۔ کچھ نظمیں طویل ہیں، کچھ مختصر ہیں۔ایک مختصر سی نظم ملاحظہ کیجیے جس کا عنوان ''مشورہ'' ہے۔ یہ نظم ان کے زیرِ ترتیب مجموعے ''پہلے دکھ کا نزول'' میں شامل ہے ؎

میں جہاں سے گزرا ہوں
پتھروں کی راہیں تھیں
نقشِ پا نہ پاؤ گے
مجھ کو ڈھونڈنے والو!
لوٹ کر چلے جاؤ!

مذکورہ بالا نظم کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ نظم نذیر صاحب کے ادبی سفر کی روداد ہے اور دیکھیے کس سادگی اور صفائی سے نذیر صاحب نے اپنے پچاس سالہ ادبی سفر کی کہانی بیان کر دی۔

نذیر فتح پوری کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں متعدد ایوارڈس اور انعامات سے نوازا گیا جن

میں سب سے بڑا ایوارڈ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کی جانب سے ادبِ اطفال کی خدمات کے عوض تفویض کیا گیا۔ پونے میں اردو ادب کے حوالے سے یہ پہلا قومی ایوارڈ تھا جو انھیں ۲۰۱۷ء میں دیا گیا۔ راجستھان کے اردو نصاب میں بھی نذیرؔ فتح پوری کی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ دسویں جماعت کی درسی کتاب میں نظم ''یہی مٹی ہمارا دل''، چھٹی جماعت کی درسی کتاب میں ''نیا عہد نامہ'' اور چوتھی جماعت کی درسی کتاب میں ''بچو! آؤ گیت سنائیں'' جیسی نظمیں شامل ہیں لیکن آج تک مہاراشٹر کی کسی نصابی کتاب میں ان کی کوئی تخلیق شامل نہیں کی گئی۔ تخلیق کے شاملِ نصاب ہونے یا نہ ہونے سے نذیرؔ فتح پوری کی ادبی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ بچوں کے ادب پر ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ یافتہ شاعر و ادیب ریاستِ مہاراشٹر میں ہونے کے باوجود بھی ان کی کوئی تخلیق کسی درسی کتاب میں شامل کیوں نہیں ہوئی؟ میں جواب کی تلاش میں ڈوب جاتا ہوں تب مجھے نذیرؔ صاحب کے دو شعر یاد آتے ہیں۔

اک ایک لفظ لکھا ہوا دے کے جاؤں گا  ہونے کا اپنے سب کا پتا دے کے جاؤں گا
ڈھونڈا کرے گا مجھ کو مرے بعد ہر کوئی  آئندہ نسل کو یہ سزا دے کے جاؤں گا

لیکن بقول نذیرؔ فتح پوری :

''اس شاعرانہ تعلّی اور طفلانہ خوش فہمی کو میں خود بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ ہم فرمواش کردہ تہذیب کے جس زوال پذیر دور میں جی رہے ہیں جہاں غالبؔ جیسے نابغہ کی قبر کا کتبہ محفوظ نہیں، خاقانیِ ہند استاد شاہ ابراہیم ذوقؔ جیسے جلیل القدر شاعر کی قبر پر بیت الخلا بنا دیے جاتے ہیں۔ میر تقی میرؔ جیسے عہد ساز شاعر کی قبر ریل کی پٹریوں کے نیچے دبا دی جاتی ہے۔ ولیؔ کے مزار کو جہاں فرقہ پرستی کے بلڈوزر سے پیوندِ خاک کر کے اس پر شارعِ عام بنا دی جاتی ہے وہاں نذیرؔ فتح پوری جیسے شاعر کو پیوندِ خاک ہونے کے بعد کون تلاشنے والا ہے۔ آئندہ نسل میں کون اس سزا کا سزاوار ہونے والا ہے۔ جیتے جی یار لوگ جس کے لیے ایک تابوت ہمہ وقت تیار رکھتے ہیں اور اس لمحے کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں کہ کب اس میں آخری کیل ٹھونکی جائے گی لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم سب ایسے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں وسعتِ فکر کے پروردگار تعصب اور تنگ نظری کا دفتر دبائے پھرتے ہیں۔ جہاں حق بات کہنے کی پاداش میں ہنستے ہنستے سولی پر چڑھ جانے کا دعویٰ کرنے والے فنکار تھوڑی طمع اور مقصد

ISSN : 2582 - 3612



براری کے لیے حاکمِ وقت کے تلوے چاٹنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جہاں علم کے پہاڑ پر کھڑے لوگ جہالت کے ان جھرنوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ان کے قدموں کے نیچے بہہ رہے ہیں۔ مکھوٹے لگا کر ہم کب تک لوگوں کو فریب دیتے رہیں گے۔ قول و فعل میں یہ تضاد کب تک چلتا رہے گا۔''

(میں کیوں لکھتا ہوں، مطبوعہ سہ ماہی سفیرِ اردو لندن، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء، صفحہ نمبر ۱۶)

لیکن جب میں نذیرؔ فتح پوری کی طرف دیکھتا ہوں تو وہاں مجھے ایک ہی چہرا دکھائی دیتا ہے۔ وہ مکھوٹے نہیں چڑھاتے۔ جیسے ہیں، بس ہیں! وہ خوابوں اور خیالوں کی دھند میں کھوئے نہیں رہتے۔ خالص عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ متحرک اور سرگرم کار رہتے ہیں۔ عملِ پیہم، جہدِ مسلسل اور مستحکم یقین ان کے خصوصی اوصاف ہیں۔ ان کی شخصیت ایک عجیب سے اضطراب سے گوندھی ہوئی ہے اور انکسار و خاکساری کے جوہر نے ان کی شخصیت کو اور بھی محبوب و محترم بنا دیا ہے۔ وہ ایک بے ساختہ ادیب ہیں۔ ان کی ادبی تحریروں میں بڑی مٹھاس اور روانی ہے۔ قاری خود بخود ان کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ صرف الفاظ نہیں رکھتے، ان میں فکر و احساس، جذبے کی آنچ اور جوش و حرارت کو بھی سمو دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں کردار کی پختگی، گداز، لچک، استواری، خلوص اور بے لوثی موجود ہے جس کے بغیر ایک اچھے انسان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی انسان بننا بڑا مشقت طلب مرحلہ ہوتا ہے۔ ساری عمر اپنے آپ سے الجھنا پڑتا ہے۔ ہزار آلائشوں سے دامن بچانا پڑتا ہے تب کہیں وہ شفافیت حاصل ہوتی ہے جسے انسانیت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ نذیرؔ فتح پوری صاحب واقعی ایک اچھے انسان ہیں جو رحم دل، فیاض، نیک سیرت، شائستہ مزاج، خلیق مربی، اعلیٰ ظرف اور مثالی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے حسنِ اخلاق کے جلوے اردو کی نئی بستیوں تک دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی خوش طبعی، شگفتہ مزاجی، نرم خوئی اور گفتار و کردار کی بلندی کے حوالے سے ہمیشہ پہچانے جائیں گے۔ ان کی شخصیت ہم جیسے طالب علموں کے دلوں پر نقشِ تاباں کی طرح جگمگاتی رہے گی۔

**Dr. Md. Danish Gani**
Dept. of Urdu
Gogate Jogalekar College
Ratnagiri - 415 612
(Maharashtra )
Mobile No. 9372760471

ڈاکٹر افروز الہدیٰ

# فیض احمد فیض کی شاعرانہ انفرادیت

فیض احمد فیض سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے قصبے کالا قادر میں پیدا ہوئے۔فیض کی تاریخ ولادت کہیں ۱۳رفروری ۱۹۱۱ء ہے تو کہیں ۱۳رفروری ۱۹۱۲ء۔لیکن انہوں نے اپنی تحریر میں ۱۳رفروری ۱۹۱۱ء کو صحیح تاریخ پیدائش قرار دیا ہے۔ان کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوا۔اس طرح انہوں نے تقریباً تہتر (۷۳) سال کی عمر پائی۔

فیض احمد فیض کی شاعری کا آغاز دس سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ان کے گھر کا ماحول پوری طرح مذہبی تھا لیکن اپنے گھر کے قریب واقع ایک دکان سے کرائے پر حاصل کر کے انہوں نے کم عمری میں ہی مشہور داستانوں کا مطالعہ شروع کیا۔داغؔ، میر اور غالبؔ جیسے شاعروں کے دیوان بھی انہوں نے دلچسپی سے پڑھے۔

دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے فیض باقاعدہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔۱۹۲۸ء آتے آتے فیض کی شاعری کو اعتبار حاصل ہونے لگا تھا۔ان کی شاعری کی عوامی شہرت کا آغاز ۱۹۲۸ء میں مرے کالج کی ادبی تنظیم ''اخوان الصفا'' کے مشاعرے سے ہوا۔اس مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی اس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلادے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

فیض چونکہ ترقی پسند تھے،اس لیے جب وہ کسی کے عہد میں دل زار کے سبھی اختیارات کے چلے جانے کی بات کرتے ہیں تو اس میں وزن ہی اور ہوتا ہے،اس میں حسن ہی اور ہوتا ہے۔چونکہ وہ انقلابی اور ترقی پسند وغیرہ تھے،اس لیے ان کے کلام کو سیاسی معنی پہنانے میں ایک طرح کا لطف ہے۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی یہی شعر انہوں نے اگر درد کے زمانے میں یا غالب کے زمانے میں کہے ہوتے تو انہیں کوئی گھاس نہ ڈالتا۔فیض کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے کلاسیکی اصطلاحاتی الفاظ کو دوبارہ زندہ کیا اور انہیں غزل میں مقبول کیا وہ ہماری شاعری کا ایک روشن باب ہے۔کلاسیکی رنگ وآہنگ والے الفاظ فیض کے علاوہ

ISSN : 2582 - 3612



دوسرے بہت سے شاعروں نے استعمال کیے ہیں اور وہ فیض کے ہم خیال وہم عقیدہ بھی تھے لیکن ان کے یہاں ان الفاظ میں وہ حسن نظر نہیں آتا جو فیض کے یہاں ہے۔

فیض کے بہت سے عمدہ اشعار ہیں جن میں رسومیاتی الفاظ نہیں ہیں، پھر ان کی کامیابی کا راز کیا ہوسکتا ہے،اس ضمن میں ان کے چند مشہور اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کتنی

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھِلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگ لب سے ہے

بقول شمس الرحمٰن فاروقی :

''یقیناً فیض نے غزل میں کلاسیکی رنگ کو جس طرح زندہ کیا وہ ہماری شاعری کا ایک روشن باب ہے۔ان کی غزل میں اردو غزل کی وہ تہذیب بول رہی ہے جس میں مضمون آفرینی اور کیفیت کا عمل دخل تھا۔فیض کے یہاں کیفیت کا جادو نظموں میں بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ غزل کی تہذیب کے پس منظر میں فیض کا مطالعہ از سر نو کیا جائے۔یقیناً فیض نے وقت کے آہنگ اور احساس کو کامیاب زبان عطا کی۔''

جہاں تک فیض کو بحیثیت نظم نگار تسلیم کیا جائے،ان کی نظمیں عموماً مختصر مگر نہایت معنی خیز ہوتی ہیں۔

بقول ن۔م۔راشد :

''فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں،صرف احساسات کا شاعر ہے اور اپنے شدید احساسات کو وہ اپنے حسین الفاظ کے ساتھ اسی طرح پیوست کرتا ہے کہ وہ ایک ہی پیرہن کے تاروپود معلوم ہونے لگتے ہیں''۔

نظم کے فنی تقاضوں کا احساس اور خود ضبطی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔انہوں نے نعروں سے پرہیز کیا ہے اور اپنے جذبات کا اظہار دھیمی اور دبی دبی زبان میں کرتے ہیں۔ان کے یہاں افکار و جذبات میں ایک قسم کا ضبط نمایاں ہے،تفصیل کی بجائے اختصار ہے۔لفظوں کی تکرار اور خطابت کی تکنیک سے وہ کام لیتے ہیں۔ان کی شاعری میں امیجری کی دو سطحیں ہیں۔ایک براہ راست اور دوسرا پیچیدہ۔ان کی شاعری رومان اور انقلاب سے عبارت ہے۔ان کے یہاں جدید طرز کے خیالات ونظریات ملتے ہیں، مجموعی طور پر ان کے یہاں ترقی پسندی ، بین الاقوامیت ، محنت کش طبقہ کی ترجمانی ، محکومی اور مظلومی کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ان کی نظموں میں سیاسی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ جذبے کی سچائی اور خلوص بھی ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

وہ سیاسی موضوعات کو کھلے ڈلے طریقے پر خطیبانہ اور واعظانہ انداز میں نظم کر دینے یا بندھے ٹکے نعروں کو اوڑھنا بچھونا بنانے کو اچھی طرح نظر سے نہیں دیکھتے۔ بقول پروفیسر ممتاز حسین :

''سیاسی اور ملکی حالات کو ایک انسان کی حیثیت سے سمجھنا چاہئے لیکن شعری جامہ پہناتے وقت شاعر کو چاہئے کہ وہ یہ بات ضرور ذہن نشیں رکھے کہ جہاں انسان ہے، وہیں وہ شاعر بھی ہے، اس لیے اپنے جذبات سیاسی، ملکی اور قومی تاثرات کو شاعرانہ لہجے میں الاپے تا کہ بیک وقت شعر و سیاست کا بہترین امتزاج اور کومل اختلاط کا رابطہ استعارہ رہ سکے۔''

اس خیال کے اعتبار سے فیض کی شاعری کامیاب نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں سیاسی و انقلابی رجحانات میں جو امتزاج پایا جاتا ہے وہ شاعرانہ حسن سے پوری طرح مالا مال نظر آتا ہے اور یہی حسن ان کی نظموں کی اہم خوبی ہے۔ ان کی نظم ''آج بازار میں پا بجولاں چلو'' اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ ملاحظہ کریں۔

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں    تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو    دستِ افشاں چلو مست و رقصاں چلو
چاک بر سر چلو خوں بہ داماں چلو    راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو
حاکمِ شہر بھی مجمعِ عام بھی    تیرا الزام بھی عذرِ ناکام بھی
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے    شہرِ جاں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے    رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو    آج بازر میں پا بجولاں چلو

اس سیاسی نظم میں بلا کا شعری حسن ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کے یہاں شعر و سیاست میں توازن برقرار رہتا ہے۔ ان کی یہ خوبی ہمیں اس حد تک متاثر کرتی ہے کہ ہم اس کو محض سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بجائے اس کے شعری حسن سے پوری طرح متاثر ہوجاتے ہیں۔

انگریزوں کے اقتدار کی وجہ سے ہندوستانیوں کی غلامی و محکومی کا احساس فیض احمد فیض کو بھی دیگر شعرا کی طرح تھا اور شدید تکلیف بھی تھی کہ اس کے سبب انہیں بہت سی ذلتوں کا بھی سامنا کر پڑ رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ غلامی و محکومی کا دن زیادہ مدت تک برقرار رہنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا خاتمہ بھی بہت جلد ہونے والا ہے۔ ان کی فکر صرف ہندوستان کی آزادی تک محدود نہیں تھی بلکہ دوسرے ممالک کے سیاسی مسائل بھی انہیں فکر مند رکھے ہوئے تھے۔ ادب کا کوئی سرحد نہیں ہوتا، وہ کسی

ISSN : 2582 - 3612



ایک ملک یا قوم کی میراث نہیں ہوتی لہٰذا فیض صاحب ہر موضوع پر توجہ دیتے تھے جو انسانیت کو تباہی سے بچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلسطینی مجاہدوں کے اوپر اسرائیل کے مظالم دیکھ کر بے چین ہو اٹھتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

میں جہاں پر بھی گیا ارض وطن    تیری تذلیل کی یادوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے    تیری الفت تیری یادوں کی کسک ساتھ گئی

☆☆

آنکھوں سے دور رفیقوں چلن ساتھ رہا    کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش میرا ہاتھ رہا
اور پردیس کی بے نام و نشاں راہوں میں    اجنبی شہر کی بے مہر گزر گاہوں میں
جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم    لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم

فیض کی نظموں میں گہرائی اور فکری وقار بھی ہے۔ منظر کشی کا حسن اور احساس کی شدت ہمارے دل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ ان کی نظم ''تنہائی'' میں سوگواری اور اداسی کی کیفیات اور شاعر کے احساس اور وزن کے زیر و بم میں مطابقت نے اسے اردو کی بہترین مختصر نظموں میں جگہ دی۔

پھر کوئی آیا دلِ زارا نہیں کوئی نہیں    راہ رو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار    لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزر    اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو    اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

فیض احمد فیض کے یہاں صرف انقلاب، انقلاب کا نعرہ نہیں ملتا بلکہ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے پھول، گلشن، موسم بہار اور مہک خوشبو کا تذکرہ بھی کثرت سے ملتا ہے۔

دشت تنہائی کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سخن اور گلاب    قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے
مہک رہی ہے فضا زلف یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ، آبگینوں میں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

دل عشق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

فیض نے اپنے اشعار کے ذریعہ عالمی مسائل کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جن سے انسان کی شخصی آزادی اور حریت متصادم اور مجروح ہوئی ہے، چنانچہ جب آزادی اور حریت کے متوالے ایرانی نوجوان طلباء آمادۂ انقلاب ہوتے ہیں تو استبدادی قوتیں ان سے متصادم ہوتی ہیں اور چشم زدن میں ان کا شمار شہید جستجوئے آزادی میں ہونے لگتا ہے۔ تب فیض اپنے مخصوص رنگ و آہنگ میں پکار اٹھتے ہیں ؎

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی ہیں
یہ کون جوان ہیں ارض عجم میں
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارض عجم، اے ارض عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیئے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجان
ان ہاتوں کی بے کلی چاندی
کس کام آئی کس ہاتھ لگی

فیض کی شاعری کا امتیاز الفاظ کی ندرت وسلاست، تراکیب وتعابیر کی جدت وجودت اور اظہار وبیان کی شدت وحرارت ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ انقلاب کی دیوی کے ہاتھ میں

ISSN : 2582 - 3612



چپکے سے پرچم محبت تھما دیتے ہیں اور جذبات عشق ومحبت سے سرشار نظر آتے ہیں۔

''نقش فریادی'' کی ابتدائی نظمیں ''خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو''، ''میری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دو مجھ کو'' اس قبیل کی ہیں جن میں سماجی کشمکش اور حالات کی تلخی کا احساس بہت کم ملتا ہے۔ لیکن ایک وقت وہ آیا جب فیض صاحب کے سماجی شعور نے غم محبوب کے ساتھ ساتھ غم روزگار سے بھی انہیں آشنا کر دیا۔ سماج میں پائی جانے والی نا آسودگی، کربنا کی، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس نے فیض کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا اور ان کے لہجے میں بلا کی اداسی اور مایوسی پیدا ہوگئی۔ سماجی شعور، وسیع تر انسانی رشتوں کے احترام اور تمام انسانوں کے درد مشترک کے احساس نے رومانوی جذباتی تصورات کی جگہ فیض کو زندگی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنے کا عادی بنا دیا، ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے اس سماجی شعور کو اور بھی پختگی بخشی، غم محبوب کے ساتھ اس نئے غم نے فیض کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔

ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے کے باوجود فیض تخلیقی عمل میں اپنے ہمعصر ترقی پسند شعراء سے مختلف نظر آتے ہیں، یقیناً وہ ایک عملی انسان ہیں، زندگی ان کے نزدیک ایک مجاہدہ ہے۔ ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے ان کا کلیات بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ''دست صبا'' کے تحت یاد کے عنوان سے فیض کی ایک نظم کے چند بند ملاحظہ کیجئے ؎

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ     اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ     گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

☆☆

اس قدر پیار سے اے جان جہاں، رکھا ہے     دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق     ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

بلاشبہ فیض نے جس واقعیت، حقیقت پسندانہ معنویت، شاعرانہ صداقت اور جمالیاتی کیفیت سے اپنی شاعری کو زندگی اور تابندگی بخشی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

**Dr. Md. Afrozul Hoda**
Head, Deptt. of Urdu
C. R. College, Kishanpur
Samastipur (Bihar)
Mob. : 93861 17122

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

# جدیدیت، مابعد جدیدیت : چند باتیں

اردو ادب میں تحریکات ور جحانات کافی زمانہ بہت غلغلہ رہا ہے۔ جس زبان اور اس کے ادب کی بنیاد فارسی اور عربی رہی ہو، اس کا مزاج بدلنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن اردو نے جس طرح دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کئے اس نے دوسرے خطّوں اور زبانوں میں چل رہی تحریکات کا اثر بھی لیا اور مختلف رجحانات کو برت کر بھی دیکھا۔ ترقی پسند تحریک کے حامیوں نے حصولیاتی مادیت کو فالو کرتے ہوئے مزدوروں، محنت کشوں کی حمایت میں آوازیں بلند کیں، سرمایہ داروں کے ظلم و جبر کے خلاف احتجاجی علم اٹھایا۔ اس تحریک کی سرگرمیوں نے ابتدا میں اردو کے قارئین کو متاثر بھی کیا۔ لیکن چونکہ یہ تحریک ہماری صدیوں پرانی روایت اور مزاج کے برعکس تھی اس لئے یہ رفتہ رفتہ اپنا اثر کھوتی چلی گئی۔ اس وقت اردو میں بڑی تعداد میں ترقی پسند ادیب اور شاعر دانستہ یا غیر دانستہ مارکسیت کی تشہیر و تبلیغ میں مصروف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ :

> ''ترقی پسندوں نے ادب میں زبردست انقلاب پیدا کیا، انھوں نے نہ صرف عام لوگوں کی
> بات کی بلکہ ان کے حقوق اور عزت نفس کے تحفظ کی لڑائی بھی لڑی اور سب سے بڑا کارنامہ
> یہ کہ انھوں نے اردو ادب کو تخیل کی وادی سے نکال کر حقیقت کی ٹھوس زمین پر لا کھڑا کیا۔''

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ جانتے تھے کہ ان کا مشرقی معاشرہ مارکسزم کے اصولوں کو کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا اور نہ ہی مذہب اور عقائد کے خلاف کچھ سنے گا، لہٰذا ان میں سے بیشتر نے اس تحریک سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور باقی جو بچے انھوں نے بہت چالاکی کے ساتھ اپنے منشا اور منشور کی ترسیل کو جاری رکھا۔ ترقی پسندوں نے مزدوروں کی حالت زار اور انسانیت کی پامالی کا رونا روتے ہوئے اردو عوام کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے قصداً مذاہب اور عقائد سے عوام کو دور کرنے کی طرح طرح کی ترکیبیں آزمائیں تاکہ مارکسزم کی راہ ہموار ہو سکے، اور وہ اس کوشش میں کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مگر یہ ایک کارِ محال تھا اس لئے اس تحریک کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا۔

اس بات پر اہالیان ادب کا اتفاق ہے کہ اردو میں جدیدیت کا رجحان ترقی پسندی کے ردِعمل کے طور پر منصۂ شہود پر آیا۔ مگر اس امر میں جزوی صداقت ہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو ادباء اجتماعیت کے بدلے انفرادیت کو اہمیت دینا چاہتے تھے اور ترقی پسندی کے زمانہ میں شور و شغف اور مارکسی فلسفہ سے نالاں تھے انھوں نے ترقی پسندوں کی اجتماعیت سے الگ اپنے لیے انفرادی اظہار کا راستہ منتخب کیا۔ یہ کام بالکل غیر ارادی طور پر ہوا لیکن اس سے فائدہ اٹھا کر اردو کے جید نقاد اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی نے ادباء شعراء کی ایک جماعت کھڑی کردی اور مغرب میں ماڈرنزم کے جو بھی اصول اور نظریات تھے انھیں اردو میں ہو بہو منتقل کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ اردو میں جدت اور ندرت ہر زمانہ میں

ISSN : 2582 - 3612



رہی ہے لیکن اس طرح کی جدت اور جدیدیت بالکل غیر فطری اور ناموافق تھی۔ جدیدیت کی مختلف جہتوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھے خاصے ادباء نے جدیدیت کی موٹی ردا اوڑھ کر اپنے آپ کو دنیا سے بالکل بیگانہ کرلیا انھیں ادب پڑھنے والوں کی اکثریت سے کوئی مطلب نہ رہا انھوں نے اپنی ذات اور انفراد کو اولیت دیتے ہوئے علامت، تجرید اور تمثیل جیسے Tools کو اپنا حربہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نثری فن پارہ ہو یا شعری، ہر جگہ ابہام، اغلاق اور اہمال کا کثیف بادل چھا گیا۔ ایک مغربی ادیب روپ گریے نے لکھا کہ :

> ''فن پارہ کی تفہیم اس کی سب سے بڑی خامی اور ناکامی ہے۔''

لہٰذا ہمارے جدیدیوں نے بھی یہ طے کرلیا کہ کسی طرح بھی ان کے فن پارے کی ترسیل نہ ہونے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کہانی بیانیہ اور پلاٹ سے عاری ہوگئی اور شاعری چیستاں اور معمہ بن کر رہ گئی۔ لیکن ایک غنیمت یہ رہی کہ یہ رجحان محض دس سال (1960 تا 1970) میں ایک مداری کی طرح تماشہ دکھا کر منظر نامے سے غائب ہوگیا۔

جدیدیت کے رجحان سے جہاں بہت سے منفی اثرات سامنے آئے وہیں کچھ اچھے اور معیاری فن پارے بھی معرض وجود میں آئے بطور خاص فکشن اور شاعری میں کئی ادباء اور شعراء نے پہلی دفعہ بالکل نئے انداز میں اپنے عہد کو منعکس کیا۔ مگر ان جزوی خصوصیات کے باوجود یہ رجحان تادیر ٹک نہ سکا۔

1980ء کے بعد یہ سوال گردش کرنے لگا کہ جدیدیت کے بعد اب کیا ہوگا؟ تو اس کے جواب کے لیے فاروقی صاحب کے ہم پلہ ناقد گوپی چند نارنگ تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے پورے کرّ وفر کے ساتھ اردو میں مابعد جدیدیت کو داخل کردیا۔ اس رجحان کے آتے ہی نئی نئی اصطلاحیں سامنے آنے لگیں۔ ساختیات، پس ساختیات مابعد نو آبادیات اس کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔ یہ ایک طرح سے حریت کے مکمل اظہار کا وسیلہ قرار پائی۔ مابعد جدیدیت جب سامنے آئی اس وقت ٹھیک سے لوگ جدیدیت کو بھی نہیں سمجھ پائے تھے اس پر مستزاد یہ کہ مابعد جدیدیت اپنے بھاری بھرکم فلسفہ اور تھیوری کے ساتھ وارد ہوگئی۔ فاروقی صاحب کے مطابق یہ جدیدیت کی ہی ایک نئی شکل ہے یعنی وہ جدیدیت کے بطن سے ہی باہر آئی ہے۔ جدیدیت میں مصنف اپنے منشا کے تحت تخلیق کرتا ہے اور مابعد جدیدیت میں بھی فنکار اپنے کسی نہ کسی منشاء کے تحت ہی کچھ تحریر کرتا ہے۔ رہی بات قاری کی تو وہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کیفیت اور منشاء مصنف کو دیکھے، پرکھے اور اس کی توضیح و تفہیم کی راہیں خود سے تیار کرے۔ کیونکہ اس رجحان کی رو سے اصل فیصل قاری ہی ہوتا ہے۔

اردو میں مابعد جدیدیت کے علمبرداروں میں گوپی چند نارنگ، نظام صدیقی، وہاب اشرفی اور ناصر عباس نیّر کے علاوہ درجن بھر سے زیادہ ادباء شعراء اٹھ کھڑے ہوئے اس کی مختلف شقوں پر رسائل اور کتب کے ذریعہ بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا لیکن یہ سلسلہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس کی مختلف شقیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں، اردو کے قارئین کے لیے یہ جدیدیت سے بھی مشکل شئے تھی۔ یہاں جدیدیت کے برعکس فلسفہ ہی فلسفہ تھا، تھیوری ہی تھیوری تھی اور فن کا نام و نشان دور دور تک نہیں تھا۔ مابعد جدید نقادوں نے ہمارے تمام قدیم فن پاروں کو مابعد جدیدیت کی جھولی میں ڈال دیا

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اورسب پر پوسٹ ماڈرنزم کا لیبل چسپاں کردیا۔لیکن ایک عافیت یہ رہی کہ انھوں نے ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی طرح نہ ہدایتیں جاری کیں اور نہ ان پر اصرار کیا۔یہ ایک نئی قسم کی آزادی تھی۔جو زندگی کو ہر سطح پر تمام بندشوں اور قیود سے نجات دلانا چاہتی تھی۔قاری کو یہ چھوٹ دے دی گئی کہ وہ قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید متن اور Content کو نئے سرے سے معنی پہنائے۔اس کا سب سے نقصان دہ اثر یہ ہوا کہ ہمارے مذاہب اور عقائد بھی اس آزادی کی زد میں آ گئے، ہماری مذہبی کتابوں کی ازسرنو تعبیر و تفہیم کی بات ہونے لگی یہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بند تھیوری تھی جسے ماڈرنزن ازم کے ذریعے ہمارے معاشرے میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی اور اسی آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگ پیدا ہونے لگے۔یہ ایک نئی لبرلزم ہے اس لئے اس کی فکر کی حدیں لامحدود ہیں جس میں بقول پروفیسر لطف الرحمٰن اللہ میاں کو چھوڑ کر دنیا کی تمام چیزیں مابعد جدیدیت میں سما سکتی ہیں۔

آج کے فنکار کو نہ مابعد جدیدیت کے فکری مخاطبے سے مطلب ہے اور نہ اس سے مکمل آگاہی ہے وہ اس پراسرار مابعد جدید تھیوری کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔انھیں نہ جشن جاریہ کی خبر ہے نہ مہابیانیہ کی اور نہ ہی تکثیریت کی وہ نہ دریدا کو جانتے ہیں اور نہ اہاب حسن کو۔

اب آیئے! مابعد جدیدیت کے اصل دعوے کی طرف آتے ہیں۔اس کے مطابق روایت اور حقیقت کوئی ابدی شئے نہیں ہے اس لیے اسے ماننا ضروری نہیں۔اس کے مطابق کل وجود بیان عبث ہے۔ جس کو ہم حقیقت کہتے ہیں وہ محض ایک خیال ہے جس میں وجودی اصطلاح رائج ہے۔Concept اور Narrative تصدیق اور معروضیت سے عاری ہوتا ہے۔لہٰذا اس میں اقراء کرنے یا معلومات حاصل کرنے پر اصرار کرنا بے معنی ہے۔ان کے مطابق Narrative سماج میں اتنی وسعت ہونی چاہئے کہ کسی اعتراض یا قیل وقال کی گنجائش باقی نہ رہے......۔

مندرجہ بالا تھیوری کے عمق میں جانے سے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تھیوری نہ صرف یہ کہ حد درجہ الجھی ہوئی ہے بلکہ اس کے بطن سے کچھ ایسے منفی پہلوؤں کا ظہور ہوتا ہے جسے عمل میں لانا بہت مشکل ہے اور جہاں تک اردو ادب میں اس کے اطلاق اور استعمال کی بات ہے تو اس کا انجام ہم دیکھ چکے ہیں۔

**Dr. Nasim Ahmad Nasim**
Moh. - Kalibagh
Near - Meer Shikar Toli Masjid
Bettiah - 845 438
Mob. - 70115 48240





ڈاکٹر وصی احمد شمشاد

# محی الدین قادری زور کی لسانی خدمات

محی الدین قادری زور(۱۹۶۲ء۔ ۱۹۰۴ء) کی شخصیت جہات کثیر رکھتی ہے۔انہوں نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اپنا زور قلم آزمایا ہے۔انہوں نے شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے،انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں ۔ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام ہوئے تھے۔(۱) سیر گولکنڈہ،(۲) گولکنڈہ کے ہیرے،(۳) اور طلسم تقدیر۔انہوں نے میدان تنقید میں بھی شعور تنقید کا مظاہرہ کیا ہے اور پانچ تنقیدی تصانیف شائع کی ہیں۔(۱) روح تنقید ،(۲) تنقیدی مقالات،(۳) تین شاعر،(۴) روح غالب،(۵) ادبی تاثرات۔انہوں نے پانچ سوانح کی یادگار تصانیف شائع کئے ہیں (۱) حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ،(۲) میر محمد مومن،(۳) سرگذشت غالب،(۴) گارساں دتاسی۔اس کے علاوہ تحقیقی کتابیں تذکرہ گلزار ابراہیم، دیوان زادۂ حاتم، مرقع سخن (دو جلدوں) متاع سخن، بادۂ سخن، فیض سخن، رمز سخن، مکتوبات شاد عظیم آبادی، شاد اقبال، قصص خوب ترنگ (بزبان فرانسیسی) ارشاد نامہ، ابراہیم نامہ کلیات محمد قلی قطب شاہ، وغیرہ بھی اردو ادب کو دئے ہیں۔زور کا سب سے اہم تاریخی ادب کا کارنامہ اردو شہ پارے، اردو کے اسالیب بیان، عہد عثمانی میں اردو کی ترقی اور داستانِ ادب حیدرآباد ہیں۔لیکن موصوف کی شہرت و مقبولیت جن کارناموں کی وجہ سے اردو ادب میں ہے وہ ان کی لسانیات کی کتابیں ہیں۔ان کی شہرۂ آفاق تصنیف لسانیات سے متعلق ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی زبان میں ہندوستانی صوتیات پر ایک کتاب لکھی تھی۔

محی الدین قادری زور کی شہرت و مقبولیت ان کی شاہکار تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کی بدولت ہے۔ان کا یہ گراں قدر کارنامہ نہایت عمدہ ہے۔اور ماہرین لسانیات میں اس تصنیف کو قدر و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اس کتاب میں موصوف نے دو حصے قائم کئے ہیں۔پہلے حصہ میں آٹھ عنوان قائم کئے ہیں اور اس کے متعلق پوری جانکاری فراہم کرانے کی کوشش کی ہے۔دوسرے حصے میں پانچ عنوان قائم کئے ہیں اور زبان کے متعلق مواد اور، نظریے سے بحث کی ہے۔اس کے بعد ہندوستانی زبان کی ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔اس کے بعد ادبی بولیوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔اخیر میں ہندی اور اردو کے اختلاف سے بحث کی گئی ہے۔

اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق ماہرین لسانیات میں شدید اختلافات ہیں ۔ ماہرین لسانیات اس سلسلے میں تین گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں ۔ایک گروہ اردو زبان کی پیدائش کا علاقہ سندھ کو قرار دیتے ہیں ۔اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کا نام لیا جاتا ہے۔لیکن موصوف اس سلسلے میں تاریخی یا لسانی شواہد پیش نہیں کر پاتے ہیں ۔اس طرح ان کا دعویٰ صرف زبانی ہی رہ جاتا ہے۔بغیر ثبوت کے کسی بات کا دعویٰ کتنا دیر تک قائم رہ سکتا ہے۔اس لئے ان کے دعووں کو دوسرے ماہرین نے سرے سے خارج کردیا۔دوسرا گروہ حافظ محمود شیرانی کا نظر آتا ہے۔انہوں نے اردو کی پیدائش کا علاقہ پنجاب کو قرار دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کے تاریخی اور لسانی شواہد بہت مضبوط نہیں نظر آتے ہیں ۔ ان کے دعووں میں کئی کمزوریاں ابھر کر سامنے آتی ہیں ۔جس سے ان کے دعووں کی نوعیت مشکوک ہوجاتی ہے۔ان کے گروہ میں ماہر لسانیات ڈاکٹر گراہم بیلی بھی نظر آتے ہیں ۔لیکن چند برسوں کے اندر ہی دیگر ماہرین لسانیات نے ان کے دعوؤں کو خارج کردیا اور ایک تیسرا گروہ وجود میں آتا ہے۔اس گروہ کا دعویٰ ہے کہ اردو مغربی ہندی کی ایک بولی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔اس گروہ والوں نے بھی جو دعوے کئے ہیں ۔ اس کے متعلق قابلِ اعتبار لسانی اور تواریخی شواہد پیش کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں ۔محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' میں دنیا کی تمام زبانوں کو آٹھ حصے میں منقسم کیا ہے(۱) ہند آریائی (۲) ارمنی (۳) بلقان سلانی (۴) البانوی (۵) ہیلینی (۶) اٹالوی (۷) کیلٹک (۸) ٹیوٹونی ۔

ہند آریائی خاندان سے ہماری اردو زبان نکلی ہے۔اس کے علاوہ دیگر خاندان کا تعلق ایشیا کے باہر کی زبانوں سے ہے۔ ہند آریائی خاندان کی تین شاخیں اہم ہیں (۱) ایرانی (۲) پشاچہ (۳) ہند آریائی ۔ اس کے بعد موصوف نے ہند آریائی زبان کو تین حصے میں منقسم کیا ہے ۔(۱) قدیم ہند آریائی (۲) درمیانی ہند آریائی ((۳) جدید ہند آریائی ۔اس طرح محی الدین قادری زور نے اردو کی پیدائش کے متعلق تمام ماہرین لسانیات کا جائزہ لیا ہے۔اور ان کی رایوں کو شواہد اور دلائل کی بنیاد پر پرکھا ہے۔اس جانچ پرکھ میں ردو قبول کے مرحلے سے گزرنے کے بعد جو وضاحت کی ہے۔اس تعلق سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''گریرسن اور ان کے متبعین کا یہ نظریہ زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتا۔انہوں نے جس مواد سے کام لیا ہے۔ وہ نسبتاً بعد کا ہے اور ثابت نہیں کرسکتا کہ اندرونی اور بیرونی دائرہ کی زبانیں دو جدا جدا نسلیں اور گروہوں کی پیداور ہیں ۔ان میں کوئی ایسی خاص خاص خصوصیتیں تو نہیں ہیں جن کی بنا پر یہ رائے تسلیم کی جاسکتی ہے اور چونکہ ہمارے موجودہ موضوع سے اس کا کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔اس لئے ہم اس مسئلہ پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہئے۔ ہماری





نظر میں بھی دیبر اور چٹرجی کا یہ خیال درست ہے کہ موجودہ ہند آریائی زبانوں کو ان کی لسانی اور ترکیبی خصوصیتوں کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ شاخوں میں تقسیم کرنا چاہئے ۔(۱) شمالی مغربی (۲) جنوب مغربی (۳) وسطی (۴) مشرقی (۵) جنوبی ۔''

(ہندوستانی لسانیات: محی الدین قادری زور۔ص ٦٦)

اسی بنیاد پر محی الدین قادری زور نے جدید ہند آریائی زبانوں کو بھی پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے اور پانچوں گروہوں کی مختلف زبانوں کے نام گنوائے ہیں ۔ جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں ۔ پھر انہوں نے ہند کی غیر آریائی زبانوں کو چار حصے میں منقسم کیا ہے یہ زبانیں ہندوستان کے بالکل شمال میں اور شمال مغرب کے سرحدی مقبوضات میں بولی جاتی تھیں ۔اس طرح ہند ایرانی زبانوں کو تین حصے میں تقسیم کیا ہے۔اس طرح تمام زبانوں کے خاندان کا ذکر کرنے کے بعد ان زبانوں سے متعلق مختلف نظریات کی بھی وضاحت کی ہے اور اس سلسلے میں اردو کا تعلق کھڑی بولی اور پنجابی زبان کے اشتراک سے وجود میں آنے کی دلالت کی ہے۔اس سلسلے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یقین ہے کہ یہ فرق مسلمانوں کے قبضۂ دہلی کے بعد سے شروع ہوا۔ ابتداء میں وہ صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا۔ مگر آخر کار ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسا خلیج حائل ہوتا گیا کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے ۔ بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کے مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے ۔لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں سے دہلی اور آگرہ رہے ہیں ۔اس لئے اردو زیادہ کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی ۔''

(ہندوستانی لسانیات: محی الدین قادری زور،ص ٩٨)

محی الدین قادری زور نے اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں پنجابی اور کھڑی بولی کی آمیزش کو اردو کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔لیکن اس آمیزش میں کھڑی بولی کا حصہ زیادہ ہے۔ موصوف نے اس کے بعد اردو زبان پر دیگر زبانوں جیسے بانگر، ہریانی زبان کے اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ اردو زبان دکن میں اور گجرات میں بھی پلی اور ترقی پائی ہے۔اس لئے برج بھاشا کھڑی بولی ، ہریانی

،بانگر، دکنی وغیرہ جگہوں کے اثرات اس زبان میں واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ جب یہ زبان شمال میں گئی تو اس پر فارسی کے اثرات بھی نمایاں نظر آنے لگے اور اسی وجہ سے اختلاف اور زیادہ بڑھ گئے۔ اسطرح شمال کی ہندوستانی زبان نے اردو کو کافی متاثر کیا ہے۔

محی الدین قادری زور نے اردو کی پیدائش اور اس کے خاندان کے متعلق جو جانکاری فراہم کرائی ہے وہ کئی اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ اردو زبان پر مختلف زبانوں کے اثرات واضح نظر آتے ہیں لیکن قطعیت کے ساتھ یہ کہنا کہ اردو کی پیدائش کس زبان سے ہوئی نہایت مشکل امر ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کرنا کہ اس کا علاقہ کون سا ہے۔ جہاں اس کی پیدائش اور پرورش و پرداخت ہوئی اور بھی مشکل امر ہے۔ اس سلسلے میں مسعود حسین خان کا خیال سب سے زیادہ سائنٹفک ہے اور مدلل ہے۔ انہوں نے اردو کی پیدائش کا علاقہ جو بتایا ہے وہ دہلی اور اس کے گردونواح دوآبہ گنگ کا علاقہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اردو کی پیدائش کے سلسلے میں ابھی تک سب سے معتبر رائے مسعود حسین خان کی ہے۔ جس کی تردید ابھی تک کسی نے نہیں کی ہے۔ پھر بھی محی الدین قادری زور کی لسانی خدمات قابلِ احترام ہے اور انہیں کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

**Dr. Wasi Ahmad Shamshad**
Guest Faculty
University Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga- 846 004
Mob. - 99346 39512

ISSN : 2582 - 3612



ڈاکٹر احتشام عالم

# قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری ''آگ کا دریا'' کی روشنی میں

قرۃ العین حیدر(۱۹۲۷ء۔ ۲۰۰۷ء) کی شخصیت اردو ادب میں کثیر جہات رکھتی ہے۔ انہوں نے افسانے، ناول، سفرنامہ، مضامین، تراجم اور ناولٹ وغیرہ لکھے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت و مقبولیت افسانوں اور ناولوں کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے سات ناول ،میرے بھی صنم خانے (۱۹۴۸ء)، سفینہ غم دل، (۱۹۵۲ء)، آگ کا دریا (۱۹۵۹ء)، آخرشب کے ہم سفر (۱۹۷۹ء)، گردشِ رنگ چمن (۱۹۸۸ء)، چاندنی بیگم (۱۹۹۰ء) اور ''کارجہاں دراز ہے'' (دو حصوں میں) ۱۹۷۷ء،۱۹۷۹ء لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ناولٹ ''دلربا'' ''سیتاہرن'' چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو، ہاوزنگ سوسائٹی اور فصل گل آئی یا اجل آئی بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ جن کے نام ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار اور جگنوؤں کی دنیا ہیں۔ انہیں متعدد انعامات و اعزازات سے بھی نوازہ گیا تھا۔ انہیں افسانوی مجموعہ ''پتھر کی آواز'' کے لئے ۱۹۶۷ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں انہیں ان کے تراجم کے لئے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ ۱۹۸۴ء میں ہندوستانی حکومت کی طرف سے انہیں ''پدم شری'' کا قومی اعزاز دیا گیا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا انعام ''گیان پیٹھ'' ایوارڈ انہیں ۱۹۸۹ء میں دیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی دیگر انعامات سے بھی انہیں سرفراز کیا گیا۔

انہیں ناول نگاری میں جو شہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ دیگر اصناف میں نہیں ہے۔ لیکن افسانہ نگاری میں بھی انہیں بلند و معتبر مقام حاصل ہے۔ قرۃ العین حیدر کا شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' ہے۔ اس ناول میں انہوں نے ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو ایک ناول میں سمیٹ لیا ہے۔ جو نہایت ہی مشکل کام ہے۔ اس ناول میں انہوں نے جو تکنیک استعمال کی ہے وہ نہایت اہم ہے اس ناول کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ اس ناول کو چار ادوار میں منقسم کیا گیا ہے۔ اس ناول میں تہذیب و ثقافت کے ارتقاء کا ایک احساس بروئے کار آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں غیر منقسم ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو ابھاڑا ہے۔ پھر ملک کے تقسیم کا عمل سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم ملک نے تمام انسانی، تہذیبی ، مذہبی اور معاشری اقدار و معیار کو وقت کے دریا میں موجوں کے حوالے کر دیا ہے۔ مصنفہ نے ''آگ کا دریا'' میں گم ہوئے قبیلوں، بستیوں کو تلاشنے کی حوصلہ مندکوشش کی ہے۔ ''آگ کا دریا'' کے متعلق اسلوب

احمد انصاری کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''ناول کا موضوع وقت کا دھارا ہے۔ جو انسان کی ارضی زندگی کی وسعتوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ انسان نے اب تک ارتقاء کی جتنی منزلیں طے کی ہیں۔ان میں سے چند روشن نقطوں کو ناول نگار نے چن لیا۔اس مدت میں انسان نے خدا اور کائنات کے متعلق جس طرح سوچا ہے۔خود اور عمر خود اور ہم آہنگی کی جستجو کی ہے۔تہذیبوں اور سلطنتوں نے جس طرح جھنڈے گاڑے ہیں، انسانی رشتوں میں محبت اور نفرت، ایثار اور خود پسندی اور عقل و عشق کی آویزش نے جو پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ تجربے میں جو کرب اور تلخی چھپی ہوئی ہے اور اس سے مجموعی طور پر شخصیت کی نشوونما پر جو اثر پڑتا ہے۔ مجرد فلسفہ، مجرد تاریخ سے کہیں زیادہ ہی سب کچھ اس ناول کا موضوع ہے۔''

اس ناول کا موضوع وقت ہے یا تہذیب ہے یا انسان ہے یا تینوں ہے۔اس کے پیش کرنے کی تکنیک شعور کی رو ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے ناول کے کردار کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا ہے۔شعور کی سطح پر جو خیالات ابھرتے ہیں۔انہیں ناول نگار بیان کرتا ہے۔ناول ''آگ کا دریا'' کے ایک اقتباس سے شعور کی رو کی تکنیک کی مثال کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔جس میں غیر منقسم ہندوستان کا گوتم نیلمبر لیٹا ہوا حیات وکائنات کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ملاحظہ فرمائیں :

''وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سرک کر بیٹھ گیا۔ تھکے ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے سوچا جیسے وہ زمان ومکان سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اوپر اٹھتا ہے۔ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی، ابدی انسان ..........تھکا ہوا، شکست خوردہ ، بشاش، پر امید، رنجیدہ انسان.........جو خدا میں ہے اور خدا سے الگ ہے۔کائنات کا اولین ذی ہوش جسے یہ ساری چاندنی، سارے پھول، ساری ندیاں، سارا حسن دیا گیا ہے۔اولین روشنی کا زمانہ اور برہما کا محل سنسان پڑا ہوا ہے۔اس میں محض نور ہے، نور کی دنیا سے ایک ہستی آن گری ہے۔جو پرش ہے اور اکیلا ہے۔''

(آگ کا دریا)

ناول نگار نے اس شعور کی رو سے تمام کردار کے کیفیات دل کو بحسن و بخوبی پیش کیا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612



دراصل خود کلامی کو برتنے والے کردار میں داخلی افکار کی آمیزش کر دی جاتی ہے۔اس طرح کردار اپنے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو آشکار کر جاتا ہے۔لیکن یہ خود کلامی سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔اس طرح ناول ''آگ کا دریا'' معاشرے کے زوال کے تجربے کو نسبتاً وسیع تر تناظر میں پیش کرنے کی کامیاب سعی ہے۔اس ناول میں زوال اور انتشار کو وقت کی تخریب کاری کے دیگر مظاہر کے پہلو بہ پہلو دکھایا گیا ہے۔شعور کی رو میں ماضی اور حال کی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور صدیاں لمحوں میں سمٹ آتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں یہی مرحلہ پیش آتا ہے۔اور لگ بھگ تین ہزار سال کی کہانی کو ایک ناول میں سمیٹ لیا گیا ہے۔شعور کی رو کے متعلق ڈاکٹر شاہد جمیل نے اردو میں اس کے آغاز و ارتقاء اور اس کے مفہوم کے تعلق سے جو گفتگو کی ہے۔ملاحظہ فرمائیں :

''مغربی ادب کے زیر اثر فکشن نگاروں میں شعور کی رو کی تکنیک میں ناول لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ ''شعور کی رو'' دراصل نفسیات کی اصطلاح ہے۔ جس کو وضع کرنے کا سہرا ولیم جیمس (کذا) کے سر ہے۔اس نظریے کی رو سے ماضی اور حال میں کوئی حد فاصل نہیں رہ گئی اور وقت ماضی حال اور مستقبل کے دائروں سے مستقل طور پر منقسم نہیں رہتا۔اب برسوں کے واقعات، تاثرات اور یادداشتیں لمحوں میں سمٹ آئے ہیں۔شعوری رو والے ناولوں میں ناول نگار قاری کو براہِ راست کرداروں کے ذہنی تجربات کی طرف متوجہ کر کے خود درمیان سے ہٹ جاتا ہے۔البتہ قاری کو بجلی کی چمک کی طرح کبھی کبھی ناول نگار کے وجود کا احساس ہوتا ہے............اردو میں شعور کی رو کی تکنیک میں ناول لکھنے کی ابتدا سجاد ظہیر کے ناولٹ کے بعد اس تکنیک کو قرۃ العین حیدر نے وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔''

(مقالہ مطبوعہ علم وادب، لکھمنیاں جولائی تا ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۳)

حالانکہ اس تکنیک کا استعمال پہلے بھی دیگر تخلیقات میں نقوش کی حد تک کہیں کہیں ہوا تھا۔لیکن اس کا باضابطہ آغاز سجاد ظہیر کے ناول ''لندن کی ایک رات'' سے ہوا ہے۔اس تکنیک کا بھرپور استعمال قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں ہوا ہے۔اس ناول کی شہرت ومقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ ''آگ کا دریا'' کے اہم کردار گوتم، چمپا اور کمال ہیں جو ہر دور میں یہ کردار نظر آتے ہیں۔انہیں کرداروں کے ذریعہ ایک عہد سے دوسرے عہد کا سفر طے کیا جاتا ہے۔جو بغیر کسی Gap کے تسلسل کے ساتھ جاری وساری رہتا ہے۔اس طرح وقت کا تسلسل کبھی بھی ٹوٹتا نظر نہیں آتا ہے۔مصنفہ نے ایک کہانی کو ختم کر کے دوسری

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کہانی شروع کی ہے لیکن ایک کردار کے سفر کا اختتام دوسرے کردار کے سفر نامے کی تمہید بن جاتا ہے۔ اس طرح چاروں ادوار میں ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ جو پلاٹ کے گٹھا ہوا ہونے کی دلیل ہے۔ اس عمل میں مصنفہ کامیاب و کامران نظر آتی ہیں۔ اس ناول کا جائزہ لیتے ہوئے شہاب ظفر اعظمی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''چار مختلف ادوار کی کہانی جو چندر گپت کے عہد سے شروع ہو کر تقسیم کے المیہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس تاریخ سے، عبارت سے جس میں ایک طرف راجوں مہاراجوں کی جنگیں، بادشاہ اور سلطانوں کی فوج کشی، ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشیں، سراج الدولہ اور واجد علی شاہ جیسے حکمراں ہیں اور دوسری طرف ویدِک فلسفہ، بدھ مت بھگتی اور اسلام کی رنگا رنگی سے ابھرتی ہوئی وہ تہذیب جو مشترک ہے۔ یہ وقت کے دریا کی اس بے رحم حقیقت کا سفاکانہ سیل ہے۔ جس کی زد میں آ کر ہر شئے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ پاٹلی پتر، شراوستی، دلی، جونپور، بنگال اور اودھ سب کو غرقاب کرتا ہوا یہ وقت کا دریا وہاں پر ٹھہر سا جاتا ہے۔ جہاں ہندوستان گنگا اور راوی کے پانیوں میں تقسیم ہو کر دو نظریوں اور دو قوموں میں بٹ کر جدا ہو جاتا ہے اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ یہ سب سے زیادہ ان انسانوں کی بھینٹ لیتا ہے جن میں گوتم نیلمبر، ابوالمنصو رکمال الدین ہری شنکر اور کمال کی آرزوئیں اور خواب ہوتے ہیں۔ چمپک چمپا، طلعت، نرملا، اور چمپا احمد کسی کے لئے اس کی لہریں مہربان نہیں۔ یہ سب کو ایک حقیر تنکے کی طرح اپنی موجوں میں اچھالتا، پھینکتا کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔''
>
> (اردو ناول کے اسالیب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ص ۱۹۲۔۱۹۳)

ناول ''آگ کا دریا'' میں ہندوستان کے مختلف ادوار کی تہذیبی و ثقافتی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو تاریخی اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ مختلف ادوار میں ابن انسان کا بھی گہرا مطالعہ اور مشاہدہ ہے اور اس سے متعلق سماجی رویوں کی بھی ایک حسین اور حقیقی تصویر بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس میں تخیرات کا فلسفہ بھی ہے جو تمام ذی روح اور نباتات شجر و حجر سے متعلق ہے۔ اس میں ایک طرف تصوف کے نظریات بھی واضح ہوئے ہیں۔ تو دوسری طرف سیاسی نظریات کے مثبت اور منفی پہلو بھی آشکار ہوئے ہیں۔ اس طرح تمام چیزیں وقت کی حرکت کے سفر میں سمٹ آئی ہیں۔





اس ناول کا اسلوب بیان بھی نہایت اعلیٰ اور بلیغ ہے۔ مصنفہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ زبان سادہ اور شائستہ ہے۔ اسلوب میں ایک روانی ہے۔ انہوں نے اظہار و بیان کے بہترین تجربے کئے ہیں۔ ان کی زبان میں انگریزی ہندی اور کہیں کہیں اودھی زبان کے بھی نمونے برجستہ اور برمحل استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کی زبان اور اسلوب اپنی الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔ انہوں نے ناول کے ایک ایک واقعہ کو اس کے تمام جزیات کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ موقع اور محل کی واقعاتی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جو ان کے مشاہدے کی صحت، تخیل کی ایمائی قوت ان کی باریک بینی اور بیان کی سحر کاری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ناول ''آگ کا دریا'' ہندوستان کے انسانوں کی کہانی ہے۔ جو اس ملک کی تہذیب و ثقافت کے شیرازہ بکھرنے پر خون کے آنسوں بہا رہے ہیں۔ یہ اپنی قدروں کے امین ہیں۔ انہیں اپنی زندگی سے زیادہ دوسروں کی زندگی عزیز ہے۔ ان کا اخلاقی معیار نہایت بلند ہے اس ناول میں ہندوستان کی تقسیم کا المیہ بھی نہایت توازن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یوں تو مصنفہ نے کئی ناول ملک تقسیم کے تعلق سے لکھے ہیں اور تمام ناولوں میں اس المیہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن آگ کا دریا میں اس واقعہ کا بیان نہایت سلیقے سے ہوا ہے اور اس میں ایک سنجیدگی اور متانت کا پرتو نظر آتا ہے۔ ان کی فنکارانہ بصیرت کی یہ روشن دلیل ہے۔ انہوں نے اس واقعہ کے منظر اور پس منظر اور درمیانی منظر کو نہایت سلیقہ کے ساتھ اپنے ناول میں سمو دیا ہے۔ جو احساسات و جذبات کی بہترین عکاسی پیش کرتی ہے۔

المختصر یہ کہ قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ اسی بنیاد پر انہیں اردو کے صف اول کے ناول نگاروں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے ناول اسلوب بیان کے اعتبار سے اعلیٰ معیار قائم کرتے ہیں۔ ان کی ناول نگاری کسی بھی ناول نگار سے کم تر نہیں ہے۔ اور اردو ادب کے ناولوں کی بھیڑ میں ایک منفرد و ممتاز حیثیت کی حامل نظر آتی ہے۔

**Dr. Ehtesham Alam**
Guest Faculty
Deptt. of Urdu
B. N. M. V. College
Sahugadh, Madhepura 852 113
Mob. - 93080 22524

ڈاکٹر مبارک حسین

# ناوکؔ حمزہ پوری بحیثیت رباعی نگار اور تاریخ گو

ناوکؔ حمزہ پوری کا نام اردو شعر و نثر کے حوالے سے قابلِ احترام بھی ہے اور مشہور و معروف بھی ہے۔ انہوں نے اصناف شعری کی بیشتر صنفوں میں بحسن وخوبی طبع آزمائی کی ہے ان کی کئی درجن کتابیں۔ منظر عام بھی ہو چکی ہیں۔ جیسے جذبات ناوک ۱۹۵۶ء، چڑیا خانہ ۱۹۶۹ء، گل دستہ ۱۹۶۹ء، انتشار غزل ۱۹۸۹ء، ترسیل سخن ۱۹۹۰ء، پلاٹینم جوبلی مثنوی ۱۹۹۲ء، انداز بیان (رباعی) ۱۹۹۲ء، سوغات (دوہوں کا مجموعہ) ۱۹۹۲ء، شرار سخن (رباعیات) ۱۹۹۳ء، نوائے امروز (رباعیات) ۱۹۹۶ء، تقطیر سخن (نظموں کا مجموعہ) ۲۰۰۸ء، مصحف تاریخ (قطعات تاریخ) ۲۰۰۸ء، فانوس (غزلیات) ۲۰۱۰ء، وغیرہ مجموعہ کلام ان کے قادر الکلامی اور زودگوئی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعری نگارشات میں غزل، نظم رباعی اور قطعات تاریخ وغیرہ میں موصوف نے اپنا اختصاص قائم کیا ہے۔

ناوکؔ حمزہ پوری نے نثری ادب کی بیشتر صنفوں میں اپنی جولان طبع کا مظاہر کیا ہے اور کئی درجن کتابیں اردو ادب کو دی ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیق وتنقید، انشائیے، افسانے، مکتوبات، خاکے، لغات، سفر نامہ، ترجمہ نگاری، اور دینیات سے متعلق بھی کئی فتوحات ان کے نامِ نامی سے منسوب ہیں۔ شعری اور نثری نگارشات کی تعداد ایک سو پچیس کے قریب ہو چکی ہے۔ جو ایک انجمن کے مترادف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شعری ونثری تخلیقات سلسلے میں ظہیر غازی پوری کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''ان (ناوک حمزہ پوری) کی ذاتی شخصیت اور فنی شخصیت دونوں پہلودار اور ہمہ جہت ہیں۔ وہ بہت اچھے مخلص، منکسر المزاج اور دین دار انسان ہیں اور بے حد حساس، ذہین، خوش فہم، زیرک اور عصر آگاہ فنکار ہیں۔ زندگی کے گوناگوں تجربات اور وسیع تر مطالعات نے ان کے فن کو جلا بخشی ہے۔ تقریباً ۲۵/ برس قبل انہوں نے مفتیان ادب میں بحیثیت شاعر، عروض داں اور پختہ مشق نثر نگار اپنی شناخت قائم کر لی تھی۔.........اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ وہ متعدد اصناف شعر پر استادانہ مہارت رکھنے والے، شاعر، نکتہ رس نقاد، انتہائی کامیاب انشائیہ نگار، خوش نظر محقق، مشاق مترجم اچھے افسانہ نگار، مقبول عام معلم اور بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے ماہر فن ہیں۔ ان کا ہر آرٹ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔''

ISSN : 2582 - 3612



(زبان خلق: مضمون نگار، ظہیر غازی پوری، ص ۶۲)

ناوکؔ حمزہ پوری کی شخصیت کا سب سے تابناک پہلو ان کی شاعری خصوصاً رباعی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ تعداد کے اعتبار سے سید علی غمگین دہلوی اور احمد علی خاں عصر حیدرآبادی کے بعد موصوف نے ہی اس قدر رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ جس میں گیارہ سو چار رباعیاں ہیں جو ردیف کی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اسے ہم ان کی رباعیوں کا دیوان کہہ سکتے ہیں۔ ان رباعیوں میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور قادر الکلامی کا مظہر بھی ہے۔ ان کی رباعیاں اس فن کی تمام بلند و بالا مثالیں پیش کرتی ہیں۔ زبان و بیان اس قدر سلیس وسادہ ہے کہ یہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان رباعیوں میں مذہب، اخلاق، دنیا، اور عصر حاضر کے تمام موضوعات سمٹ آئے ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ موصوف کے چند رباعیاں بطور نمونہ پیش کر دی جائیں تا کہ ان رباعیوں کی جملہ خصوصیات بروئے کار آجائیں ملاحظہ فرمائیں ؎

اِک قطرہ بھی تجھ کو نہ سمندر دے گا
رسوا تجھے یہ دست طلب کر دے گا
مانگے گا زمانہ سے اگر چادر گل
ناوکؔ وہ تجھے کانٹوں کا بستر دے گا

ہر چند چراغِ سحری ہے دنیا
گھر شر کا ہے فتنوں سے بھری ہے دنیا
جو طالب دنیا ہے وہ نابینا ہے
برسات کے اندھوں کو ہری ہے دنیا

شکوہ ہے کہ اولاد ہوئی ہے خود سر
ماں کا ہے لحاظ نہ ہے پاس پدر
اولاد کی ہے اس میں خطا کیا ناوکؔ
پیدا ہوئی ٹیوب سے پہلی بوتل پر

احساس کو لفظوں میں پرونے کا فن
قطرے کا در خوش آب ہونے کا فن
کہتے ہیں رباعی جِسے وہ ہے ناوکؔ
کوزے کو سمندر میں سمونے کا فن

بیداریٔ احساس ہے الجھن میری
حلقے میں مصائب کے ہے گردن میری
ٹھہرائیں کسے موردِ الزام کہ خود
ہے فطرت حساس ہی دشمن میری

شاعر شاعر ہے ہو جو اہلِ ایماں
مسعود و مبارک ہے جو ہو صدق بیاں
ورنہ بکواس ہے کلامِ شاعر
دیوانہ ہوا ہے بک رہا ہے ہذیاں

گونگے الفاظ کو نوا دیتا ہے
تخیل کو تصویر بنا دیتا ہے
کر دیتا ہے خفتگاں کو شاعر بیدار
مردوں کو بھی قُم کہہ کے جلا دیتا ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ناوکؔ حمزہ پوری کی رباعیاں انہیں ایک عظیم رباعی نگار شاعر ہونے کی دلالت کرتی ہیں۔ان کی رباعیاں موضوعاتی اعتبار سے بوقلمونی ورنگارنگ کی مظہر ہیں۔ان کی فکر نہایت بلند و بالا ہے۔وہ اپنی رباعیوں میں مذہبی افکار و نظریات کو مرکزی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔تمام مسائل واقعات وحادثات کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔اسی لئے ان کی رباعیوں میں بیشتر حصہ مذہبی رباعیوں کا ہے۔اخلاقی نوعیت کی رباعیاں بھی مذہب اسلام کے اخلاقی معیار کی مترشح نظر آتی ہیں۔شرعی عقائد اور تصوف کے موضوعات پر بھی اچھی تعداد میں رباعیاں ہیں۔اس کے علاوہ حمد و نعت کے موضوعات پر بھی کافی تعداد میں رباعیاں ہیں۔پند و نصیحت اور ناپائداریٔ زمانہ کے موضوع پر بھی بہترین رباعیاں ہیں۔تمام موضوعات پر رباعیاں پیش کی جاسکتی ہیں۔لیکن مقالے کی طوالت پیش نظر ہے۔اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم حمد و نعت کے تعلق سے ایک ایک رباعی پیش کردی جائے۔

الفاظ ہیں مشک زار تعریف خدا　　اشعار ہیں عطر بار توصیف خدا
ہر صفحہ ہے تفصیل خدا کی قندیل　　ہے ہر ورق آبشار تشریف خدا

ہے ذکر بلند آپؐ کا اونچا ہے نام　　اے ختم رُسل، ہادیٔ دین اسلام
ہر چند بشر بقول قرآں ہیں آپ　　کیا عقل بشر سمجھے محمدؐ کا مقام

ناوکؔ حمزہ پوری کی رباعیوں میں طنز و مزاح کے موضوعات بھی رقم ہوئے ہیں۔لیکن ان کے طنز و مزاح میں تفریح و تفنن کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ معاشرے کی برائیوں کو دور کرنا اور کمیوں سے آگاہ کرنا اصل مقصود ہے۔موصوف کا مقصد اصلاح قوم، اصلاح معاشرہ ہے۔اس سلسلے کی دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

بیدای احساس بڑی نعمت ہے　　اِک آس اِک الاس بڑی نعمت ہے
مجھ پر صحیفہ نہیں اترا تو کیا　　یہ صفحہ قرطاس بڑی نعت ہے

کوڑے کی طرح ٹرک میں ڈھوئے گئے ہم　　بستی کے پوکھرے میں ڈبوئے گئے ہم
مر کر بھی افادیت ہماری نہ گئی　　گو کہ کھیتوں میں بوئے گئے ہم

ناوک حمزہ پوری کی رباعیاں زبان و بیان اور پیش کش کے اعتبار سے انوکھی شان رکھتی ہیں۔ان کی رباعیاں فنی اعتبار سے ایک پختہ کار کی خوبیاں رکھتی ہیں۔ چونکہ رباعی ایک مشکل فن ہے۔اس لئے بیشتر شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی سے گریز کیا ہے۔صرف مخصوص شاعروں نے عمر کے آخری حصے میں جب انہیں اپنے فن میں کمال حاصل ہوجاتا ہے۔تب جا کر کہیں اس صنف کی طرف متوجہ مرکوز کی ہے۔جس سے اس فن کی مشکل مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کے باوجود بہت کم شاعر اس میدان میں کامیاب نظر آتے ہیں۔لیکن ناوکؔ حمزہ پوری اس صنف میں کامیاب و کامران ہی نہیں بلکہ اپنی استادی کا بھی دعویٰ پیش کرتے ہیں۔انہوں نے





اس فن میں اپنی برتری ثابت کی ہے۔ان کی رباعیوں میں سماجی، سیاسی اور عصری تمام مسائل و معاملات رقم ہوئے ہیں۔اس فن میں وہ نہایت چابکدستی سے کام لیتے ہیں۔اور اپنا امتیاز و انفراد بھی قائم کرتے ہیں۔

ناوکؔ حمزہ پوری نے اپنی رباعیوں میں تاریخی رباعیاں بھی کہی ہیں۔اس سلسلے میں واضح رہے کہ رباعی کی مشکل مزاجی کا ذکر سطور بالا میں ہوچکا ہے۔لیکن تاریخ گوئی اس سے زیادہ مشکل فن ہے۔اس فن میں مصرعوں شعروں کے ذریعہ کسی شادی، موت، پیدائش، حج، تخت نشینی، عہدہ حاصل ہونے، بچے کی پیدائش، مسجد کی تعمیر وغیرہ واقعات وحادثات کو تاریخ کے حوالے سے ان کے اعداد محسوب کئے جاتے ہیں۔جو مطلوبہ تاریخ واقعات سے متعلق جانکاری فراہم کرتی ہے۔اس مشکل فن کو موصوف نے رباعیوں میں سمیٹ لیا ہے جو اپنے آپ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے۔دو مشکل فن کا امتزاج اور ان کی باریکیوں سے عہدہ برآ ہونا صرف ناوک حمزہ پوری کا ہی کام ہے۔اس سلسلے میں تاریخ تعمیر مسجد ابراہیم پلاول ہزاری باغ ملاحظہ فرمائیں۔

اہل سنت کی کوشش تنظیمی　　کام آئی کہ ہونہ شمع دینی دھیمی
تعمیر کی تاریخ ناوکؔ نے　　تدوین خدا خانہ براہیمی

۲۰۰۰ء

جناب اختر ادیبی مراد آباد کے مجموعہ رباعیات ''گل برگ'' کی اشاعت کی تاریخ۔

ہے روح فزا بوئے نسیم ''گل برگ''　　جاں بخش ہیں افکار سلیم ''گل برگ''
اعجاز کلام اختر ادیبی دیکھو　　عطر افشاں خوب ہے شمیم ''گل برگ''

۱۹۹۶ء

اس طرح کی تاریخی رباعیاں بھی بڑی تعداد میں موصوف کی کتابوں میں موجود ہیں۔جن سے موصوف کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔خصوصاً انہیں فن رباعی میں ایک خاص مقام و مرتبہ کا حامل بناتا ہے۔ جس سے کوئی بھی ناقد انکار نہیں کرسکتا۔ناوک حمزہ پوری بحیثیت رباعی نگار اپنا مقام و مرتبہ اردو ادب میں قائم کر چکے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام شاعرانہ نگارشات پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جائے اور ادب میں انہیں ان کا مقام و مرتبہ حاصل کرایا جائے۔جو ہمارا اور محبان اردو کا اہم فریضہ بھی ہے۔

**Dr. Mobarak Hussain**
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
Urdu College
Gopalganj (Bihar)
Mob. 91996 80504

مہاراشٹر کے ایک مشہور شہر ناگپور کے ایک نامور شاعر جناب عبدالرحیم نشترؔ کے لائق فرزند کا نام ہے

**ڈاکٹر محمد دانش غنی**

جو نوجوان محقق اور نقاد کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

**رنگ و آھنگ**

(تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ)

صفحات : ۱۴۴ سالِ اشاعت : ۲۰۱۴ء قیمت : ۹۲/روپے

اس کتاب پر مشہور و معروف شاعر و ادیب اور نقاد مرحوم زبیر رضوی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''رنگ و آہنگ کے تنقیدی تصورات کے پیشِ نظر انہیں نئی سوچ اور نئے ذہن کا تنقید نگار کہا جا سکتا ہے۔''

**شعر کے پردے میں**

(تنقید، تحقیق اور مکتوبات)

صفحات : ۲۴۰ سالِ اشاعت : ۲۰۲۰ء قیمت : ۱۳۹/روپے

مشہور محقق، نقاد اور شاعر شمیم طارق کے مطابق:

''عبدالرحیم نشترؔ نے اب تک جتنے شعر اور مصرعے کہے ہیں ان میں سب سے خوبصورت مصرعہ کا نام محمد دانش غنی ہے۔''

زیرِ طبع کتاب

**ماضی قریب کے ادبی معرکے**

کے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے:

ڈاکٹر محمد دانش غنی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے منتخب تحریروں پر رائے تو دی ہے مگر فریق بننے کی کوشش نہیں کی۔

کتاب ملنے کا پتہ

ڈاکٹر محمد دانش غنی

A 301۔ آدی ناتھ تارانگن، شیواجی نگر

رتناگری۔ 639 415

موبائل : 93727 60471

ISSN : 2582 - 3612



ڈاکٹر شبیر احمد

# بیکلؔ اُتساہی کی نعتیہ شاعری

یوں تو اردو میں نعت گوئی کی روایت عربی اور فارسی سے ہوتی ہوئی پہنچی ہے۔ اردو کے تمام شعرا نے نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ کوئی ایسا شاعر میری نظر سے ابھی تک نہیں گزرا جس نے تبرکاً ہی سہی نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں لیکن بطور نعت گو شاعر بھی کافی شاعروں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام امام احمد رضا خاں کا ہے جنہیں نعت گوئی پر ملکہ حاصل ہے۔ ان کی نعت گوئی پورے عالم اسلام میں قدر و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ امیر مینائی، الطاف حسین حالی، مولانا کوثر نیازی، بہزاد لکھنوی، خواجہ بیدم وارثی، مولانا عبدالعلیم آسی، مولانا ضیاء القادری، حمید صدیقی راز الہ آبادی، شاہ اکبر داناپوری، محسن کاکوروی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، حسن رضا بریلوی، کرامت علی شہیدی، شبنم کمالی، طلحہ رضوی برقؔ، عبدالمنّان طرزی، پروفیسر نجم الہدیٰ، پروفیسر فاروق احمد صدیقی اور بیکلؔ اُتساہی وغیرہم اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو میں نعت گوئی کو بیکلؔ اتساہی نے اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ اس سے موصوف کی مذہب اسلام سے وابستگی اور عقیدت و محبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں نعت گوئی کی فہرست اگر بنائی جائے تو اس فہرست میں بیکلؔ اتساہی کا نام لینا ناگزیر ہوگا۔ دور حاضر میں نعت گو شاعروں میں انہیں منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ انہوں نے نعت گوئی کی روایت کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نعت گوئی میں ہندی اور علاقائی زبان کی آمیزش و امتزاج سے نعت گوئی کے فن میں ایک نئی دنیا تعمیر کی ہے۔ جو موصوف کا امتیازی و انفرادی اختصاص ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل راٹھوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''بیکلؔ نے رسم و روایت سے آگے بڑھ کر نعت کے مفہوم کو سمجھا ہے اور نعت کی روح کو شاعری میں اُتارنے کا ایک منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بیکلؔ کا لب و لہجہ اپنی پہچان آپ ہے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان پوربی پر بیکلؔ کی گرفت مضبوط ہے۔ نتیجتاً مضامین و مفاہیم کو الفاظ کا شعری جامہ پہنانے میں آسانیاں میسر ہیں۔ نعتیں مضامین و مفاہیم کے نئے افق تلاش کرنا ان کا خاصا ہے۔ اور نعت کی نازک حدود میں لامحدود وسعتوں کا بحرِ بے کراں ان کی نعتیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یعنی ''جہاں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

جہاں خدا کی خدائی ہے وہاں وہاں مصطفےٰ کی مصطفائی ہے۔'' بیکلؔ اتساہی کا
مستند نعتیہ کلام ان کی شاعرانہ عظمتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔''

(فکر و آگہی (بیکل اتساہی نمبر): مضمون نگار، ڈاکٹر جمیل راٹھوی، ص ۱۵۱)

بیکلؔ اتساہی وضع قطع، لباس اور زبان و بیان سے دین دار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند نظر آتے تھے۔ ان کی زندگی میں مذہب کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی لگاؤ رہا ہے۔ ان کا تعلق خانقاہوں سے بھی رہا ہے۔ موصوف عبدالعزیز محدث مراد آبادی بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ سے بیعت بھی تھے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے مرشد کے ساتھ وقت گزارتے تھے اور اپنے نفس باطنی کی تنظیم و تربیت کیا کرتے تھے۔ خانقاہوں میں جانا، وہاں ٹھہرنا، اپنے مرشد کے ساتھ وقت گزارنا ان کا معمول تھا۔ نعت گوئی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انہوں نے شاعری کی کئی اصناف میں نعتیں کہی ہیں اور ہر صنف میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شاہد رضوی کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

''بیکلؔ اتساہی کی نعتوں، سلام، مناقب، قصائد، نظموں غزلوں اور گیتوں میں فطری مناظر سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔ بیکلؔ اتساہی عہد حاضر کے اس مہان بھارتیہ شاعر کا نام ہے جن کے نطق سے بیک وقت خسرو، جائسی، تلسی، کبیر، سور، میرا اور رسکھان کی سُر لہری سنائی دیتی ہے۔ بیکلؔ کا طرز بیان دیس کی مٹّی سے عقیدت، دیس باسیوں سے محبت، پاکیزہ انسانی جذبوں اور محسوسات کی مرقع آفرینی اور سماج میں پھیلی نا انصافی، نابرابری اور ظلم و استحصال کے خلاف صدائے حق بن کر رسیلے نغموں میں ڈھل جاتے ہیں۔''

بیکلؔ اتساہی نے جو نعتیں کہی ہیں ان میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور فنکارانہ اظہار بھی ہے۔ ان کی نعتوں میں دھیمی میٹھاس سننے والے کو مسحور کر لیتی ہے۔ موصوف نے مختلف صنفوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشتر خوبیوں کو نہایت توازن کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی نعتوں میں پاکیزہ جذبات، لطیف انداز بیان اور قادرالکلامی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انہیں اپنی زبان پر مہارت حاصل ہے۔ وہ جس زبان میں نعت کہتے ہیں وہاں نعت کی تمام خوبیاں سمٹ آتی ہیں۔ وہ جب اپنی نعتوں میں علاقائی زبان کی آمیزش کرتے ہیں تو ایک مختلف لطف و تاثر مترشح ہوتا ہے۔ جس سے عوام الناس کا براہِ راست ان کلاموں سے تعلق ہو جاتا ہے۔ جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ بیکلؔ نعتوں میں صرف رسول اکرم کے اطوار و خصائل کا ہی بیان ہی نہیں کرتے بلکہ نبی مجسم کے تعلق سے جو احساسات قلب ہیں پورے سوز و گداز کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے ہیں ان کے کلام میں فکر کی بلندی اور فن کی پختگی

ISSN : 2582 - 3612



سب موجود ہے۔ ان کی نعتیں روایتی انداز بھی رکھتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جدیدیت کا رنگ بھی نمایاں کرتی ہیں۔ اس سلسلے کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

رخِ شعور پہ ایمان کی رمق مہکے — لکھوں جو نعت تو دل کا ورق ورق مہکے

حضورِ اُمی لقب، کائنات طالب علم — وہی پڑھائیں تو جینے کا ہر سبق مہکے

گل جبیں، گل نظر، گل قدم، گل سخن — ایسا گل جس کی خوشبو چمن در چمن

شرحِ شانِ خدا اعتبار شفا — سرورِ دو جہاں کا لعابِ دہن

جہاں جہاں میرے اللہ کی خدائی ہے — وہاں وہاں مرے آقا کی مصطفائی ہے

زمانہ روٹھے تو روٹھا کرے نہ روٹھیں آپؐ — دہائی آپؐ کی صلِ علیٰ دہائی ہے

بیکل اُتساہی کی نعتیں اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ انہیں اپنے نبی اکرم سے بے انتہا عقیدت و محبت ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا کی کسی چیز کو قیمتی نہیں گردانتے ہیں۔ وہ جب نعت کہتے ہیں تو اپنے آپ کو نہایت خوش نصیب تصور کرتے ہیں۔ انہیں دنیا میں جو عزت و شہرت ملی ہے۔ سب اسی نعت گوئی کی وجہ سے ہے۔ اس تعلق سے اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

تعریف میں جو کرتا ہوں خیرالانام کی — عزت بلند ہوتی ہے میرے کلام کی

مت پوچھو مصطفےٰ کے وسیلے سے کیا ملا — احساس بندگی کی قسم اِک خدا ملا

جب سے ملی ہے دولت نعت نبی مجھے — مقبول میرے بزم میں اشعار ہو گئے

نعت گوئی کا فن نہایت مشکل ہے۔ اس میں قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ پھر اس راہ پر چلنا اس قدر دشوار ہے کہ ہر لمحہ ایمان کا خطرہ ہوتا ہے۔ عرفی نے کہا تھا کہ نعت گوئی تیز تلوار پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے۔ لیکن اس فن میں بیکلؔ اتساہی نہایت کامیابی اور کامرانی سے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل، گیت، نظم، قطعہ اور مخمس وغیرہ ہیئتوں میں نعتیں کہی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہیں۔جن سے ان کے فن کی پختگی اور علمی لیاقت کا بھی پتہ چلتا ہے۔علاقائی زبان میں مختلف ہیئتوں میں نعتیہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

نعتیہ بیوگ (ملہار)

تم بن دائی حلیمہ کے للنا جیرا مورا گھبرات ہو
سلگت ہے موری لاج کا آنچل نیناں بسی برسات ہو
سب سکھیاں مل پانچ سے بھل پنگھٹ پر اٹھلات ہو
میلی بھئی مورے من کی چدریا موہ سے رہا نہیں جات ہو
گھیرے ہوئے ہے رین اندھیری جانے کہاں گے بھور ہو
ہمرے تو دھن اِک آس تمہاری جس چندوا پہ چکور ہو
تمہری دہائی عرب کے بسیّا لوگوے لگاوت گھات ہو

اودھی پوربی زبان میں یہ نعتیہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

کملی والے عرش بسیا انگن مورے کب لے ایہونا
سگری رات بیت گئے انکھین جل جوالا برساوت
بھور بھئی اب جھولیا بھر دو کا ہے دیر لگاوت
بھلا کب لے تر سیہو نا
دکھیا دیت تمہارے دو ہیّا

نعتیہ گیت ملاحظہ فرمائیں۔

آپ نہ جنبھوں تب کے جانی من کا حال
کرم ہو عبداللہ کے لال
کیکرے سے ہم کہی بپتا کون ڈگر اپنائی
ارج سنے ما بہرے ہیں سب پھر کہہ کا گہرائی
ہمری ارجی آپؐ ہی سینھو کو ہوکے کون مجال
کرم ہو عبداللہ کے لال

بیکلؔ اتساہی کے نعتیہ کلام کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے جس میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ الگ الگ ہیئتوں میں تجربہ کیا گیا ہے۔جس سے موصوف کی قادرالکلامی اور زبان و بیان پر دستگاہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔انہوں نے قطعات مخمس، دوہے اور ماہیئے وغیرہ اصناف میں بھی نعتیہ کلام کہے ہیں۔

ISSN : 2582 - 3612



مندرجہ ذیل ہیئتوں کے نعتیہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

قطعہ

آگیا فرش پہ حق کا نور آگیا / یعنی انسانیت کا شعور آ گیا
کالی کملی میں لطف و کرم لئے / بزمِ کون و مکاں کا سرور آ گیا
بزم میں نعت سرکار پڑھتا رہوں / ایک بیکلؔ غلامِ حضور آ گیا

ہائیکو

بولے بڑی کتاب کائنات کو نور بانٹتا
طیبہ کا مہتاب
اقرا کی تنویر غار حرا کی مٹی چمکی
دنیا کی تقدیر

ماہیئے

رحمت کا اشارا ہے اِک نام شہہِ طیبہ
جینے کا سہارا ہے
موسم بھی سہانا ہے آقا کے منانے کو
نعتوں کا بہانا ہے

المختصر یہ کہ بیکلؔ اتساہی نے شعری اصناف کی بیشتر ہیئتوں میں نعتیہ کلام کہے ہیں اور تمام اصناف میں کمال ہنر دکھایا ہے۔اس سے موصوف کی نعت گوئی کا اختصاص واضح ہوتا ہے اور شعری اصناف پر دسترس کا بھی ثبوت ملتا ہے۔اس لئے موصوف بحیثیت نعت گو ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ان کی نعت گوئی لائق صد افتخار ہے۔

**Dr. Shabbir Ahmad**
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
S. N. S. College
Muzaffarpur
Mob. 93349 07650

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن

# نواب سیّد محمد آزاد بحیثیت نثر نگار

نواب سید محمد آزاد کا تعلق قدیم جاگیردارانہ خاندان سے تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد ایران سے ترک وطن کرکے ہندوستان آئے اور الٰہ آباد میں قیام کیا۔ اس کے بعد مستقل طور پر الٰہ آباد سے ڈھاکہ رخت سفر کر گئے اور وہیں کے مکیں ہو گئے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۴۶ء کو ''ڈھاکہ'' میں ہوئی۔

آپ جہاں ادبی شغف رکھتے تھے وہیں کئی اعلیٰ عہدے پر بھی فائز ہوئے آپ کی بہترین کارکردگی سے متاثر ہو کر برطانیہ حکومت نے آپ کو ''خان بہادر'' اور ''نواب'' کے خطابات سے نوازا۔ جہاں تک آپ کی نثر نگاری کی بات ہے تو آپ کی تحریر آپ کی ادبی شناخت قائم کرنے میں معاون رہی۔ آپ نے مضمون نویسی سے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ''اودھ اخبار'' (لکھنؤ) ''مشیر قیصر'' (لکھنؤ) ''آگرہ اخبار'' (آگرہ) ''سفیر'' (بودھانہ) ''اکمل الاخبار'' (دہلی) اور ''اودھ پنچ'' (لکھنؤ) میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی کئی تصانیف ادبی منظرنامے پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن میں ''خیالات آزاد'' (۱۸۸۷ء) ''سوانح عمری مولانا آزاد'' (۱۸۹۱ء) ''لوفر کلب'' (۱۹۰۰ء) اور ''نوابی دربار'' ہیں۔ ان تمام کتابوں سے آپ کی نثر نگاری کا بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

آپ کی تصانیف اس بات کا انکشاف کرتی ہیں کہ آپ نے اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرنے میں خصوصی توجہ دی ہے۔ آپ کی نثر نگاری کے متعلق پروفیسر عبدالغفور شہباز فرماتے ہیں :

''مولانا آزاد کی تصویر ایک کامل الفن معنوی نقاش کی استادی اور کمال کا حیرت انگیز نتیجہ ہے۔''

(سوانح عمری مولانا آزاد، عبدالغفور شہباز، مقدمہ)

مختصر یہ کہ جب ہم آپ کی تصنیف ''سوانح عمری مولانا آزاد'' کا مطالعہ کرتے ہیں تب یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ آپ نے بیشتر جگہوں پر انگریزی الفاظ اور ہندی الفاظ کی ترکیبیں بنا کر طنز و مزاح پیدا کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ بعض جگہوں پر عربی اور ہندی الفاظ کی تراکیب سے مزاح پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ آپ کی تصنیف ''سوانح عمری مولانا آزاد'' کئی اعتبار سے اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں طنز کے بھرپور عناصر موجود ہیں اس لئے اسے اردو کا پہلا خالص طنزیہ ناول تسلیم کیا گیا ہے۔ لہٰذا





یہ کہا جائے گا کہ آپ کی انشاپردازی مشاہداتی قوت شوخی طبیعت اور وسیع تجربہ قارئین کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ اس سلسلے سے مشتاق احمد فرماتے ہیں :

''نواب آزاد کے اس طنزیہ ناول میں ہمیں مزاح کا رنگ حد اعتدال میں ملتا ہے۔ ان کی ظرافت میں ایک سنجیدگی اور واقعیت ہر جگہ نمایاں ملتی ہے۔''

(سوانح عمری مولانا آزاد، مشتاق احمد، ص-۱۵-۱۴)

آپ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ آپ کا سماجی شعور کافی بالیدہ تھا۔ جس کی بنیاد پر آپ کی تحریریں اپنی اہمیت کا لوہا منوانے میں کامیاب رہیں۔ اس سلسلے سے پروفیسر عبدالغفور شہباز رقم طراز ہیں :

''الحمد للہ کہ اب ہمارے ہندوستان میں بھی اہل فرنگ کی فیض صحبت و حکومت اور شرف تربیت و معاشرت سے عالی دماغ اور روشن ضمیر لوگوں کے خیالات میں اس قسم کی آزادی آتی چلی ہے، جو ہر قوم کی علمی نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ہے.................ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا انشاپرداز ہوگا جس کے قلم سے اتنے مختلف نوایجاد رنگوں میں اتنی مقبول اور دل پسند تحریریں نکلی ہوں۔''

(خیالات آزاد، سید محمد عبدالغفور شہباز، ص-ح)

آپ کی تمام تصانیف جہاں قارئین کو اپنا گرویدہ بناتی ہیں وہیں ناقدین ادب کو بھی اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر لوگوں نے آپ کی نثر نگاری کے سلسلے سے اپنی بیش قیمتی رائیں دی ہیں۔ جن سے آپ کی انشاپردازی اور نثر نگاری کا بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ آپ ایک بالیدہ ذہن کے مالک تھے۔ اس پر اضافہ یہ کہ معاشرے کا گہرا شعور بھی رکھتے تھے۔ انہی خوبیوں نے آپ کی تحریر کو بے پایاں بننے میں مدد کی۔ صاف ستھرا لہجہ سادگی روانی اور شائستگی آپ کی نثر کی عمدہ خصوصیات ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ نے سادہ سلیس رواں بامحاورہ اور بول چال کی زبان کے استعمال پر خصوصی توجہ دی۔ اس پر اضافہ یہ کہ مکالموں کی برجستگی روانی بھی انتہائی موثر ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ آپ کا انداز بیان نہایت دلکش پر تکلف شوخ و ظرافت سے بھرپور ہے۔ آپ کی تحریر میں کہیں بھی ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ہر فقرہ نہایت چست اور مہذب ہیں اور عبارت دلکش اور مضمون اعلیٰ صنائع کا عمدہ نمونہ ہے۔

آپ کی نثر نگاری کے سلسلے سے یہ کہا جائے گا کہ آپ نے اس میدان میں بڑے خوبصورت گل بوٹے کھلائے ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے مایہ ناز نثر نگار تھے۔ مختصر یہ کہ آپ کی نثر شگفتہ اور دل پذیر ہے۔

آپ کی نثر کا رنگ و آہنگ پر اثر پرکیف اور دلچسپ ہے۔ آپ کی نثر میں ثقالت بھی نہیں، جو قارئین کے ذہن میں انتشار پیدا کرنے کا سبب بنیں۔ بلکہ آپ کی تحریر بڑی سلجھی ہوئی ہے اور ہمیں کافی محظوظ کرتی ہے۔ آپ کی تحریر میں جو وزن و وقار ہے وہ قابل ستائش ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ آپ ایک صاحب طرز انشاپرداز ہیں اور آپ کی تحریر میں علم اور فکر و فن کا دریا موجزن ہے۔

آپ کی تصانیف سے آپ کی بے پناہ قوت انشاپردازی صاف عیاں نظر آتی ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ نے اپنے منفرد اسلوب کے ذریعہ طنز و مزاح کے جو شگوفے کھلائے ہیں اس کی خوشبو ایک مدت گزر جانے کے بعد بھی قائم ہے۔ اسے ہم اعلیٰ انشاپردازی کا نمونہ تسلیم کریں گے۔ آپ نے اپنی تحریر کے ذریعہ اپنی طبعی ذکاوت و ذہانت سے قارئین ادب کو روبرو کرایا۔ مختصر یہ کہ آپ کی تحریر علمی و ادبی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ نے جہاں اپنے عہد کے متعدد مسائل پر قلم اٹھایا وہیں زبان و بیان اور مضمون کی ادائیگی پر بھی خصوصی توجہ دی۔ ابہام سے آپ کی تحریریں مبریٰ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بڑی ہی شگفتہ بیانی کے ساتھ آپ نے اپنی بات کہنے پر اپنے قلم کو آمادہ رکھا ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے گا کہ آپ کی نثری خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

انہی خصوصیات کی بنیاد پر آپ کی نثری خدمات کے قارئین ادب آج بھی دلدادہ ہیں اور امید ہے کہ آئندہ بھی رہیں گے۔ آپ کی نثر نگاری کے سلسلے سے میں یہاں چند مشہور و معروف اہل قلم کی آرا کو شامل کرنا چاہوں گا۔ جن سے نواب سید محمد آزاد کی نثر نگاری کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے :

''مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دلنشیں پیرایہ میں طنز کی ہے اس کا جواب بحیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔ آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے۔ کینہ پروری زہرناکی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے۔ اس اعتبار سے ان کو اردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔''

(طنزیات و مضحکات رشید احمد صدیقی، ص-۸۲)

''پنچ کے لکھنے والوں میں نواب سید محمد آزاد کا نام داخل ہے۔ انہوں نے نثر میں وہی کام کرنا چاہا تھا جسے اکبر نے نظم میں اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔''

(سخن ہائے گفتنی، کلیم الدین احمد، ص-۳۶۹)

''اودھ پنچ کے تمام لکھنے والے نثر نگاروں میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔





انہوں نے اپنے دور میں نثر نگاری میں ویسی ہی شہرت حاصل کی جو اکبر نے نظم میں حاصل کی.................ان کی تحریر میں ظرافت اور شوخی اور ادب کے چٹخارے ملتے ہیں اور وہ ایک معیاری زبان لکھتے ہیں۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح، غلام احمد فرقت کاکوروی، ص-۱۷۴-۱۷۳)

آپ کی نثری تحریریں اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں کہ آپ نے انسانی زندگی اور اس کے مزاج میں جو بوقلمونی ہوتی ہیں اس میں بڑے خوبصورت انداز میں رنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس کی تازگی و شادابی اور روشنی ہنوز برقرار ہے۔ آپ کے مضامین کا مطالعہ اس پہلو کو بھی سامنے لاتا ہے کہ آپ نے معاشرے کی دکھتی رگ پر بڑی فنکاری کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ قارئین کی ذہنی تربیت اور معاشرتی اصلاح کے سلسلے سے یہ کافی اہمیت رکھتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ آپ کی شخصیت ہمہ جہت پہلو کی مالک تھی۔ انگریزی زبان و ادب پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا اور اپنی تجربہ علمی اپنے گہرے مشاہدے اور کشادہ ذہن کے سبب اپنی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کو سدا بہار شاداب گلشن کی شکل میں اردو ادب میں پیش کیا۔ آپ کی طرز تحریر میں بڑی ندرت اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ اس لئے عبدالغفور شہباز کہتے ہیں :

''اس شخص نے اپنے وسعت خیالات کے مطابق بہ زور ذہانت ذکاوت اردو کی انشاپردازی کے تنگ کوزے میں وہ گنجائش نکالی کہ دریا کیا دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی سمائی نظر آئی۔''

(خیالات آزاد، عبدالغور شہباز، مقدمہ)

ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم نواب سید محمد آزاد کی نثر نگاری کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔

**Dr. Md. Fazlur Rahman**
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
J. L. N. M. College
Sursand, Sitamarhi
Mob. - 72500 34458

ڈاکٹر شبنم پروین

# افسانوی ادب میں غیاث احمد گدّی کا مرتبہ

غیاث احمد گدّی نے اُردو افسانوی ادب میں اپنے پہلے افسانہ ''دیوتا'' ۱۹۴۷ء کی صورت میں دستک دی تھی۔ اس عہد میں افسانوی منظرنامے پر پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عباس حسینی، محمد مجیب، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، احمد علی، غلام عباس، عصمت چغتائی، حسن عسکری، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، بلونت سنگھ، شفیق الرحمٰن، مہندر ناتھ اور اختر اورینوی وغیرہ کے نام اپنی جلوہ سامانیاں دکھلا رہے تھے۔ تمام افسانہ نگاروں نے اپنا امتیاز و انفراد اور حلقہ رسوخ قائم کر رکھا تھا۔ غیاث احمد گدی نے بھی جب اس میدان میں قدم رکھا تو ان کے پاس زندگی کے تجربات و مشاہدات کا سرمایہ تھا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے تمام مسائل و آلام کو نہایت ہی باریک بینی سے ایک ایک جزیات کا بیان فنکارانہ ہنرمندی سے کیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بابا لوگ'' ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اور دھیرے دھیرے اپنا ایک حلقۂ رسوخ بنانا شروع کیا۔

غیاث احمد گدی نے جب افسانہ نگاری شروع کی اس وقت ترقی پسند رجحانات اپنی توانائی دکھا کر ماند پڑتے جا رہے تھے۔ اور جدیدیت کا نیا رجحان اپنی جڑیں پکڑتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کے افسانوں میں ترقی پسند رجحانات اور تجریدیت کے طرزِ بیان کا عکس ابھرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن غیاث احمد گدّی اپنی ہنرمندی سے ان نظریات کو تجاوز کر جاتے ہیں اور اپنے لئے ایک نئی راہ ہموار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں میں کسی ازم کا دائرہ انہیں روک نہیں پاتا ہے اور وہ ایک آزاد فنکار کی طرح افسانوی منظرنامے پر ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ غیاث کے افسانوں کی معنوی کلید کیا ہے؟ پے در پے جو ان کے افسانوں کا خمیر بناتے ہیں۔ ان کی بھیڑ میں جواب آسان نہیں ہے۔ پھر بھی غیاث کا سنجیدہ قاری ایک نظر میں محسوس کر لے گا کہ وہ انسان دوستی کے بہت بڑے علم بردار رہے ہیں۔ ان کا دل انسانی ہمدردیوں کی شیرینی سے بھرا ہے۔ اس حد تک کہ وہ ایسے افسانے میں بھی جہاں جارحانہ اور تشدد کی فضا تعمیر کرنے میں مجبور ہوتے ہیں۔ وہاں بھی انسانی ہمدردی کی ازلی جبلت ان پر حاوی ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک آئیڈیلسٹک کہہ دینا بڑا آسان معلوم ہوتا





> ہے۔..........لیکن میں نے کہا ہے کہ غیاث کسی ازم کے پابند نہیں تو پھر ان کی مثال پسندی کا کیا جواز ہے۔ جواب وہی ہے کہ انسان ہمدردی کی سرشاری اور اس سے پیدا ہونے والے افکار کسی کو مثال پسند بنا سکتے ہیں۔ تو پھر غیاث بھی ایسے ہی Idealist ہیں جو ان کی جبلّت ہے اور ان کی تخلیقات کا سوتا بھی۔''

(تاریخ ادب اردو جلد سوم : وہاب اشرفی، ص ۱۲۳۵)

غیاث احمد گدّی کے افسانوں کا کینوس وسیع ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے بیشتر مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانے سماج کے ایسے ایسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن پر قلم فرسائی کرنا ایک دشوار کام ہے۔ یعنی اکثر و بیشتر افسانہ نگار جن موضوعات کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے۔ انہیں بھی موصوف نے اپنے افسانہ ''افعی'' اور ''پہیہ'' میں بیان کیا ہے اور وہ اس فن میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ موصوف کے افسانوں میں جو پیش کش کا انداز ہے وہ نہایت مؤثر اور دلکش ہے۔ ان کے تمام افسانوں کے مسائل جن سے افسانوں کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ وہ دراصل انسان دوستی ہے۔ وہ ہر انسان سے حد درجہ محبت کرتے ہیں۔ وہ تمام انسانوں سے محبت کرنے والا دل رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمدردیوں کی ایک لمس محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ جارحانہ رویہ فنی لوازمات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ مظلوم سے تو محبت کرتے ہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ظالم سے بھی ہمدردی رکھتے ہیں۔ انہیں افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت ان کے تمام افسانوں میں ہوئی ہے۔ ان کے بہترین چند افسانوں کے نام ''بابا لوگ، پیاسی چڑیا، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، تج دو تج دو، سائے ہم سائے، پہیہ اور افعی وغیرہ ہیں۔ انہوں نے لگ بھگ ایک سو افسانے لکھے ہیں۔ یہ افسانے مقدار نہیں معیار کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا ادبی سفر تقریباً چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے جتنے افسانے لکھے تمام عمدہ اور بے مثال ہیں۔ اردو ادب میں آزادی کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ان کی ایک مختلف شناخت قائم ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے متعلق جمشید قمر کی رائے ملاحظہ فرمائیں :

> ''ان کے بیشتر افسانے بدلتی ہوئی ادبی فضا، نئی حسیت اظہار و بیان کے نئے تیور کے پہلو بہ پہلو موجودہ عہد میں انسانی مقدر اور انسانی تماشوں کے باد پیما بلکہ مقیاس الحرارت کے مانند ہیں۔ یہ حقیقت منتخب افسانوں کے ترتیب و ارمطالعے سے بخوبی واضح ہوتی ہے۔ مزید برآں ان کے افسانوں کی دنیا یا تخلیقی کائنات کی سیر ہماری آگہی کو وسیع اور ہماری حسیت کو متنوع اور رنگا رنگ بنانے کے علاوہ ہمارے انسانی سروکار کو مضبوط بنیادوں پر استوار اور مستحکم کرتی ہے۔ غیاث کے افسانوں کے مطالعے کا معنوی جواز میرے خیال میں یہی ہے۔''

(غیاث احمد گدّی کے افسانے عرض مصنف مرتبہ جمشید قمر، ص ۹۔۸)

غیاث احمد گدّی کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ کسی حدود میں رہ کر تخلیقی ادب کو پروان چڑھانا نہیں چاہتے بلکہ تمام نظریات کے مثبت پہلوؤں کو قبول کر لیتے ہیں۔اور منفی پہلوؤں سے احتراز کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ تمام ازموں کی خوبیوں کے معترف ہیں۔لیکن مکمل نظریوں کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غیاث احمد گدّی عصر حاضر کی آگاہیوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ پرانے لکھنے والوں کا بھی انہوں نے مطالعہ بہ نظر غائر کیا تھا اور موجودہ دور کے تمام تخلیق کار بھی ان کے مطالعے میں رہتے تھے۔

غیاث احمد گدّی کے افسانوں میں راجندر سنگھ بیدی کی طرح کردار متضاد خصوصیت والے لائے جاتے ہیں۔جن سے کہانی میں شدید اثرات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ تکنیک ان کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے۔افسانہ ''بابا لوگ'' میں بھی یہی طریقہ کار کو استعمال کیا گیا ہے۔ بوڑھا انکل کے مقابلے میں مارگریٹ ہے۔''افعی'' میں زہرہ کے کردار کے خلاف میں بھائی انو اور مشتاق کا کردار ہے۔اندھے پرندے کا سفر میں رومی کے مقابلے اس کی بیوی اور شانتا ہے۔ جوہی کا پودا اور چاند میں مالی کی بیوی کے تضاد میں لکھیا ہے۔اس طرح غیاث احمد گدّی کے افسانے کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ان کے افسانوں میں ٹوپوگرافی ان کا اپنا آبائی علاقہ ہے۔اسی علاقے کے مسائل ان کے تمام افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ان مناظر کا موصوف نے نہایت ہنرمندی سے نقشہ صفحہ قرطاس پر ابھاڑا ہے۔انہیں منظر طرازی پر بھی ملکہ حاصل ہے۔ان کے افسانوں کا پلاٹ بھی گٹھا ہوا ہے۔کہانی میں کوئی بھی واقعہ بھرتی کا نہیں ہے۔ان کے افسانوں میں کہیں کہیں مکالمے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ جو نہایت عمدہ ہیں۔کردار کی علمی صلاحیت کے اعتبار سے مکالمے موقع اور محل کی مناسبت سے برجستہ اور معنیٰ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ان مکالموں سے انداز بیان میں تاثر اور واقعیت کا رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔غرض فکری اور فنی دونوں اعتبار سے افسانے عمدہ ہیں۔

غیاث احمد گدّی کے افسانوں میں شعور کی رو کا تکنیک بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ تکنیک جدیدیت پسند رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غیاث احمد گدی روایت، جدیدیت، ترقی پسندی، اشتراکی وغیرہ نظریوں کے مثبت پہلوؤں کو استعمال میں لاتے ہیں۔لیکن کسی بھی نظریہ کی مکمل پیروی نہیں کرتے ہیں۔اس بات پر انہوں نے ایک انٹرویو میں بھی اقرار کیا ہے کہ وہ کسی بھی نظریے کو صرف تخلیقی نقطۂ نظر تک ہی قبول کرتے ہیں۔اس کے دائرے میں وہ قید نہیں ہوتے ہیں انہوں نے جدیدیت کی ترجمان شعور کی رو کی تکنیک کو بخوبی استعمال کیا ہے۔اس سلسلے میں مہدی جعفر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :





''غیاث احمد گدّی کے یہاں عموماً شعور کی رو کی تکنیک استعمال ہوتی ہے۔سوچنے کے عمل میں غواصی اور دروں بینی جزوی طور پر ان کی پہچان بنتی ہے۔افسانوں میں شعور اور تحت الشعور دھوپ چھاؤں کی طرح جھلملاتے ہیں۔ چنانچہ عصری ماحول کے عصری شعور پس منظر میں یادوں کا استغراق ایک چونکا دینے والا اثر رکھتا ہے۔ اس کے باوجود انسانوں میں فکری عنصر حاوی نظر آتا ہے۔مگر فکر احساس اور جذبے کے ساتھ خمیر ہوکر سامنے آتی ہے اور تکنیک نگاری، پیکر تراشی اور اس طور سازی کے عمل سے گزر جاتی ہے۔..........ان کے جملوں کی تشکیل اور تراش وخراش پر شعور کی حکمرانی صاف نظر آتی ہے۔ چنانچہ غیاث احمد گدّی اپنے اسلوب پر اس درجہ قادر ہیں کہ وہ نئی حسیت کو بھی پرانے اسلوب میں داخل کر کے زبان کو تازگی بخشنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔''

(غیاث احمد گدّی شخصیت اور فن، مضمون نگار: مہدی جعفر، ص ۵۶)

غیاث احمد گدّی کے افسانوں میں تمام قدیم وجدید رجحانات سمٹ آتے ہیں۔انہیں روایت کا بھی پاس ہے اور وہ عصر حاضر سے بھی خوب خوب آشنا ہیں۔ اپنے معتقدمین اور معاصرین تمام تخلیق کاروں سے وہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانے کسی عظیم فنکار سے کسی صورت کمتر نظر نہیں آتے ہیں۔شعور کی رو کی تکنیک خود کلامی نہیں ہے لیکن خود کلامی سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔اس تکنیک کے ذریعے مصنف اپنے کردار کی کیفیات وحالات کو بیرونی صورت حال میں اندرونی کیفیات کی آمیزش کر کے بیان کرتا ہے۔اس طرح تمام حالات بغیر زمان ومکان کے قیود کے بیان کردئے جاتے ہیں۔جس سے پیش کش کا نیا طرز عمل وجود میں آتا ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک کے ترجمان افسانہ ''کالے شاہ'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''جب بھی مجھے مجّو بھائی یاد آتے ہیں تو ان کی آنکھوں کی وہ چمک بھی یاد آجاتی ہے جو میں نے امّاں کی گود میں دم توڑتے وقت دیکھی تھی۔ ابھی کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے مجّو بھائی کی موت کو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے۔جیسے صبح الگنی پر جو قمیض میں نے سوکھنے کو ٹانگی تھی وہ ابھی اچھی طرح خشک بھی نہیں ہونے پائی ہے، اور ہوا کے جھونکے سے اسی طرح کانپ رہی ہے جیسے صبح میں نے دیکھی تھی..........مگر گھر والوں نے زندگی کے چھوٹے بڑے جھمیلوں میں پر کر مجو بھائی کو یوں فراموش کردیا گویا مجو بھائی نام کا کوئی تنفس تھا ہی نہیں۔ ہمارے خاندان میں ذرا غور کرو تو مجو بھائی کی شیروانی کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک امّاں کے

گینڈرے میں موجود ہے مجو بھائی کے جسم کا ایک حصہ معلوم پڑتا ہے۔''

(کالے شاہ: غیاث احمد گدّی)

غیاث احمد گدّی شعور کی رو کی تکنیک سے تمام باتیں بیان کر جاتے ہیں اور کردار کے متعلق تمام جانکاری فراہم ہو جاتی ہے۔ ان کا لہجہ نرم، انداز پُرسکون اور ان کی زبان میں الجھاؤ نہیں رہتا ہے۔ ان کے جذبات و احساسات میں تسلسل واضح نظر آتا ہے۔ اس تکنیک کی شروعات سجاد حیدر یلدرم نے کی تھی۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں اس تجربے کو پیش کیا تھا۔ اس کے بعد قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کے سہارے پچیس سو سال کی داستان کو، تہذیب و ثقافت کو اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں سمیٹ دیا تھا۔ اس تکنیک کا سہارا لیکر غیاث احمد گدّی بھی ماضی اور حال کو ایک ساتھ سمیٹ لیتے ہیں۔ اس تکنیک میں ماضی، حال اور مستقبل کی تمام سرحدیں منہدم ہو جاتی ہیں۔

غیاث احمد گدّی کے افسانوں کا فکری اور فنی تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف کو تمام مرحلوں میں مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانے اردو ادب میں گراں قدر گردانے جاتے ہیں اور غیاث احمد گدّی اردو کے افسانوی ادب میں بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد عبدالمغنی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''غیاث احمد گدّی کو عصر حاضر کا ایک نمائندہ اور ممتاز اردو افسانہ نگار تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔.................انہوں نے آج کی زوال پذیر انسانیت کو آئینہ دکھا کر شاید اسے عبرت دلانی چاہی تھی۔ تاکہ وہ ایک بار پھر ترقی کی طرف رخ کر سکے۔ گدّی کا یہ اجتماعی شعور انہیں ایک ذمہ دار فن کار ثابت کرتا ہے۔''

(غیاث احمد گدّی: شخصیت اور فن، مضمون نگار: عبدالمغنی، ص ۴۳)

غیاث احمد گدّی ایک بلند مرتبت افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تمام تخلیقات بلند پایہ تخلیقی سرمایہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں سے انسانی قدروں کی گہری فکر مترشح ہوتی ہے۔ وہ تہذیب و ثقافت کی شکست و ریخت سے بہت غمزدہ نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے سماج کو تمام برائیوں سے پاک کر دینا چاہتے ہیں۔ انہیں فکری اور فنی پہلو کی بدولت انہیں اردو افسانوی ادب میں ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آنے والی نسلوں کے لئے بھی ان کے افسانے مشعل راہ کا کام کریں گے۔

**\Dr. Shabnam Parween**
At - Puraini
P.o.- Ghordaur
Via - Simri Bahtiarpur
Saharsa





ڈاکٹر رعنا کوثر

# کلیم عاجزؔ کی غزلوں کا اِنفراد

کلیم عاجزؔ اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کی شہرت و مقبولیت شاعری خصوصاً غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے شعری اور نثری دونوں میدانوں کے مختلف اصناف میں زور قلم دکھایا ہے۔ کلیم عاجزؔ کی شہرت و مقبولیت صرف درونِ ملک ہی نہیں بیرونِ ملک تک پھیل چکی ہے۔ ان کی غزل گوئی کو اکثر و بیشتر نقادوں نے میرؔ کی شاعری اور میرؔ کے اسلوب سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ موازنہ یا یکسانیت بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ میرؔ کی عالم گیر شہرت و مقبولیت اور کلیم عاجزؔ کی غزل گوئی دونوں کا کوئی تقابل نہیں ہے۔ بلکہ میرؔ کی شاعری اور اس کی عظمت کی بلندی تک پہنچنا اب تک امر محال رہا ہے۔ دونوں کی شخصیت میں کئی پہلو یکساں ضرور نظر آتے ہیں لیکن اس بنیاد پر کوئی دعویٰ کرنا بالکل ناسمجھی ہوگی۔ دونوں کے یہاں غم زمانۂ طفلی سے ان کی شخصیت میں شامل ہوا ہے۔ دونوں میں یکسانیت، کیفیتِ غم کی، مزاج کی، حوصلہ کی، اور زبان کی جزوی مماثلت پر ہے۔ کلیم عاجزؔ کی گھریلو زبان کرو ہو، جاؤ ہو، کہلاؤ ہو، اور کرے ہے وغیرہ رہی ہے۔ میرؔ کا لہجہ اور رنگ و آہنگ اپنانے کی کوشش کے جواب میں ڈاکٹر اسلم جاوداں کو کلیم عاجزؔ کا دیا ہوا جواب ملاحظہ فرمائیں :

''یہ صرف مغالطہ ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں نے میرؔ کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ میرؔ کو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ میرؔ میرے کورس میں بھی نہیں رہے ہیں۔ میرؔ سے میری شناسائی لکچرر ہونے پر ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب میں نے اپنے اندر خود اعتمادی محسوس کی اور لوگوں میں میری شاعری مقبول ہونے لگی تو میں نے اس خود اعتمادی کے نتیجے میں اس زبان میں شاعری شروع کر دی جو میری بول چال کی زبان ہے۔ یعنی میں اپنی شاعری میں وہی زبان اختیار کرتا ہوں جو بول چال میں کرتا ہوں۔''

(سہ ماہی ''بھاشا سنگم''، کلیم عاجز نمبر، مضمون نگار: اسلم جاوداں، ص ۷۷)

کلیم عاجزؔ کی شاعری ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ان کی زندگی میں جوان پر قیامت گزری اس

نے انہیں پختگی دی انہوں نے اپنی شاعری میں ان واقعات کے رنج والم کو سمیٹ لیا ان کا لہجہ اپنے دور کے شاعروں سے بالکل مختلف تھا۔لوگ مشاعروں میں ان کی غزلیں سن کر پوری غزل از بر کر لیا کرتے تھے۔ ان کی غزلوں میں اپنے ماحول، اپنے معاشرے، اپنے ملک وملت اور اپنے مذہب کی باتیں موجود ہیں۔وہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب دونوں نظریوں کے قائل تھے۔ان کے اشعار میں تخیل وتصورات کی باتیں بالکل نہیں ہیں۔بلکہ ان کے اشعار صرف حقیقت کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے اشعار ادب وثقافت اور روایت کے آئینہ دار ہیں۔لیکن تمام افکار ونظریات پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ وہ کسی سیاسی شخصیت سے بھی بہت متاثر تھے۔وہ انہیں اپنا Ideal سمجھتے تھے۔ان کی غزلوں کے متعلق کلیم الدین احمد کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''کلیم عاجز کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی اور سیاسی غزل کی زبان میں ہیں۔ان کے شعروں میں ''پھول'' بھی ہیں اور ''پتھر'' بھی۔اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے بھی سلیقے کی ضرورت ہے۔اور وہ پابندیوں کا غم، لیں تو سلیقہ کی لو اور بھی تیز ہوسکتی ہے۔''

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا: کلیم عاجز ص ۲۴)

کلیم عاجز کی غزل گوئی کو امتیاز وانفراد ان کے غم سے ہے۔ان کے یہاں غم انہیں توانائی عطا کرتا ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں لفظ غم کا استعمال اس قدر کیا ہے کہ دوسرے کسی بھی شاعر کے یہاں یہ موضوع اس طرح بار بار نہیں آیا ہے۔اور جتنی بار آیا ہے اتنی بار ایک الگ رنگ وآہنگ کے ساتھ آیا ہے۔ اس طرح موصوف کی مکمل غزلیات اسی قبیل میں سمٹ آتی ہیں۔اس سلسلے میں چار اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

غم آگے ہے، غم پیچھے، غم دائیں ہے، غم بائیں
ایسے میں کہاں جائیں، آ کوئی غزل گائیں

جس کو یہاں رہنا ہے ہر حال میں جلنا ہے
جو شمع نہیں بنتے محفل سے نکل جائیں

جہاں غم ملا اٹھایا پھر اسے غزل میں ڈھالا
یہی دردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

رونے کا کام دل کو سکھایا اسی لئے
یہ کام آگیا تو بڑا کام آگیا

اس غم نے انہیں اور ان کی غزلوں کو جو مقام ومرتبہ دلایا وہ کسی سے چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔





اس بات کا اعتراف وہ اس شعر میں کرتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

میں وہی گاؤں کا کلوا ہوں نہ عاجز نہ کلیم
تیری بے دادگری نے میری شہرت کر دی

کلیم عاجز ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں دور حاضر کے تمام موضوعات اور مسائل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔اس لئے موصوف کی غزل گوئی عصری حسیت بھی رکھتی ہے اور دلوں کو متاثر بھی کرتی ہے۔وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ان کی غزلیں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے بلند درجہ رکھتی ہیں ان کا اسلوب بیان دلکش، سلیس اور سادہ ہے۔جو ایک عام قاری کو بھی بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔انہوں نے صنائع بدائع کی بیشتر صنعتوں کا استعمال بہ حسن وخوبی کیا ہے۔تشبیہ، استعارا، رمزیت کنایہ۔مجاز مرسل وغیرہ کی دلکش مثالیں ان کے اشعار میں موجود ہیں۔موصوف کے ضرب المثل اشعار جو فکری اور فنی تمام خوبیوں سے آراستہ ہیں۔چند اشعار نموناً ملاحظہ فرمائیں۔

ہر صبح آتی رہے گی تازہ قیامت
ہر شام کو ہم تازہ غزل کہتے رہیں گے

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل سے پتھر پھینک گئے
جسکو چوٹ لگی ہے پیارے، اس کا ہی دل جانے ہے

زخموں کے نئے پھول کھلانے کے لئے آ
پھر موسم گل یاد دلانے کے لئے آ

وہی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں
جو آداب دار و رسن جانتے ہیں

تمہاری طرح زلفوں میں شکن ڈالے نہیں ہیں ہم
کہیں گے بات سیدھی پیچ وخم والے نہیں ہیں ہم

عقل پھرتی ہے لئے خانہ بہ خانہ ہم کو
عشق اب تو ہی بتا کوئی ٹھکانہ ہم کو

کلیم عاجز نے کلاسیکی غزل کی روایت کو ایک بلند معیار عطا کیا ہے۔انہوں نے ایک صحت مند فضا میں غزل کی روایت کو پہنچا دیا ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تمام مسائل جو انسان اور معاشرہ کو درپیش ہیں، انہیں اپنے غم کی آب وتاب میں ڈال کر شعری پیکر عطا کیا ہے۔ان کی غزلیں تغزل کا گہرا رنگ مرتب کرتی ہیں۔موصوف کی غزلوں کا اور ان

کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ جو اشعار کے ہجوم میں بھی اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ کلیم عاجزؔ کی غزل گوئی اور فکر وفن کے سلسلے میں کلیم الدین احمد کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں۔

''انداز فکر میں جدّت اور انداز بیان میں قدامت کلیم عاجزؔ کے تغزل کا
مخصوص آرٹ ہے۔ جو سینکڑوں شعراء کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا
اور پہنچانا جا سکتا ہے۔''

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا: کلیم عاجزؔ ص ۲۴)

کلیم عاجزؔ کی شاعری اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد لب ولہجہ اور افکار وتصورات کی وجہ سے امتیاز وانفراد رکھتی ہے۔ جو ان کی شاعرانہ شخصیت اور بلند مقام کی ضامن ہے۔ انہوں نے زمانے کی روش سے الگ اپنی راہ بنائی ہے۔ ان کی غزلوں میں حزنیہ رنگ نہایت واضح ہے۔ لیکن وہ مسائل وآلام سے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی غزلوں کا میرؔ سے مماثلت کے باوجود ایک الگ رنگ ہے۔ جسے ہم جدید رنگ تغزل کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں آپ بیتی کا رنگ جگ بیتی میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور جگ بیتی کو وہ آپ بیتی میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اس طرح موصوف تمام ہم عصر شعراء میں بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ آخر میں ان کی غزلوں کے طنزیہ سیاسی رجحانات کے مترشح اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پھونک ڈالا ہے گلستاں کا گلستاں جس نے  
کون کہتا ہے ترا شعلہ رخسار نہیں

شمشیر کبھی قتل کی چل ہی نہیں سکتی  
جب تک تیرے چتون کا اشارہ نہیں ہوتا

لے جا رہا ہوں درد میں ڈوبی ہوئی غزل  
بے درد کے لئے کوئی سوغات چاہئے

غافل نہ کبھی بیٹھیو اس بزم میں رندو  
ساغر یہاں ٹھہرے ہے تو شمشیر چلے ہے

**Dr. Rana Kausar**
Asstt. Teacher
Middle School
Jitkanhi Madhuban
Muzaffarpur





ڈاکٹر زینت آرا

# میرؔ کی غزلوں میں عصری حسیّت کے عناصر

تواریخِ شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غزل کو شعر وادب میں باضابطہ کوئی صنفی حیثیت حاصل نہ تھی۔ البتہ قصیدہ خوانی سے قبل مزاج وماحول کو موافق بنانے کے لئے عشقیہ نوعیت کے اشعار کہے جانے کا رواج تھا۔ یہ رواج عربی شاعروں کے یہاں عام تھا۔ عربی شاعر قصیدے کی تمہید کو تشبیب کا نام دیتے۔ جسمیں محبوب کے سراپا کا بیان ہوتا اُسے ہی غزل کے نام سے موسوم کیا جاتا۔ جب قصیدے کی صنف عربی شاعری سے فارسی شاعری میں پہونچی تو فارسی شاعروں نے غزل کو قصیدے سے علیٰحدہ کر ایک مستقل صنفِ سخن بنادیا۔ رفتہ رفتہ یہ صنف یعنی صنفِ غزل فارسی شاعروں کے ذریعہ اُردو شاعری میں داخل ہوگئی۔

اُردو شاعری میں کئی اصناف پروان چڑھیں اور ختم ہوگئیں۔ لیکن غزل محبوب ومقبول صنفِ سخن بنی رہی۔ البتہ اُردو میں نظم نگاری کا آغاز ہوا تو کچھ عرصے کے لئے غزل کی مقبولیت تھوڑی ماند پڑ گئی، لیکن ختم نہیں ہوئی۔ پھر غزل کا احیا ہوا تو وہ دیگر تمام اصناف پر سبقت لے گئی۔ یعنی اپنی محبوبیت اور مقبولیت کی بازیافت میں صنفِ غزل پوری طرح کامیاب رہی۔ غزل عام طور پر اظہارِ عشق کا وسیلہ تھی یا محبوب کی اداؤں کی تعریف وتوصیف کا ذریعہ۔ لیکن رفتہ رفتہ غزل نے اپنا رنگ ومزاج بدلا اور اس کے ذریعہ زندگی کے دوسرے معاملات ومسائل بھی پیش کئے جانے لگے۔ غزل اب فقط معشوق سے خلوت کی ملاقات کا بیان نہیں کرتی یا معشوق کی جدائی میں اشکبار نہیں ہوتی بلکہ اپنے عہد اور گرد وپیش کے تمام معاملات ومسائل کے ساتھ ساتھ تمام موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ میر تقی میرؔ کی غزلوں میں بھی انکے عہد اور اس عہد کے مسائل ودشواریاں واضح نظر آتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ میر تقی میرؔ نے غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ لیکن انہوں نے صرف غزلیں نہیں کہیں، غزلوں کے علاوہ مثنوی، قطعات، رباعیات، قصائد اور دیگر اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی کی۔ ان کا یہ سارا کلام 'کلیاتِ میر' کے نام سے شائع ہوا۔ میرؔ کی غزلوں کے کل چھ دیوان ملتے ہیں۔ دوسری تصانیف میں 'ذکرِ میر' ہے جو ان کی آپ بیتی ہے اور نکات الشعراء فارسی میں لکھی ہوئی ان کی وہ کتاب ہے جس میں شاعروں کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں میرؔ کو بحیثیت غزل گو شاعر ہی سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اُن کی اس شاعرانہ عظمت کا

اعتراف مرزا اسداللہ خاں غالبؔ جیسے کہنہ مشق شاعر نے بھی کیا ہے۔میرؔ کی شاعری کے تعلق سے غالبؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو؂

ریختے کے تم ہی اُستاد نہیں ہو غالبؔ — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ کی طرح ان کے ہم عصر شعراء بھی میرؔ کے کمالِ فن کے معترف تھے۔شاعر ذوق دہلوی جن سے غالبؔ کے ساتھ چشمک کے چرچے بہت عام ہوئے وہ بھی ان کے اندازِ غزل کی انفرادیت کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے۔شعر دیکھئے؂

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

محمد تقی میرؔ کم و بیش ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔بچپن ہی میں ماں باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔سوتیلے بھائی نے سارے اثاثے پر قبضہ کر لیا۔وہ دل برداشتہ ہو کر ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں دلّی آ گئے لیکن یہاں بھی سکون و عافیت کے سرمائے سے محروم رہے۔یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی میں انتشار اور افراتفری کا عالم تھا۔دلّی کی حالت بڑی ابتر تھی۔اُن کا جینا محال ہو رہا تھا۔اُسی دوران نواب آصف الدولہ کا بلاوا آیا۔ایسے حالات میں آخر انہیں ترکِ دلّی کر لکھنؤ آنا پڑا۔لکھنؤ میں میرؔ نواب سالار جنگ کے مہمان ہوئے جہاں اُن کی بڑی پذیرائی ہوئی۔میرؔ کی زندگی جن مصائب و آلام سے گذری اور جس طرح دلّی کی تباہی و بربادی ہوئی، دلّی بار بار لوٹی گئی اُس کا اثر اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ایک شام لکھنؤ میں مشاعرے کا اہتمام ہوا۔میرؔ کو بھی مدعو کیا گیا۔میرؔ تشریف لائے مگر کسی نے ان کو نہیں پہچانا۔لوگوں نے ان کی وضع قطع دیکھ کر پھبتیاں بھی کسیں، جس کا انہیں بہت ملال ہوا اور وہ بے حد رنجیدہ بھی ہوئے۔جب شمع ان کے سامنے لائی گئی تو اُن کا وہ درد اور غصہ دونوں چھلک اُٹھا؂

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کر ہنس ہنس پُکار کر

دلّی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

لیکن بعضوں نے میرؔ کے اس واقعے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب باتیں مولانا محمد حسین آزاد کی محض افسانہ طرازیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

میرؔ کی شاعری میں ان کی گھریلو اور ذاتی زندگی کی افلاس و بے سروسامانی کا بھی اثر ہے اور اس عہد کے تاریخی حالات نے بھی اُن کی شاعری کو بھی متاثر کیا ہے۔یعنی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں کی

ISSN : 2582 - 3612



انتشار و افراتفری کا شفاف عکس اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔لہٰذا اُن کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اُن کی گھریلو زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے عہد کے تاریخی حالات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اُردو کے ایک نامور اور ممتاز محقق و ناقد مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں :

''میرؔ کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کیلئے بہت ضروری ہے کہ اُن کے زمانے کے معاشرتی ماحول اور اُن اسباب و حالات پر جن کے اندر رہ کر میرؔ کی شخصیت کی تعمیر ہوئی دقیق نگاہ ڈالی جائے۔''

(میرؔ اور ہم)

یہ درست ہے کہ میرؔ اپنی ذات اور اپنے عہد کے ترجمان تھے۔خارجی و داخلی واقعات و حالات سے وہ متاثر ضرور ہوئے لیکن وہی ان کی تخلیقی قوتوں کو جگانے کا موجب بھی بنے۔میرؔ ایک بلند پایہ تخلیق کار ہیں۔اُن کی تخلیقی قوت متحرک ہوئی تو اس نے موثر الفاظ و تراکیب سے کام لیا۔اسی تخلیقی عمل نے انہیں دنیا کے صفِ اوّل کے شاعروں میں لا کھڑا کیا۔اعلیٰ قسم کی شاعری میں جو مظاہر، اشیاء اور موجودات اُبھرتے ہیں وہ حقیقی صورت کو تج کر ایک نئی شکل اختیار کرتے ہیں۔اشیاء کی صورت کی یہی تبدیلی میرؔ کی غزلوں میں بھی نظر آتی ہے۔اشعار ملاحظہ ہو؂

خورشید و ماہ و گل سبھی اودھر رہے ہیں دیکھ — اس چہرے سے اک آئینہ حیران ہی نہیں

شام جب وصال ہوئی ہاں کہ اس طرف — ہونے لگا طلوع ہی خورشید روسیاہ

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

حقیقی صورتوں کو تج کر نئی شکل دینے کی اس قوت و صلاحیت نے میرؔ کو اُردو شاعری میں ایک منفرد مقام بھی عطا کیا اور خدائے سخن کا تنہا تاجدار بھی بنا دیا۔

صنفِ شاعری میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ دوسری اصنافِ شاعری کو نہیں۔ٹھیک اُسی طرح غزل میں عشق کے بیان کو جو مقامِ خاص حاصل ہے۔دوسرے موضوعات اس درجۂ کمال کو حاصل کرنے میں شاید کامیاب نہ ہو سکے۔میرؔ بنیادی طور پر غزل گو شاعری ہیں اور ان کی غزلوں میں عشق کا بیان خوب خوب ملتا ہے۔یا یوں کہا جائے کہ اُن کی غزلوں کا مرکز و محور ہی عشق ہے۔اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اُردو ادب کے ایک معروف و ممتاز تنقید نگار سید احتشام حسین رقمطراز ہیں :

''میرؔ کی شاعری کا اصلی محور عشق ہے۔''

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

میرؔ کی عشقیہ شاعری میں ناکامیٔ عشق کا بیان بھی ہے، کیفِ وصال اور کربِ انتظار کی کیفیات بھی ملتی ہے۔عشق سے تن بدن میں آگ لگی ہے۔اس آگ سے استخواں بھی کانپ کانپ جل اُٹھے ہیں اور دل کا جانا ایک عجیب سانحہ سا ہو گیا ہے۔

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں　　عشق نے آگ یہ لگائی ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا　　عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میرؔ کی غزلوں میں جو درد انگیزی اور المنا کی پائی جاتی ہے وہ خارجی حالات اور داخلی کیفیات کا نتیجہ ہیں۔جس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں شامل ہیں۔خود میرؔ نے بھی درد وغم کی اس حقیقت کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔وہ کہتے ہیں۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے　　درد و غم جمع کیئے کتنے تو دیوان کیا

اُردو ادب کے ایک اور محقق و ناقد خواجہ احمد فاروقی کا میرؔ کی شاعری کو دل اور دلّی کا مرثیہ قرار دینے کی بھی شاید یہی وجہ ہے۔میرؔ کا شعر دیکھئے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میرؔ کی غزلوں میں صرف مایوسی و ناکامی کی کیفیت نہیں ملتی ۔اس میں جمالیاتی احساس کی نزاکت اور پاکیزگی بھی موجود ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں نشاط و سرخوشی کے احساسات بھی پائے جاتے ہیں۔ان کی غزلوں میں حسنِ نسوانی کی دلکشیوں اور دلفریبیوں کی سچی تصویر بھی ملتی ہے۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اسکی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اسکے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

میرؔ کا محبوب غیر انسانی نہیں بلکہ ان کے یہاں معاشرے کی ایسی عورت کا کردار اُبھرتا ہے جو خوبصورت بھی ہے، زندہ، شوخ اور طرحدار شخصیت کی مالکہ بھی۔

بال کھلے وہ شب کو شاید بستر ناز پر سوتا ہے
آئی نسیم صبح سے ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

ISSN : 2582 - 3612



کن نیندوں اب تو سوئی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا

میرؔ کے یہاں عشق زندگی کا ایک اہم اور سنجیدہ تجربہ ہے۔جسے انہوں نے غزل کے قالب میں ڈھالا ہے۔میرؔ نے وارداتِ عشق کی عکاسی اپنی غزلوں میں طرح طرح سے کی ہے اور پہلو پہلو سے بیان بھی کیا ہے۔مگر ان کا معیارِ عشق بہت بلند ہے۔

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

شب کو اس کا خیال تھا دل میں
گھر میں مہماں عزیز کوئی تھا

ہم وہ ہیں جن کے خوں سے تری راہ سب ہے گل
مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کر

میرؔ کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں سادہ و آسان زبان اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا ہے۔آسان زبان اور عام فہم الفاظ کے استعمال کی اسی سادگی اور لب و لہجہ کی شگفتگی نے انکی غزلوں میں خوبصورتی و انفرادیت پیدا کردی۔اسکے علاوہ روزمرّہ اور محاورے کے استعمال نے نہ صرف انکی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا بلکہ انکی غزلوں میں اور بھی جان ڈال دی۔تشبیہ و استعاروں کے استعمال میں نزاکتوں اور لطافتوں کے حد درجہ خیال نے انکی غزلوں میں نکھار بھی پیدا کیا اور مقام بھی بلند کیا۔میرؔ کا شیوۂ گفتار منفرد ہے۔اُن کے اشعار میں ایک فطری بہاؤ ہے۔اُن کی شاعری میں آمد کی کیفیت ہے۔اُن کے باطن سے اشعار یوں برآمد ہوتے ہیں جیسے کسی پہاڑ کے دامن سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے۔وہ شعور اور لاشعور کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں اور شخصیت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔اس طرح اُن کا کلام طبعِ رواں کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی　　پہونچی ہے اس سرے تئیں طبعِ رواں کی بات

احوالِ میرؔ کیوں کر آخر ہو ایک شب میں　　اِک عمر ہے یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

**Dr. Zeenat Ara**
'Neda' Manzil, Zakariya Colony,
Sadpura, Muzaffarpur-842002

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

## افروز بانو

# حسن عسکری کا انتقادی شعور

اردو ادب میں حسن عسکری کی شخصیت نہایت معتبر گردانی جاتی ہے۔حالانکہ انہیں اردو ادب میں جو مقام ومرتبہ ملنا چاہئے تھا وہ ہرگز نہ ملا۔انہوں نے تنقیدی ادب میں جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ نہایت قابلِ قدر ہیں اور اردو تنقید میں انہیں انفرادو امتیاز کا حامل بھی بناتا ہے۔اردو تنقید میں بے شمار نقاد ہوئے ہیں جنہوں نے اس میدان میں اپنے جھنڈے گاڑے ہیں اور پورے اردو تنقیدی ادب کو متاثر بھی کیا ہے اور اپنی علمی بصیرت کا رعب و دبدبہ بھی قاری اور ناقدین پر جمایا ہے۔لیکن حسن عسکری ایسے محقق و ناقد ہیں۔ جنہوں نے بیشتر ناقدین پر اعتراضات کئے ہیں۔اردو ادب میں جہاں ناقدین مغربی ادب وتنقید کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں اور بیشتر ناقدین مغرب زدہ اور مغربی افکار وتصورات سے متاثر نظر آتے ہیں۔وہاں حسن عسکری مشرقی ادب وتنقید کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔اردو کے تمام بڑے ناقدین تنقید میں مغرب کی بالادستی کے قائل ہیں۔اور مغربی ادب وتنقید کو مشرقی ادب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مشرقی ادب وتنقید سے کہیں زیادہ معتبر مانتے ہیں۔اسی بنیاد پر اردو تنقید میں اپنی بلند قامتی قائم بھی کرتے ہیں۔لیکن حسن عسکری مشرق کے اقدار ومعیار کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں ان کی تنقید کئی مراحل سے گزرتی ہے۔ابتدائی دنوں میں موصوف پر بھی مغرب زدہ ہونے کی بات کہی گئی لیکن ان کا مطالعہ جیسے جیسے گہرا ہوتا گیا ان کے رجحان میں بھی تبدیلی آتی گئی اور وہ مشرق کے اقدار ومعیار کے قائل ہوتے گئے۔اس سلسلے میں ابوالکلام قاسمی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''محمد حسن عسکری کی مشرقیت کے پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات توجہ طلب ہے کہ عسکری ان لوگوں میں نہیں جو آغاز دل تا آخر مشرق سے شروع ہوتے ہیں۔اور مشرق پر ہی آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔عسکری نے اپنے سفر کا آغاز مغرب سے کیا تھا۔وہ انگریزی ادب کے طالب علم اور پھر استاد رہے۔فرانسیسی زبان وادب میں کامل دستگاہ حاصل کی۔مغربی ادبیات کی روایت کے ساتھ وہاں کی ہم عصر علمی وادبی





سرگرمیوں سے واقف رہے۔ان کے بعض مضامین کے متراجم فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں چھپے تو ان مضامین کو انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں نے اس حد تک قابل توجہ جانا کہ ادبی رسائل میں ان پر بحثیں چلیں............اس پس منظر کے ساتھ وہ مشرقی ادبیات، اقدار اور تہذیبوں کی وکالت کرتے ہیں۔''

(مشرق کی بازیافت، مقدمہ ابوالکلام قاسمی، ص ۱۱)

حسن عسکری کا مطالعہ نہایت وسیع ہے انہوں نے فرانسیسی زبان وادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔اس لئے ان کی دلیلوں کو نظرانداز کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ان کی تنقید میں مغرب ومشرق کا تضاد ضرور ہے۔لیکن توازن اور اعتدال کا دامن انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا ہے۔اس سلسلے میں وہ مذہبی رجحان بھی رکھتے ہیں۔ان کی تنقید کو اس رجحان نے بھی کافی متاثر کیا ہے۔لیکن ادب میں مذہب کی عینک وہ نہیں لگاتے ہیں بلکہ ان کا ذاتی عقیدہ شعوری یا غیر شعوری طوار پر ضرور ان کی تحریروں میں منعکس ہوتا نظر آتا ہے، جو لازمی بھی ہے۔لیکن اس رجحان سے قطع نظر ان کی تنقیدی بصیرت کو کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔موصوف کی تحریروں میں مشرق و مغرب میں یہ حد فاصل واضح نظر آتا ہے کہ مغرب کے افکار ونظریات چونکہ مرکزی حقیقت سے دور ہیں۔اس لئے وہ اس بنیاد پر مغرب کے اس رجحان کو مسترد کر دیتے ہیں اور مشرق کے افکار ونظریات تمام اختلافات کے باوجود ان کی تنقید ایک مشترک رجحان رکھتی ہے، اس لئے ان خوبیوں کی بنیاد پر موصوف کی تنقید مشرق سے قریب ہو جاتی ہے۔یہی رویہ ان کے تمام تنقیدی مقالات کا ماخذ ہوتا ہے دراصل موصوف کی تنقید کا مقصد حقیقت کو حاصل کرنا ہے۔اس سلسلے میں موصوف کی تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''مشرق کی بڑی تہذیبوں میں ہر قسم کے ثانوی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر حقیقت کا ایک واحد تصور ملتا ہے یہاں حقیقت کے کئی درجے ہیں لیکن یہ سب درجے ایک بنیادی حقیقت کے اندر سے نکلے ہیں اور اس کی بدولت وجود رکھتے ہیں۔اس اعتبار سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دراصل حقیقت صرف وہی ایک ہے، باقی سب اس کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں اس پوری بات کو فیضی نے ایک مصرع میں کہہ دیا ہے ع

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفاء''

(مشرق ومغرب کی آویزش، اردو ادب میں)

حسن عسکری کی مشرق پسندی ایک الگ رنگ ورجحان کی حامل ہے۔وہ مشرق کی کورانہ تقلید نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں بلکہ اس رویے کی وجہ کر انہیں رجعت پسند کے زمرے میں بھی نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ دراصل حسن عسکری کا خیال ہے کہ ناقدین نے مغربی ادب کے تعلق سے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ سطحی ہے اور خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔اس سے ادب کا نقصان ہوگا اور واقعتاً ابھی تک نقصان ہوتا ہی رہا۔صرف مغربی ناقدین کا نام نقل کرنے سے تنقید گمراہ ہو رہی ہے۔اس سلسلے میں خود بھی واقفیت حاصل کرنی ہوگی اور قارئین کے سامنے بھی اس کی حقیقت کو پیش کرنا ہوگا۔ موصوف نے تنقید کے تعلق سے بے شمار سوال اٹھائے ہیں اور تمام سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔اس سے ادب کی ترقی ممکن ہو سکے گی اور ادب گہری نیند سونے یا جمود میں جانے کے بجائے بیدار ہوگی اور دیگر ادب کے مدمقابل کھڑی ہو سکے گی۔

حسن عسکری اپنی تنقید میں ترقی پسند رجحان اور مارکسی نظریے کے قائل نہیں ہیں۔ان کے اخلاق باختہ رویوں سے وہ بیزار نظر آتے ہیں وہ جمالیاتی اقدار کے قائل ہیں۔حسن اور حقیقت ان کی نظر میں اہم ہیں۔ان کی تنقید کا بیشتر حصہ مشرق و مغرب کے تضاد کا نقشہ پیش کرتا ہے۔اس سلسلے میں موصوف کی اپنی وضاحت ملاحظہ فرمائیں :

''مغرب میں یہ بات خلوص اور بلندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ آدمی اپنے پرانے خیالات چھوڑ کر نئے خیالات اختیار کرتا جائے۔ اِسے مغرب میں ذہنی نشوونما کہا جاتا ہے۔مشرق میں ایسے آدمی کو شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ مغرب کے نزدیک صداقت کوئی مستقل بالذات چیز نہیں، اور مشرق کے نزدیک جو چیز مستقل بالذات نہ ہو اسے صداقت نہیں کہہ سکتے۔''

حسن عسکری کے تنقیدی رویے دیگر نقادوں سے بالکل مختلف تھے۔ان کی فکری میں استقامت تھی۔ ان کا اپنا مطالعہ نہایت وسیع اور وقیع تھا۔بغیر مطالعے کے سنی سنائی بات پر وہ اظہار خیال نہیں کرتے ہیں۔ ان کے اندر علمی بصیرت کی وجہ سے خوداعتمادی پائی جاتی ہے۔وہ ہمیشہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر کسی بات کو ردو قبول کرتے ہیں۔ان کی تنقید نے اپنے معاصرین پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی تنقید تخلیقی نوعیت کی حامل ہے۔انہوں نے اپنی تمام تحریروں میں تخلیقی لگن کا اعتبار قائم رکھا ہے۔اس سلسلے میں سہیل احمد فاروقی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''عسکری صاحب کی ایک اور حیثیت جو انہیں اردو تنقید کی تاریخ میں





امتیاز بخشتی ہے، ان کی غیر معمولی تخلیقی استعداد ہے۔علم اور مطالعے کی وسعت کے باوجود عسکری صاحب کے ادبی مذاق میں خشکی نہیں پیدا ہوئی تھی۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ ترجمہ، طبع زاد تحریر اور تخلیق کے شعبوں میں اپنی تخلیقی لگن کا اعتبار قائم رکھا، ان میں اچھی اور بری ادبی تخلیقات کی درجہ بندی کا بھی بہت سلیقہ تھا۔ادب کے ساتھ ساتھ انہیں مصوری، موسیقی، فن تعمیر اور مختلف سماجی اور سائنسی علوم سے بھی دلچسپی تھی۔اس لئے ان کی تنقید میں جا بجا ایک بین العلومی انداز نظر کا ثبوت ملتا ہے۔عسکری صاحب صحیح معنوں میں ادبی مفکر کہے جا سکتے ہیں۔ایسی ہمہ گیر اور بسیط نظر اردو تنقید کی پوری تاریخ میں کسی اور نقاد کے یہاں نہیں ملتی ہے۔''

(بیسویں صدی کا مزاج: سہیل احمد فاروقی، ص ۷)

حسن عسکری کی شخصیت تنقید کے حوالے سے نہایت معتبر مانی جاتی ہے۔انہوں نے خود کبھی تنقید نگاری کا دعویٰ نہیں پیش کیا۔لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں وہ گہرائی اور گیرائی موجود ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات کو کوئی عام تنقید نگار کاٹ نہیں سکتا۔وہ اس قدر مدلل انداز میں باتیں کرتے ہیں کہ سننے والا ان کی باتوں کا تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔وہ خود بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میری باتیں قاری کو اپنے دائرے اثر میں لے لینے کا ہنر رکھتی ہیں۔اس وجہ سے ان کی اسلوب نگارش کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ان کی تنقید تخلیقی رجحان و میلان رکھنے کے ساتھ اسلوب کی کشش بھی بدرجہ اتم رکھتی ہے۔اسلوب بیان کے اعتبار سے ان کی تنقید دیگر ہم عصروں سے مختلف اور ممتاز ہو جاتی ہے۔

حسن عسکری مروجہ تنقیدی رویے سے مطمئن نہیں تھے۔اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں کے متعلق نہایت عاجزی اور انکساری سے جو باتیں کہی ہیں۔اس میں انکساری بھی ہے اور طنز بھی ہے حالانکہ ان کی تنقیدی صلاحیت اور علمی بصیرت کی مکمل دنیا معترف ہے۔ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں :

''مجھے نہ تو افسانہ نگار کہلانا پسند ہے، نہ تنقید نگار، نہ ادیب۔ میں تو اپنے آپ کو اس زمرے میں شامل سمجھتا ہوں جس کا نام ایک فرانسیسی ناول نگار نے (جس کا نام اس لئے حذف کرتا ہوں کہ اردو نقادوں کے ذہن پر بار نہ ہو اور فقرہ انگریزی میں لکھتا ہوں کیونکہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں کر سکتا)'' POOR LITTLE

BUGGERS'' رکھا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ قاضی ہیں، نہ مفتی، نہ محتسب، نہ چوکیدار، بس اتنی اہلیت ضرور رکھتے ہیں کہ جو کچھ دیکھا ہے اسے کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں افسانہ نگار ہوں یا نقاد ہوں، البتہ اتنی بات مجھے معلوم ہے کہ میں لفظوں کو اس طرح جوڑ سکتا ہوں کہ تھوڑے بہت لوگ میری تحریر کو شروع سے آخر تک پڑھ لیتے ہیں۔''

(انسان اور آدمی، ص ۵، پیش لفظ)

ظاہر ہے حسن عسکری کی تحریروں میں وہ تاثر ہے کہ اگر آپ ایک بار پڑھنا شروع کر دیں تو جب تک مضمون مکمل نہیں ہوگا آپ کی طبیعت اسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہوگی۔ یہی موصوف کے اسلوب بیان کا جادو ہے۔ اپنی بات کو پیش کرنے کا انہیں جوانوکھا انداز حاصل ہے۔ یہی ان کی تحریروں میں تاثر پیدا کرتا ہے اور انہیں اسلوب بیان کے اعتبار سے دوسرے تخلیق کاروں اور نقادوں سے منفرد مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے یہ تمام باتیں ان کے عمیق مطالعہ اور بالیدہ شعور کے مشاہدہ کی وجہ سے ممکن ہو پاتی ہے۔ اپنی تحریروں کے متعلق موصوف کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''چونکہ مجھے طرح طرح کی ''پسندیوں'' سے متعلق کیا جاتا ہے۔ اس لئے میں پڑھنے والوں کو اتنا اور بنا دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں انہیں دیر کی طرف بلا رہا ہوں نہ حرم کی طرف چند باتیں دیکھ کر، یا چند باتیں پڑھ کر میرے اندر جو ردعمل پیدا ہوا ہے میں تو صرف اسے بیان کر رہا ہوں ۔ یہ ردعمل دوسروں کے لئے کہاں تک قابلِ قبول ہے، اس کا خیال رکھنا میرے لئے غیر ضروری ہے۔ بلکہ اگر میں اس کا خیال رکھ کے لکھنے لگوں تو میری حیثیت ایک لکھنے والے کی نہیں رہے گی، کچھ اور ہو جائے گا۔''

(انسان اور آدمی'' پیش لفظ: حسن عسکری، ص ۷)

قصہ المختصر یہ کہ حسن عسکری ایک بلند پایہ ناقد ہیں۔ ان کی ناقدانہ صلاحیت کی ایک دنیا معترف و مداح بھی ہے۔ ان کا تنقیدی شعور اس قدر بالیدہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات تنقید میں تخلیقی شان بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی کہی ہوئی بات مدلل اور قابلِ قبول ہے۔ وہ اپنی تنقید میں پیش کش کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کی تنقید اسلوب بیان کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہے۔ ان کی باتوں میں توازن واعتدال بھی ہے۔ ان کی





تنقیدی تحریریں ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لئے مختلف ادوار میں ان کا مقصود الگ الگ ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ان باتوں سے آشنا نہیں ہیں بلکہ یہ عمل ان کی تحریروں میں شعوری طور پر پیدا ہوا ہے۔ جو فطری اور واقعیت کا رنگ بھی رکھتا ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب ''ستارہ یا بادبان'' میں اپنے اس موقف کو واضح بھی کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''اگر تنقید تخلیقی سرگرمیوں سے اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہتی ہے تو ہر دور میں اس کا فریضہ مختلف ہوگا۔ تربیت یافتہ ادبی شعور کے بغیر کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں۔''

(''ستارہ یا بادبان'': حسن عسکری، ص ۱۰۹)

**Afroz Bano**
+2 Lecturer (Urdu)
Govt. Girls College
Chapra - 841 301
Saran

کیا آپ اپنی کتاب یا رسالہ عالمی اردو قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں؟
سِہ ماہی ''ساغرِ ادب'' میں رعایتی نرخ پر اپنی کتاب یا رسالے کا اشتہار دیجئے۔
''ساغرِ اَدب'' کی گلوبل ریڈرشپ، کتب و رسائل کی نکاسی کا ایک مؤثر ترین ذریعہ۔

شرح اشتہار

| | |
|---|---|
| General Full page Space | 10,000 |
| General Half page Space | 5,000 |

پتہ :
حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ۔ سعد پورہ، پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور (بہار) پن کوڈ 842 002
موبائل نمبر : 90062 53903 / 94300 84261

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد شاہنواز رضوی

# عصرِ حاضر میں ضلع نالندہ کی شعری خدمات

نالندہ ضلع صوبہ بہار کا ایک علمی وادبی شہرت یافتہ شہر ہے۔اس شہر کی مقبولیت وشہرت سیاسی، معاشی، مذہبی اور ادبی تمام اعتبار سے نہایت بلند و بالا رہی ہے۔تواریخ کے مطالعہ سے واضح ہے کہ نالندہ عہد قدیم میں علم وادب کا گھوارہ رہا ہے۔اس سرزمین پر بلند پایہ دارالعلوم کی تاریخ ساز کارگزاریاں رقم ہوئی ہیں۔اس دارالعلوم میں بیک وقت آٹھ ہزار پانچ سو طالب علم اپنے علم کی تشنگی کو بجھا کر آسودگی حاصل کرتے تھے۔اور اس کام میں پندرہ سو دس اساتذہ بھی اپنی خداداد صلاحیتوں سے تاریخ رقم کر رہے تھے۔اس طرح یہ سرزمین علمی وادبی سرگرمیوں کا انوکھا مرکز رہ چکا ہے۔مذہبی اعتبار سے گوتم بدھ کے افکار وخیالات کی ترویج وتشریح بھی یہاں سے شروع ہوئی تھی۔یہیں کی پالی زبان میں گوتم بدھ نے تمام مذہبی تبلیغ واشاعت کا کام کیا۔اسی لئے اس سرزمین کو نالندہ مہاویہار کہا جاتا ہے۔گیارہویں صدی میں نالندہ اسلامی تعلیمات اور روحان فیضان کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔صوفیائے کرام نے اردو زبان و ادب کی ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دئے ہیں۔زبان وادب کے اعتبار سے اس سرزمین سے بہار کے بیشتر اضلاع کے ساتھ ساتھ دہلی، لکھنو، دکن وغیرہ کا بھی انسلاک براہِ راست رہا ہے۔اس طرح مجموعی طور پر یہاں اردو زبان و ادب کی تبلیغ واشاعت ہوتی رہی ہے۔آج بھی علم وادب کے تعلق سے یہاں کی سرزمین سرسبز وشاداب نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔عاشقانِ اردو ادب نے اس خطۂ ارض میں اپنی نگارشات سے یہاں کے ذرّہ کو آفتاب بنایا ہے۔اور آج بھی شاعر وادیب کی ایک بڑی تعداد اس کام میں منہمک ہے۔چند مخصوص شعراء کے نام قائم الدین قائم اندھوی، سید عبدالقادر گرد بہاری، سید محمد مظفر دردائی، فہمیدہ اسام، خواجہ منظر حسن منظر، کلیم عاجز، صبا شیر، علقمہ شبلی، مجید عامر، صفی احمد، محمد نسیم الدین حیدر، ڈاکٹر اسری ارشد، محمد انعام الحق، شکیل دیسنوی، نثار احمد مائل، برق بہاری، صابر بہاری، سید امتیاز احمد ماہر مسلم ہندی، اطہر ہلسوی، عمر دراز، آفتاب حسن شمس، محمد وسیم الدین اصغر، انور بہاری، فرحت قادری، پروفیسر عبدالواسع، ظفر غزالی اور اقبال حسن آزاد وغیرہ قابلِ احترام ہیں۔جنھوں نے نالندہ کی سرزمین پر شعری محفلوں کو آباد رکھا اور شعری ادب کے حوالے سے نالندہ کا نام ملک اور بیرون ملک تک پہنچایا





ہے۔اس کے علاوہ نثری ادب میں بھی کافی ادیبوں نے اس خطہ ارض کو بلندی وسرفرازی کے مقام تک پہنچایا ہے۔لیکن ہم یہاں صرف شعری ادب کا ایک جائزہ پیش کریں گے۔

قائم الدین صوفی مزاج شاعر کی حیثیت سے نالندہ میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔قائم ایک غزل گو شاعر گزرے ہیں۔گرد بہاری کا پورا نام سید فرید الدین ہے۔والد کا نام سید کبیر الدین ہے۔ان کا تعلق محلّہ کاشی تکیہ بہار شریف نالندہ سے ہے۔ان کی پیدائش ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی۔یہ ایک ریلوے ملازم تھے۔انہوں نے اپنی پہچان مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے کرائی ہے۔یہ ایک کہنہ مشق شاعر گزرے ہیں۔ان کا انتقال ۲/جون ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ان کی شاعری میں طنز وظرافت کا ایک خوش نما رنگ پوشیدہ ہے۔انہوں نے سنجیدہ شاعری بھی کی ہے۔ان کے مزاحیہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

اصلی خدا کا گھر تو بڑھاپے میں دیکھتا    اس خانۂ خدا کو تو وقت شباب دیکھ
حاجی نہیں تو کیا ہوا پاجی کہیں گے لوگ    اٹھ خانہ خدا کو تو جا کر شتاب دیکھ
بیگم چلیں سنیما مذہب کے نام پر    کتنا بڑا فریب ہے یہ انقلاب دیکھ
حج دیکھنے گیا تو کوئی ان کو دیکھے    سب جدا جدا ہے یہاں انتخاب دیکھ

سیّد محمد مظفر دردائی کی پیدائش موضع ارجن سرتھوا ضلع نالندہ میں ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی۔ان کی وفات ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔بچپن سے نہایت ذہین تھے۔اردو فارسی اور انگریزی زبانوں میں دستگاہ رکھتے تھے۔علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔کم عمری میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔پٹنہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔پھر بی۔اے۔ ۱۹۴۷ء میں کیا۔پھر نالندہ چلے آئے۔یہیں شعر وسخن کی محفلوں میں شامل رہنے لگے۔ان کی غزلیں رومانیت کی عکاس نظر آتی ہیں۔زبان پر انہیں دسترس حاصل تھی۔نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

جگر کے داغ سے فصلِ بہار پیدا کر    ریاض دہر میں جانِ بہار ہے پیارے
اچھا ہے چھڑکتے رہو زخموں پر نمک تم    آرام ملے گا تو جھپک جائیں گی آنکھیں
عجب انداز ہے اب دوستی کا    زباں سے گر کسی کی دل کسی کا
دل میں رکھی ہے سجا کر کیسی تصویر بتاں    اس صنم خانے کو ناصح توڑنا ابھی نہیں

فہمیدہ اسام کی پیدائش موضع کرائے پرسرائے ہلسہ، نالندہ میں ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی۔آزادی کے بعد کراچی، پاکستان چلی گئیں۔انہوں نے شعر وشاعری ۱۹۵۶ء سے شروع کی۔ان کی غزلوں میں حسن وعشق کے موضوعات بیان ہوئے ہیں۔زبان وبیان میں عجب سی شگفتگی پائی جاتی ہے۔فنی اعتبار سے بھی ان کے اشعار عمدہ ہیں۔انہوں نے نثری ادب میں افسانہ اور مضمون نویسی بھی کی ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

شدت غم سے ملا مجھکو یہ فیض　　غم ہے ہمدم مشغلہ احساس غم جاتا رہا
غم نے مجھ کو کر لیا ہمدم رفیق　　ڈھونڈتی ہی رہ گئیں خوشیاں مجھے

کلیم عاجزؔ موضع تلہارا ضلع نالندہ میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۲۰۱۵ء میں ہو گیا۔ ان کے والد کا نام شیخ کفایت حسین اور والدہ کا نام امۃ الفاطمہ شہید تھا۔ انہوں نے اصناف شاعری کی تمام ہیئتوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن موصوف بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی شہرت ومقبولیت اور بلند قد آوری کی معترف پوری اردو دنیا ہے۔ ان کی شخصیت نہایت پروقار ہے۔ غزل گوئی کے حوالے سے عالمی ادب میں ان کا نام ممتاز غزل گوشعراء میں شامل کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں درجنوں تصانیف ان کی بلند قامتی کے ثبوت ہیں۔ انہیں دبستان عظیم آباد کا عظیم شاعر کہا جا سکتا ہے۔ انہیں جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ کم شاعروں کے نصیب میں آئی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' ہے۔ انہوں نے خودنوشت، سفرنامہ وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''فصلِ بہاراں آئی تھی'' بھی ہے۔ تیسرا مجموعہ غزل ''ہاں چھیرو غزل عاجزؔ'' ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''کوچہ جانانِ جاناں'' ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

پھونک ڈالا ہے گلستاں کا گلستاں جس نے　　کون کہتا ہے ترا شعلہ رخسار نہیں
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ　　تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
غافل نہ کبھی بیٹھو اس بزم میں رندو　　ساغر یہاں ٹھہرے ہے تو شمشیر چلے ہے
لے جا رہا ہوں درد میں ڈوبی ہوئی غزل　　بے درد کے لئے کوئی سوغات چاہئے
شمشیر کبھی قتل کی چل ہی نہیں سکتی　　جب تک تیرے چتون کا اشارہ نہیں ہوتا

کلیم عاجزؔ کی شاعری میں رنج وغم کا حصہ زیادہ بڑا ہے اور پوری غزل گوئی اسی دائرے میں سمٹ گئی ہے۔ ان کی شاعری کو رنج وغم، اور کرب واضطراب نے ایک عجیب تاثر کی فضا قائم کی ہے۔ جوان کی غزل کو معیار اور انفراد عطا کرتا ہے۔ اور انہیں بڑا غزل نگار کا درجہ دلاتا ہے۔

علقمہ شبلی کی پیدائش میر غیاث چک، ضلع نالندہ میں ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولانا عبدالجبار انصاری تھا۔ یہ درس وتدریس کے پیشہ سے منسلک رہے ہیں۔ ان کی تصانیف کے نام ''بے چہرہ لمحے''، ''تارے زمین کے'' اور ''پھول کے آنگن'' ہیں۔ نالندہ کی ادبی اور شعری محفلوں کو انہوں نے اپنے خون جگر سے روشن کیا ہے۔ ان کی شاعری روایت اور جدیدیت دونوں کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے عہد وماحول کی کشاکش، کرب واضطراب کی زندہ تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ موصوف ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پسندی کو جدیدیت پسندی سے

ISSN : 2582 - 3612



ہمکنار کیا ہے۔ دونوں میں باہمی رشتہ قائم کیا ہے۔ دونوں کے درمیان تضاد کے رشتے سے بھی انکار کیا ہے۔ ان کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

چمن میں شعلے بھرک رہے ہیں، گلوں کے دل پھر دہل رہے ہیں
بہار تو لٹ چکی ہے کب کی بچا سکو تو خزاں بچاؤ
قدم میں لغزش ہے فسردہ، ہر اک نظر بھی بجھی بجھی سی
عجب ہے عالم شکستگی کا، کسے بچاؤ کہاں بچاؤ

مجید عامر کا اصل نام عبدالمجید انصاری ہے۔ ان کی پیدائش محلّہ چھجور، بہار شریف نالندہ میں ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔ انہوں نے نظم نگاری میں اپنے جوہر دکھائے ہیں اور کئی کامیاب نظمیں بھی لکھی ہیں۔ نالندہ کے شعر وادب کی ترقی میں ان کا ایک اہم نام ہے۔

صفی احمد محلّہ خانقاہ، بہار شریف، نالندہ میں ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید شاہ محمد رحیم الدین تھا۔ انہوں نے بھی شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میدانوں میں اپنی جولان طبع کا ہنر دکھایا ہے۔ خوف طوالت کی وجہ کر صرف ایک شعر پیش خدمت ہے۔

ذکر روئی کا نہ اب بازار کی باتیں کرو　　آؤ بیٹھو گنگناؤ پیار کی باتیں کرو

نسیم الدین حیدر کی پیدائش موضع مہدی کلاں تھانہ اسلام پور نالندہ میں ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام عبدالشکور تھا۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

گھبرا چکے ہیں اب تو غم زندگی سے ہم　　کیا خاک جی سکیں گے جہاں میں خوشی سے ہم

سید امتیاز احمد ماہر بہار شریف، نالندہ میں ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید خیرات احمد تھا۔ ان کا پیشہ درس وتدریس تھا۔ انہوں نے نالندہ کی ادبی فضا کو خوش گوار اور سبزہ زار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے شاعری کی بیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں صوفیانہ افکار وتصورات کی حامل ہوتی ہیں۔ فن رباعی میں انہوں نے بہترین ہنرمندی دکھائی ہے۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ سے جو خود کو نڈر رکھتے ہیں　　دنیا کی ہر اک چیز کا ڈر رکھتے ہیں
خالق ہی کی چوکھٹ سے جو کرتے ہیں گریز　　مخلوق کی چوکھٹ پہ وہ سر رکھتے ہیں

انہیں غزل اور رباعی دونوں صنفوں میں کمال حاصل ہے۔ ان کا طرزِ بیان سلیس اور سادہ ہے۔ ان کی قادرالکلامی ان کے اشعار سے واضح ہے۔

مسلم ہندی کا اصل نام محمد مسلم ہے۔ ان کی پیدائش موضع برنانواں، تھانہ ناچنڈی، نالندہ میں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ والد کا نام مولانا تصدق حسین ہے۔ ان کا پیشہ سرکاری ملازمت ہے۔ انہیں اردو شاعری اور غزل گوئی کے لئے توصیفی سند سے بھی نوازہ گیا تھا۔ انہوں نے اردو کی بیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے شعری مجموعہ کا نام ''شاخ ثمر'' ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مجموعہ کلام زیر اشاعت ہیں۔ ان کے کلام میں جدیدیت کا عنصر بدرجہ اتم ہے۔ لیکن ان کی جدیدیت مثبت پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔ ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ ان کے خیالات پیچیدہ نہیں ہیں۔ ان کے کلام مطالعہ کی وسعت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں فکر کی بلندی اور فن کی پختہ کاری موجود ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جو اعلیٰ فکر اور فنی خوبیوں سے مزین و آراستہ ہیں۔

دشمنوں کے لئے اماں بھی وہی　　دوستوں کا رفیق جاں بھی وہی
مالک عرش کا مقرب وہ　　اہل دنیا کے درمیاں بھی وہی
دست قدرت کی اولیں تخلیق　　قائد آخرالزماں بھی وہی

ان کے کلام میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اپنے عہد کی عکاسی بھی ہے۔ موصوف ہر جگہ فکر و فن کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

لیا جانے لگا جب فاتحہ پڑھ پڑھ کے نذرانہ　　یہی سے رسم سرکاری دفاتر میں ہے رشوت کی
رقم جب عقد پڑھنے کی لیا کرتے ہو تم ہندی　　جنازے کے لئے کتنی مقرر اپنی اجرت کی

کس روز مجھ غریب پہ تہمت نہیں لگی　　کس روز بے دریغ مرا خوں بہا نہ تھا
لکھ لکھ کے واقعات کو محفوظ کر لیا　　تم بعد میں کہو گے کہ ایسا ہوا نہ تھا

فرحت قادری کا اصل نام سید ابوالفرح ذولنون محمد جاہ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس طویل نام کے بدلے فرحت قادری نام اختیار کیا ہے۔ ان کے والد کا نام سید ابوالظفر قادری تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۸ء میں قصبہ اوگانواں، ضلع نالندہ میں ہوئی تھی۔ یہ کورٹ میں ملازم تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''کائنات غم''، ''شیشے اور پتھر'' ہیں۔ ان کی شاعری کلاسیکیت کا رنگ لئے ہوئے ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں عصر حاضر کی تمام مشکلات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کے کلام سے ندرت فکر کا ایک حسین رنگ مترشح ہوتا ہے۔ نموناً دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر در پہ نگوں ہے یہ، ہر نقش پہ جھکتی ہے　　پیشانی آدم میں پلتے ہیں خدا کتنے
لمحوں کے تعاقب میں ہر در سے گزرتی ہے　　یہ گردش دوراں بھی کشکول گدا ٹھہری

ظفر غزالی کا اصل نام ابوظفر غزالی ہے۔ ان کے والد کا نام عبدالجبار ہے۔ ان کی پیدائش

ISSN : 2582 - 3612



۱۹۳۸ء میں نالندہ میں ہوئی۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام ''لہو کا درد''، ''اونچائیوں سے اترتی صدا'' اور ''دور ایک پیڑ'' ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے تمام رجحانات قبول کئے ہیں۔ وہ ایک دردمند شاعر ہیں۔ ان کے کلاموں میں رجائیت کا عنصر نمایاں ہے۔ نموناً دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جیب ہی اپنی اجازت نہیں دیتی ورنہ　　میرے دروازے سے مایوس سوالی جائے
لے گھری ایسی مسلط ہے گھروں پر کہ نہ پوچھ　　میں تو اب بھول گیا گھر کی دعا بھی دینا

المختصر یہ کہ دور حاضر میں بھی شاعروں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے جن کو اس مقالہ میں جگہ دینا ممکن نہیں ہے۔ جن شعرا اور شاعرات کا نالندہ کی سرزمین سے تعلق ہے وہ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور چند لوگ تو بیرون ملک بھی اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ لیکن تمام لوگوں نے نالندہ کا نام روشن کیا ہے اور نالندہ کی زرخیز علمی و ادبی زمین سے باہر نکل کر پورے عالم ادب کو منور کیا ہے۔ اس لئے نالندہ کی شعری روایت قدما سے دور حاضر تک ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ جو اردو ادب میں اپنا ایک نمایاں حصہ مختص کرتی ہے اور اردو ادب کو مایہ دار بناتی ہے۔ جسے کسی صورت میں نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

**Dr. Md. Shahnawaz Rizvi**
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
Rajeshwar Lal College
Alinagar, Nalanda
Mob. - 70045 84727

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر نور سیما رضوی

# سردار جعفری کی نظمیہ شاعری

ترقی پسند اردو نظم میں سردار جعفری کا حصہ کے ذکر کے قبل میں اپنے اس مضمون میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور ترقی پسند تحریک کے سلسلے سے گفتگو کرنا چاہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک ہندوستان جیسا کثیر الجہت سماج اور معاشرہ جو مستقل کئی رنگوں اور تہذیبوں کی بہترین مثال پیش کرتی ہے یا یوں کہیں کہ جس کی ملی جلی رنگا رنگ تہذیب وثقافت کی تاریخ صدیوں پرانی ہے اس لئے اس ملک کی شناخت اگر ایک تہذیب کے رنگا رنگ پہلو کے اعتبار سے کی جائے تو وہ بے سود ثابت ہوگی۔ اسی طرح جب ہم ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تب اسی کثیر الجہات ہندوستانی سماج کی عکاسی ہمارے شعرا وادیب نے کی ہے اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کی بہترین عکاسی کرنے میں ہمارا اردو ادب معاون ومددگار رہا ہے :

ترقی پسند تحریک کی ضرورت کیوں آن پڑی اس سلسلے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

''بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں قومی ذہنی کرب اضطراب اور امید کی نئی فضاؤں سے شناسا ہوا۔ قومی ضروریات اور بین الاقوامی اثرات کے ماتحت مادی زندگی اور فکر میں غیر معمولی تبدیلیاں ہوئیں۔ انجمن برہم بھی ہوئیں اور محفلیں سجائی بھی گئیں۔ چنگاریاں بجھیں بھی اور راکھ کے نیچے دبے ہوئے شرر بھڑک کر شعلہ بھی بنے اور زندگی کی رنگا رنگی نے سوز وساز اور رنگ روپ کے وہ سامان فراہم کردیے جن سے مختلف قسم کا شعور رکھنے والے مختلف راہوں پر چل نکلے............اس طرح نظم شاعری کا ایک بہت اہم شعبہ بن گئی جو اپنے دامن میں عشق ومحبت امن وجنگ دل سوزی اور انسان دوستی اشتراکیت اور انفرادیت عقیدہ پرستی اور بغاوت کے ہزار ہا پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔''

(سہ ماہی تحقیق، جمشید پور، جنوری تا مارچ ۲۰۱۶ء، ص-۹-۸)

اس طرح یہ کہا جائے گا کہ اردو نظم اب عوامی زندگی کے ساتھ ساتھ زمانے کی افراط وتفریط کے اظہار کا بہترین ذریعہ تسلیم کی جانے لگی۔ اب گل وبلبل کی داستانیں اپنی بقا کھو چکی تھیں۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ ترقی پسند اردو نظم موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے نئی کروٹیں بدل چکی تھی۔

ISSN : 2582 - 3612



اس تعلق سے میں یہ بھی عرض کردوں کہ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے اور الہ آباد میں اپنا منی فسٹو بھی پیش کیا اس طرح الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوگئی۔ اس انجمن کے پہلے جلسے میں علی سردار جعفری بھی موجود تھے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی میں ادب کا رخ عوام کی طرف ہوتا جارہا تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشور اس بات کی وضاحت کررہا تھا کہ :

''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔''

(رسالہ تحقیق، جمشید پور، جنوری تا مارچ ۲۰۱۶ء، ص-۱۰)

جب ہم سردار جعفری کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ آپ نے مذکورہ بالا منشور کی پیروی مکمل طور سے کی۔ کیوں کہ آپ اس بات سے باخبر تھے کہ اب خیالی تفریحی اور مصنوعی ادب کی گنجائش باقی نہیں رہی لہٰذا عوامی مسائل کی پیشکش ہی ہمارا اولین مقصد ہونا چاہئے۔ ادبی اعتبار سے یہ ایک مشکل مرحلہ تھا کیوں کہ صدیوں کی روایتی جمالیات اور شعریات سے انحراف کرتے ہوئے ایسے مسائل کی پیشکش کرنی تھی جس سے ادب کا قاری نامانوس تھا۔

سردار جعفری کی ترقی پسند نظموں کے تعلق سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے یہاں انسانی واخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ رجائیت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ آپ کی ترقی پسند نظمیہ شاعری کا جائزہ نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' کے اس بند سے لیا جاسکتا ہے۔

یہ ایشیا کی زمیں تمدن کی کوکھ تہذیب کا وطن ہے — یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے — یہیں سے گوتم نے آدمی کو سمانتا کا سبق پڑھایا

آپ کی نظمیں آپ کے نظریہ حیات کی بھرپور وضاحت کرتی ہیں وہ یہ کہ آپ کی نظموں میں حسن کی تلاش وجستجو پر بھی خصوصی توجہ ہے، لیکن یہ حسن محبوب تک محدود نہیں بلکہ اس حسن کا انسلاک معاشرہ سے ہے۔ کیوں کہ آپ نے اپنی نظموں کے حوالے سے ایک خوبصورت دنیا اور معاشرے کی تعمیر کا خواب دیکھا تھا۔ آپ کی نظمیہ شاعری کے تعلق سے اس پہلو سے بھی آگاہی حاصل کرنی ضروری ہے وہ یہ کہ ترقی پسند شاعری کے تین رجحان تھے۔ پہلے رجحان میں بلند آہنگ لہجہ کی سیاسی اور نظریاتی شاعری ہے جس کی نمائندگی جوش، مجاز، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، نیاز حیدر وغیرہ نے کی۔ دوسرا رجحان نرم اور مدھم لہجہ کی نیم رومانی اور نیم فکری شاعری کا ہے۔ تیسرا رجحان قوم پرست شاعروں کے ملے جلے رجحان کا

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہے۔ جسے ہم نیم رومانی اور نیم کلاسیکی بھی کہہ سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ علی سردار جعفری نے اپنی نظموں میں انسانی زندگی کے مسائل کی پیشکش اس طرح کی کہ آپ کی نظمیں قنوطیت میں بھی رجائیت کا احساس دلانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے سے آپ کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' میں شامل نظم ''اودھ کی خاک حسین'' کا یہ بند دیکھئے۔

میں رات کے وقت اپنے خواب میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤ کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کر ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

اس نظم کے علاوہ ''نئی دنیا کو سلام''، ''پتھر کی دیوار''، ''امن کا ستارہ''، ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''ایک خواب''، ''پرواز''، ''خون کی لکیر''، ''لہو پکارتا ہے''، ''پیراہن شرر''، ''ترانہ جمہور''، ''سرطور'' اور ''اسٹالن کتھا'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ علی سردا جعفری نے ادب کے جمالیاتی، تشریحی، تاریخی اور تقابلی گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ کیوں کہ آپ ترقی پسند تحریک کے اہم کارکن تھے لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ آپ نے جس طرح اشترا کی اور انقلابی خیالات کو بلند کیا یا یوں کہیں کہ فکری اور انقلابی موضوعات کو ہم آہنگ کیا وہ قابل ستائش ہے۔ آپ کی نظمیہ شاعری کے سلسلے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ

ISSN : 2582 - 3612



نے ''مارکسی نظریات وخیالات کی تشریح وتفہیم کا حق بھی ادا کیا۔''

آپ کی ترقی پسند نظمیہ شاعری کے سلسلے سے پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں:

''تمام نظموں میں سردار جعفری کا مخصوص رجائی طرز فکر مشعل کی طرح فروزاں نظر آتا ہے۔ وہ انسان اس کی قوت عمل عزائم اور حوصلوں پر بے پایاں اعتماد رکھتے ہیں۔''

(سردار جعفری کی شاعری پہ طائرانہ نظر اور دیگر مشمولات، جگن ناتھ آزاد، ص-۱۳)

جب ہم سردار جعفری کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے جس خواب کا ذکر اپنی نظموں میں کیا ہے وہ اسی معاشرے میں زندگی جینے والے انسان کا ہے اسی لئے بیشتر نظموں میں انہوں نے اخوت انسانیت اور مساوات پر مزید گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ جدوجہد اور عمل پیہم کی اہمیت وافادیت سے بھی قارئین کو بہرہ ور کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ آپ کی نظموں میں کھیتوں باغوں فصلوں کے ساتھ کسانوں کے استحصال کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس سلسلے سے نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' کا یہ بند دیکھئے۔

غریب مزدور جلتی آنکھیں     اچاٹ نیندوں کی تلخ راتیں
تھکے ہوئے ہاتھ بھاپ کا زور گرم فولاد کی روانی     جہاز ملاح گیت طوفاں

مختصر یہ کہ انسان دوستی اور انسانیت ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان کی عظمت کا ذکر بھی وہ خوب کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ سردار جعفری نے ترقی پسند اردو نظم کی آبیاری میں بہترین قلمی معاونت دی جو قابل ستائش ہے۔

**Dr. Noor Sima Rizvi**
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
D. S. W. Evening College
Sohsarai, Bihar Sharif
Nalanda Bihar
Mob. - 95725 37143

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر افشاں نگار اجمل

# جوش کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی

جوش اس زمانے سے تعلق رکھتے تھے جب ملک کی آزادی کی خاطر ادیب وشاعر کے ساتھ ساتھ پوری عوام صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ ملک پر برطانیہ حکومت کا قبضہ قائم تھا اور ہندوستانی معاشرہ افراط وتفریط کا شکار تھا۔ اس غیر تشفی بخش صورتحال میں ہر فرد آزاد فضا میں سانس لینے کی جستجو کر رہا تھا۔ ملک ہندوستان میں جو نامساعد حالات تھے انہیں ختم کرنے کے لئے ملک کے نوجوانوں نے جہاں صدائے احتجاج بلند کی وہیں فنکاروں نے اپنی تخلیقات کو اس سلسلے سے بہترین وسیلہ بنایا۔ اس سلسلے سے آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، حالی، فیض احمد فیض، اقبال، مجاز اور جوش کی نظمیں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔

جہاں تک جوش کی بات ہے تو ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ آپ کی روشن خیالی، انسان دوستی اور وطن دوستی نے وطن ہندوستان کی آزادی کے لئے سنگ میل کا کام کیا۔ جوش حساس ذہن کے مالک تھے۔ وہ ایک باخبر باشعور شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ملک اور سماج کے تمام نشیب وفراز سے آپ پوری واقفیت رکھتے تھے۔ جس باعث آپ کی شاعری میں سماجی اصلاح اور وطنیت کے عناصر کا داخل ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جوش نے سیاست سے منھ نہیں موڑا بلکہ ہر رنگ اور تیور سے بھرپور بہترین نظمیں تحریر کرتے رہے۔ جن میں وطن دوستی اور انقلابی رنگ جلوہ نما ہے۔ اس طرز کی نظموں کا ایک طویل سلسلہ آپ کے شعری مجموعے میں موجود ہے۔

آپ کی نظمیں جس طرح آپ کے جذبہ حب الوطنی کا پتہ دیتی ہیں وہیں آپ کے یہ مصرعے بھی ملک کے نوجوانوں اور عوام کو خاصا متاثر کرنے میں کامیاب رہے　ع

☆　میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

☆　قوم کے ہاتھ میں تلوار دیتا ہوں

آپ کی ان نظموں اور مذکورہ بالا مصرعوں کی وجہ سے آپ شاعر انقلاب بھی تسلیم کئے گئے۔ مختصر یہ کہ ادب انسانی اور معاشرتی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ جوش کی شاعری بھی اپنے عہد کی بہترین ترجمان ہے۔ آپ کا شمار صف اول کے شاعروں میں ہوا کرتا تھا۔ آپ کے سلسلے سے یہ بھی کہنا درست ہوگا کہ آزادی وطن کے ترانے جس تڑپ اور گھن گرج کے ساتھ آپ نے گائے اسے آپ سے ہی مخصوص کیا جا سکتا





ہے۔ آپ کے شاعرانہ دم خم نے نوجوانوں کو قوت اور حوصلہ بخشا۔ آپ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے گئے۔ آپ کی نظم ''وقت کی آواز'' کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔ جن سے آپ کی وطن دوستی کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

تجھ سے منھ موڑ کے منھ اپنا دکھائیں گے کہاں　　گھر جو چھوڑیں گے تو پھر چھاؤں میں جائیں گے کہاں

بزم اغیار میں آرام یہ پائیں گے کہاں　　تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائیں گے کہاں

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا　　کس قدر تجھ سے ہی مضبوط ہے رشتہ اپنا

نظم ''وقت کی آواز'' ۱۹۴۵ء میں آپ نے لکھی ہے۔ اس نظم سے جذبہ حب الوطنی صاف عیاں ہے۔ وطن کی سرزمین جوش کو کتنی عزیز تھی اس سلسلے سے یہ نظم خاص اہمیت رکھتی ہے۔ پوری نظم میں وطن سے والہانہ محبت کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس سلسلے سے آپ کی تحریر کردہ نظم ''شکست زنداں کا خواب'' ۱۹۲۴ء بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نظم کے حوالے سے جوش نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ زنداں کا پھاٹک لوہے کا نہیں ہے اور اس کی دیواریں اینٹ اور پتھر کی نہیں ہیں۔ بلکہ اس زنداں کا نام ہندوستان ہے۔ مختصر یہ کہ اس نظم کے حوالے سے جوش نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے عوامی پہلو، برطانوی حکومت کے استبداد اور اس سے پیدا شدہ ہیجان کو سامنے لایا ہے جن میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ نظم ملاحظہ کیجئے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں　　اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی　　سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں　　بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں

تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں　　آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا

تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدہ میں پڑی ہیں تعمیریں　　کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو

ابلیں گے زمیں سے مارسیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں　　ابلیں گے زمیں سے مارسیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے　　ایک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے　　اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

یہ نظم بلاشبہ بہترین ہے۔ یہ پوری نظم آزادی سے پہلے کے ابلتے کھولتے ہوئے ہندوستان کا استعارہ ہے۔ اس نظم کے حوالے سے جوش نے زنداں کا منظر پیش کیا ہے۔ جہاں بغاوت کا لاوا ابلنے کو ہے

عوام قیدی ہیں جو دیواروں کے پیچھے آ کر جمع ہوئے ہیں۔ جن کے سینوں میں تلاطم اور نظروں میں بجلی ہے۔ درودیوار بیٹھ گئے ہیں اور انقلاب نے پرچم کھول دیا ہے۔ مختصر یہ کہ اس نظم کے حوالے سے جوش نے جذبہ حریت کی ہیجان انگیزیوں اور ولولہ خیزیوں کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔

آپ نے اپنی نظم ''انسانیت کا کورس'' میں بھی ملک کی عظمت اور اپنے جذبہ حب الوطنی کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ اس نظم کے حوالے سے نوجوانوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے میں آپ کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس پوری نظم میں شاعر کی گرم جوشی امنگ اور حوصلہ قارئین کو کافی متاثر کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس نظم کے حوالے سے جوش نے آزادی کا حسین تصور اور بھرپور یقین کا جس طرح اعلان کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ نظم میں موجود سرشاری نشاط اور حوصلہ مندی ہمیں کافی متاثر کرتی ہیں۔ نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو　　　بہادرو ختم ہوئیں بڑھے چلو؟
یہ ماہ ہے یہ مہر ہے یہ کہکشاں بڑھے چلو　　　لئے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو
ابھی نشان ملا نہیں ہے منزل نجات کا　　　ابھی تو دن کے ولولے میں غلغلہ ہے رات کا

مختصر یہ کہ آزادی کے ترانے چھیڑنے والے یہ پہلے شاعر ہیں جن کی باغیانہ تڑپ سب سے الگ تھی۔ جس کی بنیاد پر انہیں شاعر انقلاب کہا گیا۔ آپ کے متعلق یہ بھی کہا جائے گا کہ جس مجاہدانہ جوش و خروش سے انقلاب کی دعوت دی وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ آپ کے لہجے میں مردانگی، شکوہ، بلند آہنگی اور طنطنہ ہے۔ آپ کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی کے سلسلے سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہندوستانی تہذیب وثقافت کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ آپ کی شخصیت ایک محبت وطن کی حیثیت سے بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ جوش اپنے وطن ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے آپ کی اس خواہش کو اتحاد اور یکجہتی سے لبریز کئی نظموں میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آپ ملک کے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اٹھ اے ندیم کہ رنگ جہاں بدل ڈالیں　　　زمیں کو تازہ کریں آسماں بدل ڈالیں

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی　　　جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

اس سلسلے سے ملکوں کا رجز، ماتم آزادی، سرود وخروش، نظام نو، وفاداران ازلی کا پیام، بادشاہ کی سواری، حرف آخر اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام بہترین نظمیں ہیں جن سے آپ کی جذبہ حب الوطنی صاف عیاں ہے۔ مختصر یہ کہ آپ نے اپنی شاعری کے حوالے سے خاک وطن سے دلچسپی تاریخ وطن پر فخر اور مختلف قوموں کے اتحاد ونفاق کی تائید کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ اس سلسلے سے ڈاکٹر عبدالمغنی فرماتے ہیں :





''جوش کی شاعری کا سماجی پہلو بہت اہم ہے۔ وہ طبعاً انسان دوست ہیں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا شدید احساس رکھتے ہیں حریت، مساوات اور اخوت کے اصول ان کو بے حد عزیز ہیں۔ وہ انسانی سماج سے ظلم و زیادتی مفاد پرستی اور بدعنوانی کو دور کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے بڑے سے بڑے فرعون سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہیں۔''

(جوش ملیح آبادی، تنقیدی جائزہ، خلیق انجم، ص-۱۱۹)

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا جوش کی حب الوطنی مستحکم تھی۔ ملک کی سماجی اور سیاسی صورت حال سے ان کا دل کافی افسردہ تھا جس کا اظہار آپ نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ اس اظہار میں آپ کی وطن دوستی صاف طور سے جلوہ نما ہے۔

**Dr. Afshan Nigar Ajmal**
Head, Deptt. of Urdu
D. S. W. Evening College
Sohsarai, Biharshareef
Nalanda
Mob. - 98701 599466

دبستان غالب کا ایک اہم فنکار
ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال کی نئی کتاب
''عشرت گیاوی : حیات و شاعری''
صفحات : ۳۳۶　　سن اشاعت : ۲۰۱۹ء　　قیمت : ۳۵۰روپے
ملنے کا پتہ :
آستانۂ حق روڈ نمبر : ۱۰
نیو کریم گنج، گیا : 823 001
رابطہ : 94300 92930

ڈاکٹر سائرہ بانو

# منفرد فکر و اسلوب کا شاعر : فراقؔ

دورِ جدید کا غزل گو شاعر فراقؔ گورکھپوری آسمان ادب پر وہ درخشندہ ستارہ ہے، جس کی آب و تاب معاصرین غزل کو بھی روشن کرتے ہیں اور خصوصاً متاخرین غزل پر بھی ضیاباریاں کرتی نظر آتی ہے۔ غرض جدید اردو غزل کی روایت میں فراقؔ کا نام نہایت بلند اور معتبر ہے۔ انہوں نے غزل کو جو رنگ و آہنگ عطا کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے منفرد فکر و اسلوب سے غزل کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ کیونکہ فراق نے جس دور میں شاعری کی ہے اس دور میں غزل کی صنف پر ہر چہار جانب سے حملے ہو رہے تھے۔ غزلوں کو لعنت و ملامت کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد اور ان کے ہم خیال ناقدین پیش پیش تھے۔ لیکن انہوں نے بھی فراقؔ گورکھپوری کو غزل کا شاعر تسلیم کیا اور ان کی غزلوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کا دل زخمی ہے۔ ان کی آواز میں بھی درد ہے اور ان کی غزلوں میں ایک شیرینی اور دھیمی آواز سنائی دیتی ہے۔ جو بہت سارے معاصرین فراقؔ میں نہیں ہے۔ بہرکیف فراقؔ گورکھپوری کی غزلوں میں احساسات کی لطافت، جذبات کی شدت اور حسن اظہار کی ندرت کے ساتھ ساتھ نازک خیالی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جمالیاتی پہلو بہت گہرا اور واضح ہے۔ انہوں نے اپنے لطافت احساس اور جذبات کی شدت کو اس قدر ماہرانہ انداز میں پیش کیا اور اس نزاکت اسلوب سے پیش کیا ہے کہ ان کے اشعار اپنے خصوصیات کی بلند ترین حد تک پرواز کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی ان تمام خصوصیات سے مالا مال ہے۔ جو دیگر غزل گو شعراء کے یہاں مشکل سے ملیں گی اور بہتوں کے یہاں تو عنقا ہیں۔ انہوں نے اپنے افکار و خیالات کی جو دنیا غزلوں میں تعمیر کی ہے وہ نہایت حسین و دلنشیں ہے۔ ان کے اشعار میں سطحیت پسندی نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں حسن اور عشق دونوں اپنے روایتی معنی کے حدود کو تجاوز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد و محقق عزیز احمد کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

> ''لیکن فراقؔ کے یہاں محبت اور عشق کا صرف جنسی پہلو نہیں اجاگر ہوتا بلکہ وہ حسن، عشق، محبت، جنون اور حیات کے الفاظ اشارتی معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں اور ایسے موقعوں پر عام طور پر فراقؔ حسن و عشق سے شعوری یا جذباتی قوتیں اور تاثرات مراد لیتے ہیں۔ جو انسانیت کی تعمیر کر رہے ہیں۔''
>
> (فراقؔ اور غزل کا اسلوب، عزیز احمد، ص ۷۸)

ISSN : 2582 - 3612



فراقؔ کے خطوط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ موصوف حسن پرست ہیں، عشق و محبت میں وہ پاکیزگی و طہارت کو پیش پیش رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی کوشش رہتی ہے کہ وہ تخلیق فضا اور زبان و بیان میں عالمگیر لہجہ اختیار کریں اور اس سلسلے میں آفاقیت کا رنگ ابھر کر سامنے آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ فنی محاسن آئیں تو وہ بھی انہیں صفات اور مقاصد کو واضح کرنے کے لئے استعمال ہوں۔ اس طرح موصوف اپنے عشقیہ ادب کو بلند درجہ عطا کر کے آفاقی ادب میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر پل ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ عشقیہ شاعری کو زندگی کا بلند معیار بنا کر پیش کریں اس عمل سے ہمارا ادب و ثقافت بلند و پاکیزہ ہو جائے اور ان کی شاعری بھی بلند مرتبہ و مقام کی حامل ہو جائے۔

فراقؔ کا نظریہ زندگی کے متعلق بہت عمدہ ہے اور وہ حیات و کائنات سے بھی بے انتہا انسلاک رکھتے ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش ہوتی ہے کہ حیات و کائنات کو حسین سے حسین بنایا جائے۔ اس لئے فراقؔ کے یہاں عشق ایک قوت ہے اور حسن بھی ایک قوت ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''ان (فراقؔ) کے یہاں عشق ایک معمولی سا جذبہ ہی نہیں ایک پورے جذباتی اور جسمانی نظام کی حیثیت سے سامنے آتا ہے یہی سبب ہے کہ وہ اس سلسلے میں جن محسوسات کو پیش کرتے ہیں ان میں بڑی وسعت اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا عشق محض تسکین و ستائش یا شکوہ و شکایت کا دفتر ہی نہیں ہے۔ اس میں زندگی بسر کرنے کی خواہش اور آرزو کی ایک لغزش مستانہ بھی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے بے راہ روی سے تعبیر کیا جائے۔ اس میں تو بڑا متوازن انداز ملتا ہے اور اس متوازن انداز میں انسانی مزاج کی رنگارنگی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔''
>
> (فراقؔ اور غزل کا اسلوب، مضمون نگاری، عبادت بریلوی، ص ۲۶۱/۲۶۲)

فراقؔ کی غزل گوئی حیات و کائنات کی لامحدود معنویت کو نئے نئے انداز و اسلوب میں اپنے اندر سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کو حسین بنانے کا پیغام اور ہنر سکھاتی ہے ان کی غزلوں میں زندگی کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی نئی جمالیات کا پرتو واضح نظر آتا ہے۔ انہوں نے غزل کی روایت کو ایک نیا رنگ دیا ہے بلکہ غزلوں میں اَن گنت حقائق کی نشاندہی کر کے غزلوں کو ایک نیا روپ دیا ہے انہوں نے زندگی کو نئے نئے زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

تیرے جمال کی دو شیزگی نکھر آئی ۔۔۔ ذرا وصال کے بعد آئینہ دیکھ اے دوست

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

تو ایک تھا میرے اشعار میں ہزار ہوا      اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

تیرا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست      وصال کو میری دنیائے آرزو نہ بنا

اے حسن یار سوچ کہ دنیا بدل گئی      اب اس قدر نہ ہوش نہ اس درجہ مستیاں

وہ سوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا      اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بیگانہ

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست      وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

جو کچھ بھی کہیں تیری محبت      انسان بنا کے چھوڑتی ہے

ایک مدت سے تیری یاد آئی نہ ہمیں      اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

فراقؔ کی غزلوں میں عشق ومحبت بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اسی پہلو کے مختلف انواع واقسام ان کی شاعری میں جگہ پاتے نظر آتے ہیں موصوف نے انفرادی تجربات ومشاہدات کوموضوع سخن بنایا ہے۔لیکن اجتماعی زندگی کے معاملات ومسائل کوبھی نہایت خوبصورت انداز میں اپنی غزلوں میں سمیٹا ہے۔یہاں بھی ان کا تجدیدی نقطہ نظر نہایت ہنرمندی سے موضوع کو نئے رنگ وآہنگ عطا کرتا ہے۔انہوں نے اجتماعی زندگی کے محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور زندگی کوخوشگوار بنانے کی تمنا بھی کرتے ہیں۔اس عمل میں ان کے افکارواسلوب نہایت بالیدہ اور لطیف ہوجاتے ہیں۔جس کی بنیاد انسانیت دوستی ہے۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی کیا ہے آج اے دوست      سوچ لیں اور اداس ہوجائیں
بہت لطیف اشارے ہیں دور حاضر کے      کچھ آج اہلِ سکوں بھی ہیں تلملائے ہوئے
قفس والوں کی بھی کیا زندگی ہے      چمن دور، آستاں دور، آسماں دور
چمکتے دور، کھلے چہرے، مسکراتے اشک      سجائی جائیں گی اب طرزِ نو سے بزم حیات

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا      ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

غم حیات وہی دور کائنات وہی      جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

فراقؔ جدید اردو غزل کے عظیم شاعر تسلیم کئے جا چکے ہیں۔انہوں نے اپنی فکر جدید سے غزل کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ان کے اسلوب بیان میں ایک دل نشیں شیرینی ہے۔جو ذہن ودل پر اثر کاری کرتی ہے۔ان کی غزلوں میں

ISSN : 2582 - 3612



فکرنو کی پیکر تراشی اپنے مخصوص اسلوب میں نمایاں ہوتی ہے۔انہوں نے حسن وعشق کے روایتی اور پامال موضوع کوایک نئی آن بان اور جان بخشی ہے۔ان کے فکرواحساس کی لطافتیں ان کے غزل کے اسلوب کو گراں قدر بناتی ہیں۔ان کے عشقیہ تصورات ایک صحت منداور اخلاقی رجحان پیش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ولی احمدولی کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''عصر حاضر کے غزل نگار شعراء میں فراقؔ گورکھپوری امتیازی مرتبہ کے حامل ہیں۔ جدید ایوان شاعری میں ان کا آہنگ سب سے منفرد اور جداگانہ ہے۔..........فراقؔ کی شاعری میں نئے مزاج عصر جدید کے طرزِ احساس کی آئینہ سامانی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کے کلاسیکی قدروں سے گہری وابستگی کا شعور بھی ملتا ہے انہوں نے فکرواحساس کی نئی پیکر تراشی میں روایتی رنگ وآہنگ سے استفادہ کیا ہے۔''

(فراقؔ اور غزل کا اسلوب مرتبہ ڈاکٹر منظر اعجاز ،مضمون نگار: ولی احمد ولی ص ۲۱۸)

فراقؔ گورکھپوری کی غزل گوئی اپنی فکر اور اسلوب بیان کے اعتبار سے منفرد وممتاز رہی ہے۔ان کی شاعری میں عظیم شاعروں کے تمام خدوخال نظر آتے ہیں۔اس لئے انہیں عظیم المرتبت غزل گوشاعر کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ان کی غزلوں میں جو رنگ وآہنگ، کیف وکم، لب ولہجہ، سوز وگداز، اور حسیت پائی جاتی ہے وہ پورے عصر کے لئے ایک مثالی اور نمونہ ہے۔آج کی موجودہ شاعری میں موصوف کی شاعری کے جملہ خصوصیات اخذ کئے جارہے ہیں۔اس سلسلے میں حسن عسکری کے خیالات ملاحظہ فرمائیں :

''اب جو غزلیں لکھی جارہی ہیں ان میں فراقؔ کا دیا ہوا طرز احساس گونجتا ہے۔فراقؔ کے محاورے سنائی دیتے ہیں۔فراقؔ کی آواز لرزتی ہے..........بالکل اسی طرح جیسے غزل گوشعراء کے یہاں میرؔ اور غالبؔ کا احساس اور محاورہ جابجا لپک اٹھتا ہے۔ پچھلے تین چار سال میں اردو غزل کا احیا ہوا ہے۔وہ ۷۵ رفیصدی فراقؔ کا مرہون منت ہے۔فراقؔ کی شاعری نے اردو میں ایک ادارے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔''

(فراقؔ اور غزل کا اسلوب۔مرتبہ،منظر اعجاز،مضمون نگار، حسن عسکری، ص ۸۵)

مختصر یہ کہ فراقؔ گورکھپوری نے اردو غزل گوئی کو ایک نئی فکر نیا اسلوب، نئی آواز، نیا لہجہ، نیا طرز احساس، نئی قوت اِدراک اور نئی زبان شعری عطا کیا ہے۔اس طرح ان کی غزل گوئی فقید المثال اور وحید العصر کہلانے کی مستحق ہوگئی ہے۔

**Dr. Saira Bano**
Astt. Teacher
Bihar Modern School, Garhper,
Biharshareef, Nalanda
Mob. - 98354 87695

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

# SHEODENI RAM AYODHYA PRASAD COLLEGE

Bara Chakia, East Champaran - 845412
(A Constituent Unit of B. R. A. Bihar University, Muzaffarpur)
NAAC Grade - B

Website : www.srapcollege.co.in
Email. : sheodeniram1969@gmail.com
srapcollege@gmail.com
Phone/Fax : 06257 - 243139

**Salient Features :**

1. Co- Education facility
2. Permanent Affiliation in all subjects of Intermadiate level i.e. I.A, I.Sc. & I.Com.
3. Permanent Affiliation in all subjects at Graduation level i.e.B.A.(Hon's), B. Sc. (Hon's) & B. Com.(Hon's)
4. Three years duration B.C.A.(Vocational) course is also taught.
5. A team of experienced teachers for imparting education.
6. Well equipped smart class.
7. Well equipped laboratory & a good library.
8. Splendid play ground.
9. well equipped Seminar Hall.
10. Facilities of electricity, fan and furniture along with girl's Common room.
11. Drinking water points and toilets.
12. Centre for Practical and various Competitive examinations.

**Prof. (Dr.) Md. Shafique Alam**

(Principal)

ISSN : 2582 - 3612



شاہ نوازخان نمکین

# پریم چند کے فکشن کا اسلوب

لفظ ''اسلوب'' عربی زبان کا لفظ ہے اس کے مترادف الفاظ ہیں طرز، طور، طریقہ، انداز، صورت، روش وغیرہ۔ انگریزی لفظ Style اور ہندی لفظ شیلی اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق اس کا ماخذ لاطینی لفظ **Stylus** ہے جس کے معنی ہیں قلم، قلم سے، قلم کے استعمال کا ڈھنگ وغیرہ۔ عام بول چال میں اسلوب سے مراد کام کرنے کے ڈھنگ سے ہے۔ عموماً ہر شخص اپنے ڈھنگ سے کام کرتا ہے اور یہی ڈھنگ اس شخص کا اسلوب کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی منتخب موضوع کے تحت ایک ہی عنوان پر مختلف مقررین ایک طرح کی باتوں کو پیش کرتے ہیں مگر فرق صرف ان کے انداز میں ہوتا ہے یعنی ہر مقرر اپنے اپنے طریقے سے تقریر کرتا ہے۔ اسی طرح انفرادی طرزِ تحریر سے ہی کسی تخلیق کار کی شناخت ہوتی ہے۔ دراصل اسلوب ایک ایسی شئے ہے جس بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ غالب کا انداز ہے، یہ آزاد کا رنگ ہے، یہ میر کا ڈھنگ ہے، یہ سر سید کا طریقہ ہے، یہ میر امن کا طرز ہے یا یہ پریم چند کا اسلوب ہے وغیرہ۔

مشہور فرانسیسی عالم و دانشور بفن (Buffon) کا قول ہے "Style is the man himself" یعنی 'اسلوب بذات خود انسان ہے'۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی ہیں ان کے مطابق ''اسلوب مصنف کی تمام زندگی کا عکس ہوتا ہے'۔ ارسطو کا خیال ہے کہ ''زبان میں معجزے کا امتزاج پیدا ہوتا ہے'۔ مشہور امریکی ماہر لسانیات چارلس ایف ہوکیٹ (Charless F. Hocket) کے لفظوں میں 'ایک ہی زبان کے دو فقرے یا جملے ایک ہی معنی یا مفہوم ادا کرتے ہوں لیکن جب اپنی لسانی ساخت کے اعتبار سے مختلف ہوں تو کہا جائے گا کہ ان کے اسلوب میں فرق ہے'۔ اردو کے مشہور و معروف ناقد اور افسانہ نگار اختر اورینوی کے مطابق 'طرز یا اسلوب چیزوں کو کسی خاص ڈھنگ میں برتنے کا نام ہے جو مختلف صنفوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے اور فن پاروں و فن کار کو ممیّز و ممتاز بناتا ہے'۔ عالمی سطح کے شہرت یافتہ ادیب براؤن نے اسلوب کی تعریف کو واضح کرنے کے لئے کہا ہے کہ 'اسلوب مصنف کی اتنی اپنی ہوتی ہے جتنی ان کی انگلی کی چھاپ' گریئی نے بھی کچھ اسی طرح کہا ہے کہ 'اسلوب مصنف کی شخصیت کا اٹوٹ اور بے حد مربوط عنصر ہے' مذکورہ اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلوب میں شخصیت جھلکتی ہے۔

مذکورہ بالا آراء کی روشنی میں پریم چند کی تخلیقات کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ان کا سلوب ہی انہیں دوسرے قلم کاروں سے ممیّز کرتا ہے۔ ان کی تحریروں کا اہم وصف ان کا اسلوب بھی ہے۔ انہوں نے تقریباً تین سو سے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

زائد افسانے، چودہ ناول، تین ڈرامے اور کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان کا فکری شعور اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کے فکشن کے موضوعات سے عوام بہت متاثر ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی فن کار کو شہرت اور مقبولیت دلانے میں موضوع یا اسلوب کا اہم رول ہوتا ہے۔ پریم چند ایک ایسے فن کار ہیں جنہیں یگانۂ روزگار بنانے میں موضوع اور اسلوب دونوں کا ہاتھ ہے۔ ایک طرف انہوں نے دیہی زندگی اور متوسط و ادنیٰ طبقات کی زندگی کو موضوعِ سخن بنا کر قارئین کے دل و ذہن کو جیت لیا تو دوسری طرف سادہ سلیس زبان اور عوامی لب ولہجہ اپنا کر ادبی دنیا میں ایک الگ شناخت قائم کی۔

پریم چند کا تعلق اس دور سے ہے جب اکثر و بیشتر نثر نگار تخیل کی جہاں آباد کرنے، مقفیٰ و مسجع الفاظ استعمال کرنے، رومانی فضا تیار کرنے اور صنائع وبدائع سے کام لینے پر اعتماد رکھتے تھے۔ یعنی بیشتر ادیب لطف اور دلکشی کے سہارے عوام الناس کو متاثر کرنے میں لگے تھے۔ لہٰذا پریم چند کے یہاں بھی زمانے کے کچھ اثرات ہیں۔ اس بات کی صداقت کے لئے ان کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں :

''وہ کافر ادا تھی، قاتل تھی اور اپنے کشتگان ناز کی درد بھری داستانیں جب چشم پرنم سے کہتی تو شاید کشتوں کی روحیں عالم زریں یا عالم بالا میں وجد کرتی ہیں۔''

(افسانہ 'وفا کی دیوی')

لیکن اس طرح کی زبان ان کی کچھ ایک تحریروں میں ہی ملتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے روایتی رجحان اور عصری میلان سے الگ راہ اپنائی۔ دراصل ان کا مزاج، فکر، موضوع اور اسلوب ہم عصر ادباء سے بالکل الگ تھا۔ ان کے سنجیدہ مضامین اور اصلاحی مقاصد کے لئے یہ مناسب تھا کہ سادہ سلیس زبان استعمال کریں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے معاصرین کے برعکس چلتے ہوئے شاعرانہ اور دلکش انداز سے انحراف کیا، حسن کاری سے گریز کیا اور آرائش و زیبائش سے پرہیز کیا۔ جہاں تک ممکن ہوا سماج کی آئینہ داری، بہتر سماج کی تعمیر، اور اصلاح معاشرہ کے لئے سیدھی سادی زبان استعمال کیا۔ ایسا انہوں نے شعوری طور پر کیا ہے۔ جیسا کہ ان کے اس قول سے پتا چلتا ہے :

''میں بات کو سیدھی سادی زبان میں کہہ دیتا ہوں رنگ آمیزی اور انشا پردازی سے قاصر ہوں۔'' (بحوالہ 'اسلوبیاتی تنقید' از طارق سعید۔ ص ۹۰)

اس امر میں پوری سچائی ہے کیونکہ ان کی زبان اور اندازِ بیان دونوں میں سادگی ہے۔ بھلے ہی پریم چند سے پہلے میر امن، سرسیّد، حالی، شبلی اور نذیر احمد جیسے ادیبوں نے عوام کی زبان کو ادبی زبان بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کچھ لوگوں کو چھوڑ کر باقی سبھی لوگ وہی پرانی روش اپنائے ہوئے تھے۔ یعنی عہد پریم چند میں بھی اس بات کی ہوڑ لگی ہوئی تھی کہ کس طرح باتوں کو رنگین پیرائے میں بیان کیا جائے، بات بات پر لطف پیدا کی جائے، شاعرانہ انداز اپنا کر نثر کو دلکش بنایا جائے وغیرہ۔ مگر پریم چند نے ہم عصر ادیبوں سے الگ راہ اپناتے ہوئے میر امن، سرسیّد، حالی، شبلی اور نذیر احمد کی روایت کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے باتوں کو اسی زبان میں پیش کیا جس زبان میں عوام بات چیت کرتے ہیں۔ ان کی





سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے روزمرہ کے عام بال چال کی زبان کو ادبی زبان بنا کر پیش کیا۔ اردو کے افسانوی ادب میں یہ روایت قائم ہونا پریم چند کا ہی مرہونِ منّت ہے۔ ان کے اسلوب کے دیگر پہلوؤں میں منظر نگاری، مکالمہ نگاری، متضاد الفاظ کا استعمال اور الفاظ کی تکرار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب میں پریم چند کی منظر نگاری اپنے آپ میں ایک عمدہ مثال ہے۔ پریم چند منظر نگاری میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی کا اندازہ ان کے درج ذیل سطور سے لگایا جاسکتا ہے :

''موسم سرما کی تاریک رات تھی، سیاہ بادلوں نے رات کی تاریکی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ درختوں کی آڑ میں سنسان سڑک پر وہ مسافر اکیلا جا رہا تھا۔''

(افسانہ 'مسافر')

ان کے ناولوں میں بھی خوبصورت مکالمے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ قصّہ میں تجسّس برقرار رکھنے کے غرض سے کرداروں کے درمیان سوال جواب بھی کرواتے ہیں۔ اور ان کی گفتگو میں ڈرامائی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ایک مثال پیش خدمت ہے :

''ونئے : تمہیں صوفیہ کا پتا معلوم ہے؟

اندروت : نہیں

ونئے : جھوٹ بولتے ہو

اندروت : ہو سکتا ہے

ونئے : تمہیں بتانا پڑے گا

اندروت :۔ آپ کو اب مجھ سے پوچھنے کا حق نہیں رہا، آپ کا یا دربار کا مقصد پورا کرنے میں، میں دوسروں کی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ آپ نے ایک بار دغا کی ہے اور پھر کر سکتے ہو۔''

(ناول 'چوگان ہستی')

ان کے مکالموں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں کہ :

''ہر طبقے کے نفسیات اور لب ولہجہ اور زبان و بیان سے واقف ہیں اس لئے کرداروں کے مکالموں اور باتوں کو جیوں کا تیوں اصل شکل میں پیش کرتے ہیں۔''

('مطالعات فکشن' از شہاب ظفر اعظمی۔ ص ۶۲)

قصّے کہانیوں کا فطری ہونا لازمی ہے۔ اور قصّے کہانیوں میں فطری پن پیدا کرنے کے لئے مکالموں کا فطری ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر مکالمے فطری ہوں تو کہانی میں صداقت جھلکتی ہے۔ پریم چند کی کہانیوں کے مکالموں میں

فطری رنگ وآہنگ ہے جوان کی قدر ومنزلت میں اضافہ کا ذریعہ بنا ہے۔ان کے مکالمے کس حد تک فطری ہیں اسے اس نمونے سے سمجھا جاسکتا ہے :

''تو مرجا، تیری مٹی نکلے، تیری لاش نکلے، تجھے بھوانی کھائے، تجھے مرگی آئے۔''

(افسانہ 'مزارآتشیں')

جملوں اور فقروں کے درمیان دو متضاد الفاظ استعمال کرکے بھی انہیں خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔پریم چند نے بھی متضاد الفاظ استعمال کراپنے جملوں اور فکروں کو خوبصورت بنایا ہے اور اپنی تحریروں میں جان ڈالنے کا کام کیا ہے۔ایک نمونہ پیش خدمت ہے :

''بھورے نے تشکرانہ حقارت سے اس کی طرف دیکھا''

(بحوالہ 'مطالعات فکشن'۔ازشہاب ظفر اعظمی۔ص ۶۰)

الفاظ کی تکرار سے بھی جملوں کی دلکشی میں اضافہ کیا جاتا ہے۔دوسرے ادباء کی مانند پریم چند نے بھی ایسے تجربے کیے ہیں انہوں نے الفاظ کی تکرار سے بھی اپنی تحریروں کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔تکرار الفاظ کی ایک عمدہ مثال ملاحظہ فرمائیں :

''ان کی نگاہوں میں کتنی پیاس تھی، کتنا اشتیاق تھا، کتنی التجا تھی۔''

(بحوالہ 'مطالعات فکشن'۔ازشہاب ظفر اعظمی۔ص ۶۰)

پریم چند ذولسان ادیب تھے۔اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں قدرت رکھتے تھے۔اس کے علاوہ انہیں سنسکرت وفارسی سے اچھی طرح شغف حاصل تھا۔یعنی انہیں ان تمام زبانوں کے لفظیات سے واقفیت تھی۔لہٰذا اپنی اردو تحریروں میں ہندی اور ہندی تحریروں میں اردو شامل کردیتے ہیں ساتھ ہی اپنی دونوں تحریروں میں جگہ جگہ فارسی اور ہندی کے الفاظ بھی ڈال دیتے ہیں لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔یہاں تک ہندی اور فارسی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کرجاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں۔ان کی زبان کے تعلق سے پرکاش چندرگپت فرماتے ہیں :

''ایسی زبان جو معمولی سی ردوبدل کے ساتھ ہندی بھی ہے اور اردو بھی۔ان کی زبان اس ندی کی مانند ہے جو اپنے بہاؤ میں کسی رکاوٹ یا حائل چیز کی پرواہ نہیں کرتی۔''

('پریم چند'۔ازپرکاش چندرگپت۔ص ۱۱۲)

بعض ادیبوں کی مانند انہوں نے بھی بے ساختگی اور بے باکی سے حقائق کو ظاہر کیا ہے لیکن تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔انہوں نے جنسی مسائل کو بھی اٹھایا ہے لیکن باتوں کو اس طرح پردے میں پیش کرتے ہیں کہ عریانیت اور فحش نگاری کی بوتک نہیں آتی۔مثال کے طور پر ان کا ناول ''نرملا'' اور افسانہ ''نئی بیوی'' کو لے لیجیے۔یہ ان کے تخلیقی شعور کی اعلیٰ مثالیں ہیں جو ان کے اسلوب کا کمال ہے۔

ISSN : 2582 - 3612



پریم چند کے اسلوب میں ان کی شخصیت کی جھلک اسی طرح نظر آتی ہے جس طرح ان کے پیش رو چند بڑے ادیبوں کی تحریروں میں دیکھی گئی ہے۔لہٰذا **ڈاکٹر قمر رئیس** یوں رقمطراز ہیں :

''سرسید، حالی اور شبلی کے بعد اگر کسی کا طرز تحریر اس کی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔''

('پریم چند بحیثیت ناول نگار'۔ازقمر رئیس۔ص ۱۱۹)

ان کے اسلوب کے متعلق پرکاش چندرگپت کن الفاظ اظہار خیال کرتے ہیں ملاحظہ کریں :۔

''پریم چند نے ایک سادہ سلیس، لچک دار اور طاقتور اسلوب وضع کیا ہے۔''

('پریم چند'۔ازپرکاش چندرگپت۔ص ۱۱۲)

ان کی تحریروں کی سادگی کے عزیز احمد بھی قائل ہیں۔لہٰذا ان کے اسلوب کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ :

''ان کے اسلوب کی بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ان کی زبان حتی الامکان آرائشوں سے پاک ہے۔''

('ترقی پسند ادب'۔ازعزیز احمد۔ص ۲۴۸)

پریم چند کا فکشن نہ صرف مواد اور موضوع کے اعتبار سے عوام کی زندگی سے قریب نظر آتا ہے بلکہ زبان وبیان اور لب ولہجہ کے لحاظ سے بھی عوام کے قریب تر ثابت ہوتا ہے۔جبکہ ان کے عہد کے دیگر ادباء تخیل کی جہاں آباد کرنے، شاعرانہ انداز اپنانے اور رنگین پیرائے کی نثر لکھنے میں لگے تھے۔چونکہ پریم چند کے اصلاحی مقصد کے لئے سادہ اور سلیس اسلوب ہی موزوں تھا۔لہٰذا انہوں نے اس وقت کے تمام مروجہ علمی وادبی اسالیب سے انحراف کرتے ہوئے عوامی لب ولہجہ کو ذریعہ اظہار بناتے ہوئے سادہ نگاری کو ادب میں فروغ دیا۔یعنی عوام کی بول چال کے انداز کو ادب کا اسلوب میر امن نے پہلی بار بنایا تھا اور سرسید نے اسے آگے بڑھایا تھا تو پریم چند نے اسے پروان چڑھایا۔اور یہی اسلوب پریم چند کے فکشن کی خاص شناخت ہے۔مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف ان کے فکشن کو ان کی حقیقت نگاری، فکری گہرائی، اور تخلیقی بصیرت نے بلند وبالا بنایا ہے تو دوسری طرف ان کے اسلوب نے اس میں چار چاند لگایا ہے۔لہٰذا اگر انداز پیش کش سے تحریر خوبصورت بنتی ہے تو سادگی ہی پریم چند کی تحریروں کی خوبصورتی ہے۔

**Shahnawaz Khan Namkeen**
Research Scholar (VBU)
Guest Faculty
Department of Urdu
Chatra College, Chatra
Jharkhand
Mob. - 95721 13558

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر محمد رضوان

# اقبال کی فکر پر مولانا رومیؒ کے اثرات

علامہ اقبال اردو زبان وادب کے مفکر شاعر ہیں۔ وہ اس پر ساری زندگی اصرار کرتے رہے کہ میں شاعر نہیں مفکر ہوں اور اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے افکار وخیالات اپنی قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ گویا انھیں اپنی شاعری سے زیادہ اپنے فلسفے پر ناز تھا اور یہ ناز کچھ بے جا بھی نہیں۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی فلسفہ ان کا محبوب مضمون رہا۔ رفتہ رفتہ اقبال کی فکر متعدد سرچشموں سے سیراب ہوتی رہی۔ کچھ اہم مفکرین جن سے انہوں نے فیض اٹھایا ان کے نام ہیں: شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانیؒ ،مولانا جلال الدین محمد رومیؒ ،گوئٹے ، برگساں ، نیٹشے وغیرہ۔ لیکن فی الوقت میں یہاں ''اقبال کی فکر پر مولانا رومؒ کے اثرات'' پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی حقیر کوشش کر رہا ہوں۔ علامہ اقبال کو مولانا رومیؒ سے ایک خاص طرح کا جذباتی اور والہانہ عقیدت تھی جس کی بنیاد پر انہوں نے کبھی انہیں ''پیر رومی'' اور کبھی ''مرشد رومی'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ اسی مرد بزرگ کے فیض سے علم کے سربستہ راز اُن پر فاش ہوئے اور انہی کے کرم سے یہ خاک اکسیر بن گئی۔ یہ فارسی شعر ملاحظہ ہوں ؎

باز بر خوانم زفیض پیر روم	دفتر سر بستہ اسرار علوم
پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد	ازغبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

ایک اردو شعر میں رومیؒ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش	لاکھ حکیم سر بہ جیب ،ایک کلیم سر بہ کف

کلام اقبال کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر کو مولانا رومؒ سے کیسی بے پناہ عقیدت تھی۔ اقبال نے رومیؒ کے خیالات سے بے حد فیض اٹھایا اور جا بجا ان کے خیالات واحساسات کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا۔ اقبال کسی اور شاعر یا مفکر کے اتنے زیر بارِ احسان نہیں جتنے رومیؒ کے۔

اقبال کے فکر وشعور میں جس انداز سے بالیدگی اور پختگی آئی اسی طرح رومیؒ سے ان کا فکری ار تباط گہرا اور پختہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اقبال نے رومیؒ کو اپنا پیر معنوی اور سر افلاک کا رہنما متصور کر لیا۔ رومیؒ کی شخصیت میں موجود علم وعرفان کی روشنی پگھل کر مابعد الطبیعاتی نظامِ فکر اور تصوف کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ یہی سانچا متشکل ہو کر اقبال کے ذہن ودماغ میں سرایت کر گیا۔ چنانچہ وہ ''بانگ درا'' کی





ایک نظم ''گل پژمردہ'' میں پیر رومیؒ کے نظریات وخیالات سے متأثر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ؎

ہم چو نے از نیستان خود حکایت می کنم	بشنو از گل !جدائی ہا شکایت می کنم

درج بالا شعر رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

بشنو از چوں حکایت می کند	وز جدائی ہا شکایت می کند

اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور ''بانگ درا'' کے حصہ اوّل میں رومیؒ کے متصوفانہ فکر وخیال کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہیں پر اقبال نے وحدت الوجود کے نظریے کو نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس منزل پر رومیؒ اور اقبال کا فکری رابطہ نہایت مضبوط ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ عقل وخرد میں مادیت کے غلبے کی وجہ جو خرابیاں پیدا ہو گئے ہیں وہ صرف آتش رومیؒ کے سوز سے حل کیے جا سکتے ہیں ؎

علاج آتش رومیؒ کے سوز میں ہے تیرا	تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اقبال رومیؒ کے افکار وفلسفے کے وسیلے سے زندگی اور کائنات کے اسرار ورموز کی پردہ کشائی میں کامیاب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انگلستان سے واپسی کے بعد اقبال کے فکر وفلسفے پر تصور عشق یا خودی کا تصوّر غالب نظر آتا ہے۔ فکر کے اس نئے سفر میں رومیؒ نے ہی ان کی سچی رہنمائی کی ہے۔ مولانا رومیؒ کے نظام فکر میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا تصور عشق رسمی عشق کے تصوّر سے جداگانہ ہے۔ ان کے یہاں عشق کا مفہوم ہے اپنی پسندیدہ شئے کے حصول کی شدید خواہش اور اس کے لئے دیوانہ وار کوشش۔ اس عشق کے بغیر زندگی کی تکمیل ممکن نہیں اور نہ اس کے بغیر انسان ترقی کے مدارج طے کر کے کامل انسان بن سکتا ہے۔ چنانچہ یہ عشق زندگی کا زبردست محرک عمل ہے اور انسان کے لئے تسخیر فطرت کو ممکن بنا دیتا ہے۔ زندگی میں عشق کی اہمیت اور عقل کی نارسائی کو اقبال نے رومیؒ سے سمجھا- ان کا تصور عشق رومیؒ کا مرہون منت ہے- انہوں نے رومیؒ کے تصور عشق کی مرکزیت کو اپنی مشہور نظم ''مسجد قرطبہ'' میں انتہائی سلیقے سے معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے ؎

عشق دم جبرئیل ، عشق دم مصطفیٰ	عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تاب ناک	عشق صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام
عشق ہے فقیہِ حرم ، عشق امیر جنود	عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات	عشق سے نور حیات ، عشق ہے نارِ حیات

اقبال اور رومیؒ کے تصور عشق کے متعلق پروفیسر اسلوب احمد انصاری فرماتے ہیں :

'' رومیؒ اور اقبال دونوں کے لیے عشق ایک آفاقی (Comic) جذبہ ہے جس کا سرچشمہ انائے لامحدود (Infinite Ego) ہے اور یہ لا

> محدود انا ذی روح ذرات (Monads) کے اس کائنات میں پوری
> طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔''

رومیؒ تقدیر کے روایتی تصور کے قائل نہ تھے۔ وہ انسان کو مجبور نہیں مختار مانتے تھے اوران کا عقیدہ تھا کہ جہد وعمل سے انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ رومیؒ کے زمانے میں تقدیر پرستی عام تھی جس نے مسلمانوں سے قوت عمل چھین لی تھی۔ یہی صورت اقبال کے زمانے میں پیش آئی۔ چنانچہ انہوں نے رومیؒ کا نقطۂ نظر اختیار کیا اور مسلمانوں کو بے عملی سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

رومیؒ کے نزدیک انسان ایک ناچیز ذرّہ نہیں بلکہ ایک بلندرتبہ ہستی ہے۔ مگر اسے اپنی عظمت کا احساس نہیں۔ اگر وہ اپنے مرتبہ ومقام سے باخبر ہوجائے اور احساسِ کمتری سے نجات پالے تو سارا عالم اس کے زیر فرماں ہو۔ یہی تصوّر فلسفۂ خودی کی اساس ہے اور اقبال نے یہ فلسفہ نیٹشے سے نہیں رومیؒ سے لیا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ''جاوید نامہ'' میں خودی کا فلسفہ مولانا رومیؒ کی زبان سے ادا کرایا گیا ہے۔

اقبال کے مختلف نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رومیؒ نے ان کی فکری پیچیدگیوں کو سلجھایا ہے اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں ایک رہنمائی کی ہے۔ ان کو رومیؒ سے ایک جذباتی عقیدت، روحانی قربت اور قلبی محبت تھی جو زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہی۔ اقبال اپنے عہد کے مادّیت زدہ ماحول سے عالم انسانیت کو نجات دلانے کے لیے ہمیشہ رومیؒ کے منتظر رہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؒ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

**Dr.Md. Rizwan**
Post Graduate Teacher
Zakaria Colony (Near Masjid)
Mohalla- Sadpura
P.O:-Ramna
Muzaffarpur-842 002
Mob. - 95250 51905

ISSN : 2582 - 3612



ڈاکٹر مرزا اصبا عالم بیگ

# علامہ اقبالؔ کی شاعری کا کلیدی عنصر

علامہ اقبالؔ کا نام اردو شاعری کے حوالے سے لازوال اور جاوداں ہے۔ اردو ادب میں ان کی شاعری پر جس قدر تحقیق وتنقید ہوئی ہے اس قدر دوسرے کسی شاعر پر نہیں۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہوگیا تھا اور آج بھی ہنوز جاری وساری ہے۔ ان کی زندگی میں بھی ان پر سیمینار ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ برصغیر ہی نہیں پوری اردو آبادی اس کام میں پیش پیش ہے۔ یہ خوش نصیبی ان کے افکار ونظریات کے عالمی نوعیت کے حامل ہونے کی وجہ سے ہے۔ ان کی فکر آفاقی ہے۔ ان کی زندگی ایک مقصد کی اشاعت وتبلیغ رہی ہے۔ انہوں نے پوری زندگی اسی کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ ان کی فکر کسی خطہ ارض کی سرحدوں میں سمٹ نہیں سکتی۔ ان کے افکار ونظریات تمام جغرافیائی حدود کو تجاوز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنے خطہ ارض کے محدود آب وہوا، پھول، پہاڑ، ندیاں، پیڑ، میدان، کھیت، کھلیان، انسان، جانور اور مٹی سے خصوصاً جذباتی عقیدت ومحبت ہے۔ لیکن ان کی یہ محبت مغربی افکار ونظریات کی پروردہ نہیں ہے۔ جس نے پوری دنیا کو گمراہ کر رکھا ہے اور تشدد کی طرف آمادہ کیا ہے۔ ان کا یہ تصور مذہب اسلام سے ماخوذ ہے۔ جو پوری دنیا کے اقوام کی بہتری وبلندی اور ترقی کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''علامہ اقبالؔ شاعر حیات ہیں۔ ان کی شاعری میں بلا کی حیات افروزی اور غضب کا جوش وخروش موجود ہے۔ انہوں نے شاعری کا استعمال ذریعہ ابلاغ اور وسیلہ اظہار کے طور پر کیا ہے۔ علامہ اپنی قوم کی حالت کو یکسر بدل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری کو ولولہ خیز بنا کر قوم کے سامنے پیش کیا تا کہ خوابیدہ قوم خواب گراں سے بیدار ہوجائے۔ اس کا جمود وتعطل ختم ہوجائے۔ اس کی غیرت جگ جائے اور یہ قوم پھر اپنے اسلاف کی طرح باوقار بن کر اقوام عالم پر چھا جائے۔ اس دلی مقصد کو عوام تک پہنچانے کے لئے علامہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

نے اپنی شاعری کا سہارا لیا۔''

(ساغرِ ادبؔ سہ ماہی، مظفر پور: مضمون نگار، ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر، ص ۵۴)

علامہ اقبال کی شاعری مقصدی شاعری ہے۔ انہوں نے اپنے مقصد کے لئے اسے وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ شاعری ان کا پسندیدہ مشغلہ ہرگز نہ تھا لیکن ترسیل وابلاغ کے لئے یہ نہایت موثر ذریعہ تھا۔ اس لئے بزرگوں کے مشوروں پر انہوں نے شاعری کو جاری رکھا۔ لیکن انہوں نے خود کو شاعر کہنا کبھی گوارہ نہیں کیا۔ اس تعلق سے موصوف کے بیانات اور اردو فارسی اشعار اس کے لئے ثبوت کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں ۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز دروں میخانہ

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو — نہ کر خارہ شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

نظر نہیں تو مرے حلقہ سخن میں نہ بیٹھ — کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست — سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

علامہ اقبالؔ نے اپنے حکیمانہ افکار ونظریات کے اظہار کا وسیلہ شاعری کو بنایا دنیا کے بیشتر حکیموں اور فلسفیوں نے بھی اپنے افکار ونظریات کے اظہار کا وسیلہ شاعری کو ہی بنایا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں جو پیغام عام کیا ہے وہ ایک نظام فکر مرتب کرتا ہے۔ اس لئے ان کا اصل مقصد پیغام ہے۔ موصوف کا پیغام انسانیت کی خوبیوں سے آدمی کو مزین وآراستہ کرنا ہے۔ ان کا مقصد ایسی دنیا تعمیر وتشکیل کرنا ہے جس میں حیوانی صفت کا فقدان ہو۔ اسی مفروضے کے تحت ان کی شاعری میں تمام موضوعات کی اہمیت وافادیت قائم ہوتی ہے۔ موصوف دنیا کے قائم کردہ مغربی اصول ونظریات کو اسی لئے مسترد کرتے ہیں جس میں اخلاقی رجحانات ومیلانات کا فقدان ہوتا ہے، اقبال کا تصور انسانی خوبیوں سے تعلق رکھتا ہے اور اسی لئے اقبال خودی کی ترتبیت وتنظیم کے مراحل کی بات کرتے ہیں۔ جن سے انسان کے اندر انسانیت کے اقدار داخل ہو سکیں۔ اسی سلسلے میں ان کے یہاں حرکت وعمل، عقل وعشق، مردمومن جیسے اصطلاحات وضع کئے گئے ہیں۔ اور ان میں کلیدی حیثیت خودی کو حاصل ہے۔ اقبالؔ کے افکار ونظریات کی تفسیر وتاویل پیش کرتے ہوئے مشہور ومعروف ماہر اقبالیات ڈاکٹر منظر اعجاز یوں رقم طراز ہیں :





''یہی اقبال کا تخلیقی تصور ہے جو نہ صرف فکری وفنی نقطہ نظر سے اہم ہے بلکہ سماجی سیاسی افکار کے تناظر میں بھی اور فلسفیانہ، حکیمانہ تصورات کی روشنی میں بھی وقیع اور گراں مایہ ہے۔ اقبال کے خیال میں ہر انسان کا عمل تخلیقی نوعیت کا حامل ہونا چاہئے جو انسانیت کے فروغ کا امکان پیدا کرے اور انسانیت کے فروغ کا امکان اس میں مضمر ہے کہ اس کی خودی مستحکم ہو جائے۔ اس کی فکر کا ہر پہلو عمل خیر کے لئے مہمیز بنے اور اس کے عمل کا ہر زاویہ ذات اور تعمیر کائنات سے عبادت ہو۔ اس کا مقصد انہیں مقصد کا پابند اور اس کی حریت، حریت الٰہی کی دلیل بن جائے۔ چنانچہ انسان اور کائنات فطرت کے دوسرے مظاہر کے مابین اقبال ایک ربط داخلی کا تصور قائم کرتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے کہ انسانی خودی اپنی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے دوسرے مظاہر خودی سے ممیّز اور اعلیٰ وارفع ہے جو اس کے شعور، ارادے اور اعمال وافعال سے ظاہر ہے اور یہی سب ہے کہ وہ دوسری مخلوقات سے عظیم تر ہے اور اس کی ارتقائی کیفیات سے واضح ہے کہ اس کے ارتقا کا مزید امکان موجود ہے۔ چنانچہ انسانی معاشرہ کی تشکیل ایسی ہونی چاہئے جو انسانی خودی کے ارتقا میں معاون ہو نہ کہ ایسا نظام جو انسانوں کو انسانوں کا غلام کر کے اس کے جسم سے اس کی خودی کی روح نچورے؟ چنانچہ اقبال نے اپنی ساری عمر میں اپنے زور قلم کا بہاؤ انسانی خودی کی مدافعت پر صرف کیا اور حریت کے نعرہ متانہ سے روح انسانیت کو بیدار کرتے رہے لیکن روایتی شاعروں اور ادیبوں کی طرح انہوں نے انسانیت دوستی یا احترام آدمیت کا جذبہ عام نہیں کیا بلکہ اپنے فکری غور وخوص سے ایک فلسفیانہ حکیمانہ نظام مرتب کر کے انسانیت دوستی کی فکری بنیادیں فراہم کرا دیں۔''

(اقبال اور قومی یک جہتی: ڈاکٹر منظر اعجاز، ص ۱۲۴/ ۱۲۵)

واضح ہے کہ اقبال کی شاعری انسانی اقدار ومعیار کی تلاش اور اس کی ترقی کے ذریعہ دنیا کو جنت نظیر بنانے پر زور دیتی ہے۔ اس طرح جو بات انسانیت کے خلاف ہے، جس میں روحانیت نہیں مادیت غالب

ہواور اخلاق باختہ ہو، جوآپس میں اختلاف کا میلان پیدا کرے ایسے تمام فکری اساس پر وہ پُر زور ضرب لگاتے ہیں۔ان کی فکر عالمی نوعیت کی حامل ہوجاتی ہے۔اسی لئے وہ جمہوریت وطنیت ،اشترا کیت، مذہب وغیرہ کی ایک طرف تنقید بھی کرتے ہیں دوسری طرف تمام ایسے موضوع پر نہایت توازن کے ساتھ ان کی حمایت کا رجحان بھی رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں جمہوریت کے تعلق سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اس راز کو مرد فرنگی نے کیا فاش          ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں          بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

اور مغربی افکار ونظریات کی حامل جمہوریت جس کی تنقید اقبال کرتے ہیں اس تعلق سے موصوف کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام          جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس          جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام          چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

علامہ اقبال کی شاعری میں وطنیت کے تعلق سے بھی اسی طرح کے افکار ونظریات پیش ہوئے ہیں۔جن میں مغربی افکار ونظریات سے پیدا وطنیت کا تصور جس کی موصوف تنقید کرتے ہیں جو اخلاق باختہ بھی ہے اور اس کی شدت پسندی عالم انسانیت کے خلاف بھی ہے۔جو اقوام کو سرحدوں کی بنیاد پر بانتا ہے۔ محدود جغرافیائی حدود کی قوم کو دوسری قوموں سے دست و گریباں ہونے کی طرف راغب کرتا ہے۔ جبکہ اقبال کا قومی تصور اور وطنیت کا تصور صرف اپنی شناخت Identification کے تعلق سے اہم قرار دیتا ہے اور اس بنیاد پر اختلاف سے گریز کا میلان واضح ہوتا ہے۔اقبالؔ کے یہاں وطن سے محبت کا جذبہ اس خطۂ ارض سے انسلاک کی وجہ سے ہے جو شعوری اور غیر شعوری دونوں اعتبار سے نمو پذیر ہوتا ہے۔ جو جارحیت اور شدت پسندی سے عاری ہے۔ان کا تصور، وطن کے آفاقی تصور کی جھلک پیش کرتا ہے۔اسی لئے انہوں نے ایک نظم وطنیت ''بحیثیت ایک سیاسی تصور''لکھی جس میں وطن پرستی کے جارحانہ رویوں کی مخالفت کی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور          ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور

ISSN : 2582 - 3612



مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور          تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے          جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے          تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے          کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے          قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال وطن کے مادی تصور کے خلاف ہیں جو اقوام عالم کو بانٹا ہے۔آپس میں لڑاتا ہے۔لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں اپنے وطن سے محبت نہیں ہے۔ وہ اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔انہوں نے اپنی تمام نظموں میں وطن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کسی درجہ کمزور یا خلوص و ایثار کے جذبے سے خالی نہیں ہے۔اسی جذبہ وطنیت کے وجہ سے انہیں اپنے وطن کا ہر ذرہ خدا معلوم ہوتا ہے اور وہ ایک ایسے عبادت گاہ کی تعمیر کرانا چاہتے ہیں جس میں تمام مذاہب وملت کے لوگ اس کی عبادت اور پرستش کرسکیں۔ جس کی گواہ ان کی نظم ''نیا شوالہ'' ہے۔اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے          تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا          جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا          واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے          خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیرت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں          بچھروں کو پھر ملادیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی          آ اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اقبال نے اپنی نظم ''شعاع امید'' میں جو وطن دوستی کا رجحان پیش کیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو          جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز          اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھتے ہیں وہ غواص معانی          جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں          محفل کا وہی ساز ہے بیگانہ مضراب

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بتخانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہہ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر — فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

علامہ اقبال کی یہ نظمیں ابتداء سے اخیر تک ایک ہی افکار نظریات پیش کرتی ہیں۔ان کے نظریات میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔انہوں نے اپنی مکمل شاعری میں ایک ربط واضح قائم رکھا ہے جوان کی تصورخودی کا حصہ ہے۔ان کی اشتراکیت بھی مغربی افکارونظریات کی حامل نہیں ہے بلکہ وہ ہیگل اور مارکس سے متاثر ضرور ہیں۔لیکن ان کی بے روح اور گمرہی سے بھی وہ پرہیز کرتے ہیں۔وہ انسان کی آزادی کے خواہاں ہیں غلامی کے نہیں وہ انسان کو فرشتوں پر بھی افضلیت عطا کرتے ہیں۔اسی لئے وہ کہتے ہیں ۔

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہر یاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

دیارمغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہی زرکم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اپنے دور میں ہورہے انقلابات کو اپنے کلام کا موضوع بنایا لیکن انہوں نے بے روح حکمت، بے جان فلسفہ، بے ضمیر سیاست اور اخلاق باختہ تصورات کی تنقید کی ہے اور دنیا کو انسانیت دوستی کا پیغام دیا ہے جس میں مذہب پسندی بھی ہے، وطن دوستی بھی ہے، قومی یک جہتی بھی ہے اورصحت مند سیاست بھی ہے۔اس اعتبار سے اقبال کی شاعری ملک وقوم کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔اوران کی عالمگیر شہرت ومقبولیت کا باعث بھی ہے۔یہی ان کی شاعری کا اہم اور کلیدی عنصر ہے۔

**Dr. Mirza Saba Alam Baig**
C/o. Mirza Noorain Baig
Dal Colony, Mohalla. Shahsupan
P.O. Lal Bagh
Darbhanga - 846 004





ڈاکٹر ریحان احمد قادری

# قومی یکجہتی

زبان اظہارخیال اور مواصلات ذریعہ ہے، یہ ایک سماجی ضرورت ہے۔زبان کی بنیاد پر ہی ہم حیوانی اور انسانی سماج میں امتیاز حاصل کرتے ہیں۔انسان اشرف المخلوقات زبان کی بنیاد پر کہلاتا ہے۔ زبان خوداور خداشناس کا بہترین وسیلہ ہے۔ملک وقوم کی ترقی کا دارومدار زبانوں پر ہے۔زبان سماج اور معاشرہ کی ہمہ قسم کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے،قوم کی ذہنی تعمیر وترقی میں زبانوں کا کلیدی رول ہوتا ہے۔ زبان تہذیب وثقافت کی محافظ ہوتی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب، تہذیب وزبانوں کے ماننے والے رہتے اور بستے ہیں....یہ ملک ہمہ لسانی، ہمہ مذہبی، ہمہ تہذیبی ملک ہے یہاں طرح طرح کے لوک آباد ہیں ان کی تہذیب و مذاہب الگ الگ ہیں، کثرت میں وحدت یہاں کا شعار اور شیوہ ہے۔گنگا، جمنی تہذیب اس ملک کا وصف اور آن بان شان ہے، قومی یکجہتی یہاں کا اولین وصف ہے، قومی یکجہتی ایسی طاقت ہے جس میں تمام طرح کی ترقی مضمرو پوشیدہ ہے۔یہ ایسی طاقت ہے جس سے ملک وقوم کا نام روشن ہوتا ہے اور پوری دنیا میں ہماری پہچان بنتی ہے، بغیر قومی یکجہتی کے ملک وقوم کا نام روشن ہوتا ہے اور پوری دنیا میں ہماری پہچان بنتی ہے، بغیر قومی یکجہتی کے ملک وقوم ترقی نہیں کرسکتی۔اس ملک کے جیسی مثال ملنا دنیا میں مشکل ہے، یہ ایسا ملک ہے جہاں پر ہمہ اقسام کے لوگ رہتے ہیں جو ایک گلدستہ کی طرح ہے جس میں ہر قسم کے پھول موجود ہیں۔اوراس گلدستہ کی خوبصورتی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اس کے ہر پھول کی نگہداشت ہو۔ہر قوم کو ترقی کا حق حاصل ہو، ہندوستان میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ان زبانوں میں اردو ایک آریائی زبان ہے اور یہ مغربی ہندی کی کھڑی بولی میں نکھر اور سنور کر ایک زبان کا روپ دھار لیتی ہے اور یہ دلی کے گردونواہ میں پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اس کا جنم ہوا۔یہاں پر پھلی پھولی نشونماء پائی اس کو سماج کے تمام طبقہ نے گلے لگایا۔ ہندو، مسلم، سیکھ، عیسائی اور دیگر طبقات نے اس سے معاشرتی، سماجی اور مذہبی کام لئے ہیں۔حضرت امیر خسرو سے لے کر آج تک تمام طبقات نے اس کی ترقی میں اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔ یہ ہندوستان کے تمام فرقوں وقوموں کی زبان ہے، اس کے حروف میں تمام زبانوں کا عکس ملتا ہے، یہ ایک مخلوط زبان ہے جس میں سنسکرت، پراکرت، عربی، فارسی، ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے اثرات

پائے جاتے ہیں۔ یہ زبان مختلف قوموں کے اختلاط وارتباط سے تشکیل پائی ہے اوراس کا ادب تخلیق کرنے میں تمام طبقات نے اہم اورکلیدی رول ادا کیا ہے۔اس میں طبع آزمائی کرنے والوں میں پنڈت دیاشنکر نسیم ، پنڈت برج نارائن چکبست ، پنڈت جگن ناتھ آزاد، گیان چندرجین، گوپی چند نارنگ، کالی داس گپتا، مالک رام، ماسٹررام چندر، درگا پرساد سمبل وغیرہ نے اس زبان کوتخلیقی، تحقیقی اورتنقیدی اعتبار سے فروغ عطا کیااورزبان وادب کو مالامال کیا۔

یہ زبان قومی یکجہتی کی علامت ہے، اس نے قوموں میں اتحاد پیدا کیا۔رواداری کا سبق سکھایا، انسان وانسانیت کی بقاءوفروغ کا رول ادا کرتی رہی۔چنانچہ حالی نے کہا کہ ؂

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسانیت اورانسانی قدروں کی ترجمانی وعکاسی میں یہ زبان پیش پیش رہی۔اردومحبت کی زبان ہے، دلوں کو جوڑنے کی زبان ہے۔مختلف فرقوں وتہذیبوں کوآپس میں جوڑتی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی نے اپنی اردوتخلیقات میں قومی یکجہتی کے تصورات کو عام کیااورکئی تخلیقات نظم ونثر میں انہوں نے رواداری کے جذبوں کوعام کیا۔

شمالی ہند میں نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی ہر چیز کو پیش کیا ہے، عوامی احساسات وجذبات کوشاعری کا موضوع بنایا ہے، ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ہرجز کوپیش کیا ہے۔انہوں نے ہندومسلم اتحاد کواولین ترجیح دی ہے۔ان کی شاعری اورنظمیں قومی یکجہتی کا نمونہ ہیں۔ وہ اسلام کے ساتھ ہندومذہب کا بھی احترام کرتے تھے۔انہوں نے اذان دی تو سنکھ بھی پھونکا، شب برات میں مہتابیاں چھوڑیں تو دیوالی میں چراغ بھی روشن کیا۔رسول اکرم ﷺ اورپیرو ولیوں کی شان میں نظمیں لکھیں تو شری کرشن، مہادیواور بابانانک کوخراج عقیدت بھی پیش کیا۔عید، بقرعید، شب برات کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ہولی، دیوالی، راکھی ان کے اپنے تہوار تھے۔ان سب تہواروں کوانہوں نے اپنی شاعری میں یادرکھا۔

اس طرح جنوبی ہند میں محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی یکجہتی کے تصور کو عام کرنے کی کوشش کی ۔اس نے ہندومسلم اتحادویکجہتی کواپنی شاعری کا موضوع بنایا۔اس کی کئی نظمیں مشترکہ قدروں کی مظہر ہیں۔محمد قلی قطب شاہ ایسا شاعرتھا جس نے ہندوستان کے ہرریتی رواج، تہوارکواپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔اس طرح اردو کے کئی ہندو، مسلم، سکھ شاعرنے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی ایکتا اورقومی اکھنڈتا کوفروغ دیا۔

بیسویں صدی کی ابتداء سے تو اردونظموں میں حب الوطنی کے باقاعدہ ترانے گائے جانے لگے۔اقبال، جوش، فیض، چکبست، جمیل مظہری کن کن کا نام لیا جائے۔خاص کربعض تاریخ سے بے بہرہ

ISSN : 2582 - 3612



لوگ اقبال کوملک کے بٹوارے اور پاکستان بنانے کا ذمہ دارقراردیتے ہیں لیکن اقبال کی شاعری کواٹھاکر دیکھ لیجئے۔ بھلاوہ کون سنگ دل ہے جولتا منگیسکر کی جادوبھری آواز میں ؂

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا

سنے اوروطن کی محبت میں اس کے دل کی دھڑکن بے قابو نہ ہوجائے۔وہ اقبال ہی تھے جنہوں نے قومی یکجہتی کا یہ محبت بھرا پیغام سنایا؂

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اوراردوغزل تو ہے ہی سراپا الفت ومحبت ، انسان دوستی ، مذہبی رواداری، سیکولزم، جمہوری اور تہذیبی قدروں کی امین، ترجمان اور پاسبان۔

امیر مینائی کا درد دیکھئے کہ ؂

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کلیم عاجز نے پیغام دیا کہ ؂

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ رستے میں چاہے دوست یا دشمن کا گھر ملے

الغرض! اردومحبت کی زبان ہے، قومی یکجہتی اورانسان دوستی کی زبان ہے جو ہمیشہ سے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی رہی۔

**Dr. Rehan Ahmad Quadri**
Kashana-E-Faiz
Faiz Road
Moh- Sarai Sattar Khan
P.o.- Laheria Sarai
Darbhanga Bihar
Mob. - 90312 01641

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
(غالبؔ)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر محمد نجم الدین

# اردو افسانہ نگاری میں خواتین کا حصہ: ایک جائزہ

اردو ادب کی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ خواہ فکشن ہو یا شاعری ہر میدان میں خواتین نے اپنی قلمی معاونت دی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ ان کی تخلیقی نگارشات اردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں بھی معاون و مددگار رہیں۔ جہاں تک اردو افسانے کی بات ہے تو اس میدان میں بھی ان کی کہانیاں خواہ فن ہو یا موضوع دونوں اعتبار سے اپنی اہمیت کا لوہا منوانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ ان خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیوں کو کسی ایک خانے میں رکھ کر ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا بلکہ زندگی کے متعدد مسائل پر ان کی گہری نگاہ ہے اور یہ خواتین اپنے مشاہدے اور تجربات کو کہانی کا حصہ بناتی ہیں۔ اس طرح جب ہم ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہاں زندگی کے مختلف شیڈس ہمیں نظر آتے ہیں اس طرح یہ کہانیاں قارئین کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج خواتین افسانہ نگاروں کی تحریر کردہ کہانیاں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں کیوں کہ یہاں مسرت بھی ہے اور بصیرت بھی۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ ہندوستان کے ہر گوشے سے ہمیں خواتین افسانہ نگاروں کی معتبر کہانیاں بطور مطالعہ دستیاب ہو جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے ہم زندگی کے پیچ و خم اور زمانے کی افراط و تفریط سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کم وقت میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ بیشتر اہل قلم کی آرا آپ کی کہانیوں کے سلسلے سے ہمیں مطالعہ کے لئے مل جاتی ہیں۔ یہ آپ کے فنی اختصاص کا ضامن کہا جائے گا۔ آپ کے افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین'' (۱۹۹۸ء) ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' (۲۰۰۰ء) ''یمبرزل'' (۲۰۰۴ء) اور ''میرا رخت سفر'' (۲۰۰۸ء) ہیں۔ آپ نے اپنی کہانیوں میں علاقائیت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے سے آپ کی تحریر کردہ کہانیاں ''اماں''، ''یمبرزل''، ''مٹی''، ''ایک پہلو یہ بھی ہے تصویر کا'' اور ''برف گرنے والی ہے'' زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ آپ کے افسانے آپ کے گہرے مشاہدے کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ آپ کے فنی اختصاص کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''ترنم ریاض اردو شعر و ادب میں کوئی اجنبی نام نہیں رہا۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے اور اردو شاعری اور افسانے کے قارئین نیز صاحبان نقد و بصر کے ذہنوں میں سما گئی ہیں۔ عام طور پر بہت کم اہل قلم ایسے





> نظر آتے ہیں جنہوں نے اتنے کم وقت میں ادب کے اکابرین سے اپنے آپ کو منوالیا ہو۔ یہ نصرت ایسی ہے جس پر اگر ترنم ریاض فخر کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ترنم ریاض کی شخصیت میں وسعت ہے۔ ان کے کارنامے متعدد اور مختلف جہتوں میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے یہاں تخلیق کا وہ جوہر ہے جو اپنے ارتقا و اظہار اور ایک منفرد انداز کے لئے مضطرب اور بے چین ہے۔''
>
> (رخت سفر، ترنم ریاض، فلیپ)

افسانوی ادب پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تب اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آج خواتین افسانہ نگار بھی بڑے ہی انہماک کے ساتھ اردو افسانے کے فروغ میں اپنا قلم صرف کر رہی ہیں۔ ان کی کہانیاں تفریح کا باعث نہیں کہی جائیں گی بلکہ یہاں زندگی سے جڑے ہر اس پہلو کو مرکزیت عطا کی گئی ہے جن سے انسانی زندگی نبرد آزما ہے لہٰذا جب ہم اس سلسلے سے ترنم ریاض کی اہمیت کا احاطہ کرتے ہیں تب ان کی کہانیاں بھی ہمیں کئی اہم پہلوؤں سے روبرو کراتی ہیں اور زندگی جینے کا ہنر سکھاتی ہیں۔ یہاں معنویت گہرائی بھی ہے اور فنی عناصر بھی بدرجہ اتم موجود نظر آتے ہیں۔

افسانوی منظرنامے پر ایک معتبر نام ثروت خان کا بھی ہے۔ ان کا تعلق راجستھان سے ہے۔ انہوں نے بھی اپنی کہانیوں میں علاقائیت کو فوقیت عطا کی ہے۔ لہٰذا اس سلسلے سے دیکھا جائے تو آپ نے اپنی سرزمین کے متعدد مسائل کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ خصوصی طور سے آپ نے اعلیٰ طبقہ اور ادنیٰ طبقہ کی درمیانی تفریق کو اپنی کہانیوں میں خصوصی طور سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے سے آپ کی کہانی ''لوک عدالت'' خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو فرقہ وارانہ فسادات کے منظر کو بھی یہ افسانہ پیش کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ اکثریت قوم کی بالادستی کس طرح عقلیت پر قائم رہتی ہے اس پہلو کو اس افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے سے افسانے کا یہ اقتباس دیکھئے :

> ''آج کئی مہینے گزر گئے تھے شہر میں یہ سب ہوتے ہوئے ایسا لگتا تھا اس شہر کا کوئی محافظ نہیں، کوئی خدا نہیں، کوئی رام نہیں، کوئی رحیم نہیں آدھا شہر سلگ رہا تھا۔ آدھا اسے سلگا رہا تھا۔ وہاں انسان تو کیا حیوان بھی نہیں تھا بس کھوکھلے جسم تھے۔ جن کی بربریت کے آگے انہیں حالات پر غور کرتے ہوئے ایک جلی ہوئی تباہ بستی میں پہنچا ...................بس سب کچھ جلا ہوا، مٹا ہوا، اجڑا ہوا، کالا کالا بکھرا بکھرا۔ وہ گھبرا کر خوف زدہ ہو کر وہاں سے الٹے پاؤں بھاگا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو تھے۔ اپنی اتنی عمر میں ایسا منظر اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہے بھگوان یہ میرے وطن کو کیا ہو گیا ہے اس نے دل ہی دل میں سوچ کر آسمان کی جانب دیکھا اور بڑی بے دلی

سے پینڈل مارتے ہوئے سائیکل چلاتا رہا۔آخر کار وہ ایک شور میں پہنچا جہاں گندگی
مچھروں اور بدبو کا انبار تھا اور اس سے زیادہ بوباس والے ادھ ننگے چھوٹے چھوٹے
لٹے لٹے انسانی جسم صرف ایک کپڑے میں لپٹی جوانیاں اور پیلی آنکھوں لٹکتی کھالوں
والی ویرانیاں۔'' (افسانہ لوک عدالت، ثروت خان، ص-۵۱)

اس طرح عصری مسائل کی پیشکش ہو یا علاقائی تصویر کشی سبھی میں ثروت خان نے حقیقت پسندی کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ پہلو بھی ان کی کہانیوں کو اولیت بخشتا ہے کہ وہ بے خوف وخطر اور بے باکی کے ساتھ حالات کی تصویر پیش کرنے میں اپنے قلم کو فعال رکھتی ہیں۔ یہ خوبی انہیں خواتین افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد میں انفرادیت عطا کرتی ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام غزال ضیغم کا بھی ہے۔آپ کی افسانہ نگاری کا جادو آپ کے افسانوی مجموعے ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔آپ کی کئی کہانیاں آپ کے فنی اختصاص کو بیان کرتی ہیں جن میں سوریہ ونشی، چندرونشی، نیک پروین، خوشبو مشت خاک اور شکنتلا زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔آپ کی کہانی ''ایک ٹکڑا دھوپ'' اس سلسلے سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں آپ نے شہری زندگی کے منفی اثرات کو بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس سلسلے سے کہانی کا یہ اقتباس دیکھئے :

''اچھا کمرے میں تو آئی۔''
''کمرہ..........اچھا ڈبہ..........یہ گھر کم ماچس کا ڈبیا زیادہ لگ رہا ہے......''
''یہاں تو نہ دالان ہے نہ ہی صحن..........ہوا بھی کیسے آتی ہوگی اور روشنی؟
آپ لوگ دن میں بھی بجلی جلاتے ہیں کیوں؟''
''میاں یہاں ہوا اور روشنی تو نعمت ہیں۔ بہت کم ہی فلیٹ میں پہنچتی ہے۔رخ
ہی مکانوں کا ایسا ہوتا ہے۔''

غزال ضیغم کی افسانہ نگاری کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے جن سے ہم آپ کے اسلوبیاتی موضوعاتی خصوصیات کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں :

''غزال ضیغم نے مرد اساس معاشرے میں متعصّبانہ رویوں کی مختلف زاویوں سے
نشان دہی کی ہے۔ان کے لہجے میں ایک توازن اور ٹھہراؤ ہے۔انہوں نے
خواتین کی ذہنی الجھنوں کو محسوس کرتے ہوئے سماج کو نئے زاویے سے
دیکھا ہے۔'ایک ٹکڑا دھوپ کا' میں شامل تقریباً تمام افسانے عورت کی پل پل بیتی
زندگی کے بارے میں ان کے گوناگوں مشاہدات کا ماحصل ہے۔''
(رسالہ معاصر اردو ادب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص-۲۷۶)





افسانوی ادب میں ایک معتبر نام صادقہ نواب سحر کا بھی ہے۔''خلش بے نام سی'' (۲۰۱۳ء) آپ کا افسانوی مجموعہ ہے۔''ہوٹل کے کاؤنٹر پر''، ''خلش بے نام سی''، ''سلگتی راکھ''، ''چاہے ان چاہے''، ''پہلی بیوی'' آپ کی بہترین کہانیاں ہیں۔آپ کا عمیق مطالعہ ان افسانوں میں جلوہ نما ہے۔آپ نے ان کہانیوں کے حوالے سے زندگی اور معاشرے کے متعدد مسائل پر انگشت نمائی کی ہے اور ان مسائل کے وجوہات کیا ہیں اسے طشت ازبام کیا ہے۔لہٰذا صادقہ نواب سحر افسانے کو وسعت عطا کرنے میں انہماک کے ساتھ اپنے قلم کی جولانی سے ہم قارئین کو متاثر ومرعوب کررہی ہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''اردو میں افسانوی ادب سے وابستہ خواتین قلم کاروں کی ایک کہکشاں سی رہی
ہے۔جنہوں نے افسانوی ادب کو طاقت، توانائی، تحرک اور تمکنت عطا کی ہے۔
مہاراشٹر کی ادبی تہذیب اور معاشرتی جمالیات کو جن فنکاروں نے اپنے تخلیقی نور
سے منور کیا ہے ان میں ایک باوقار اور محترم نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ہے۔ڈاکٹر
صادقہ نواب سحر بیک وقت ایک تخلیق کار ڈراما نگار، ناقد، محقق شاعرہ اور مترجم ہیں
جو اپنے تخلیقی اظہار کے کینوس پر فکر ونظر کے لئے رنگ بکھیرتی جارہی ہیں۔ان کی
تمام تخلیقات علم وآگہی فہم وادراک محسوسات اور تفکرات کی آئینہ دار ہیں۔''
(رسالہ شاعر، بمبئی، ص-۲۸)

صادقہ نواب سحر کا تعلق چوں کہ بمبئی شہر سے 3 ہے لہٰذا ان کی کہانیاں شہری زندگی کے پیچ وخم کے ساتھ دیگر پہلوؤں کو بھی بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔آپ کی کہانیاں تاثرات کے اعتبار سے بھی کامیاب کہی جائیں گی اس پر اضافہ یہ کہ آپ اپنی طرز نگارش کے اعتبار سے بھی افسانوی ادب میں منفرد شناخت رکھتی ہیں۔

ان خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ اردو افسانے کی بقا کی خاطر ذکیہ مشہدی، نگار عظیم، شہناز فاطمی، اشرف جہاں، شکیلہ رفیق، پروین شیر، قمر جہاں، کہکشاں انجم افسانہ خاتون وغیرہ بھی محو قلم ہیں۔ان کے افسانے زندگی اور معاشرے سے منسلک کئی اہم مسائل کو پیش کرتے ہیں اور اس طرح ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد قارئین زندگی کے سارے رموز ونکات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

**Dr. Md. Najmuddin**
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Patna University
Patna

روشن جہاں

# سفینۂ غمِ دل : ایک تنقیدی جائزہ

جدید فکشن کے منظرنامے میں قرۃ العین حیدر کا نام ایک رجحان ساز فنکار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔قرۃ العین حیدر کو یہ فن ورثے میں ملا تھا۔نیز اس آرٹ کو انھوں نے وسیع مطالعے،عمیق مشاہدے اور ذہانت کی بنیاد پر جلا بخشی تھی۔انہوں نے اردو ناول کو نئی تکنیک سے روشناس کرایا اور ہیئت، اسلوب و اظہار کے تجربوں ہی نے اردو ناول کو کم وبیش عالی مرتبے سے آشنا کیا ہے۔اب تک ان کے متعدد ناول منظرعام پر آچکے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' (۱۹۴۹ء)،''سفینۂ غمِ دل (۱۹۵۲ء)،''آگ کا دریا''(۱۹۵۹ء)،''آخرشب کے ہم سفر''(۱۹۷۹ء)،''کارِ جہاں دراز ہے'' جلد اول (۱۹۷۷ء)، جلد دوم (۱۹۷۹ء)،''گردشِ رنگ چمن''(۱۹۸۸ء)،''چاندنی بیگم''(۱۹۹۰ء)۔

یادوں کی باز آفرینی کی وجہ سے قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں خاص طور پر اودھ کے جاگیردارانہ اقدار و روایات کے مٹنے کا نوحہ اور ان سے متعلق Nostalgia ہے۔قدیم تہذیبوں کا مشترکہ کلچر اور ان کے صدیوں پرانے رشتے ماضی کی بازیافت اور وقت کا ناقابل تقسیم تسلسل ان کے موضوعات ہیں۔قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے تشکیلی عناصر مندرجہ ذیل ہیں۔

۱ زوال اجتماعیت ۲ وقت ۳ موت ۴ کردار کا زوال
۵ اجتماعی حافظے کی بازیافت ۶ تاریخ ومافوق التاریخ ۷ اسالیب کا تنوع

قرۃ العین حیدر نے تکنیک اور اسلوب کے جدید تجربے کئے ہیں۔مغربی فن کاروں میں جیمس جوائس اور ورجینا وولف کا اثر ان کے یہاں صاف نظر آتا ہے۔چناں چہ ذہنی فضا کی پیش کش اور کرداروں کے نفسیاتی زوال کی تصویر کشی میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔قرۃ العین حیدر کا مشاہدہ گہرا ہے۔مگر وہ بالعموم اعلیٰ طبقے کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہیں۔جو بات قرۃ العین حیدر کو اپنے ماقبل اور ہم عصر فکشن نگاروں سے ممتاز ومنفرد کرتی ہے وہ یہ کہ دوسرے ادیبوں نے جس طرح ماضی سے قطع تعلق کرکے صرف حال کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔وہاں قرۃ العین حیدر نے ماضی کو ایک حقیقت تسلیم کیا اور اسے حال اور مستقبل سے اس طرح مربوط کہا کہ ان کی یہ کوشش اردو فکشن پر ایک اجتہادی کوشش بن گئی۔اس طرح انھوں نے وقت کے تجربے Experience of Time کو پہلی بار وسیع کینوس عطا کیا۔

ISSN : 2582 - 3612



''سفینۂ غمِ دل'' قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ہے۔اس ناول کا موضوع تقسیم ہند،فسادات،تبادلۂ آزادی اور ان کے مجموعی اثرات کا جائزہ ہے۔ناول تحریکِ آزادی کے نقطۂ عروج ۴۲ء کے آس پاس کے دور اور ماحول سے شروع ہوکر تقسیم ہند اور اس کے قریبی زمانے کی چند جھلکیاں پر ختم ہوجاتا ہے۔یہ ایک مثالیت پسند نئی نسل کی شکست آرزو کی دردانگیز داستان ہے جس میں مصنفہ اور اس کے ہم عصروں کے شیریں خوابوں اور ان کے ہولناک تعبیروں کا بیان ہے۔مصنفہ کے بیانات سے اس کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے :

''میں اس مٹی پر بیٹھ کر'' اس پرانی ندی کے کنارے اس قدیم امام باڑے کے سائے میں جب کہ سورج آہستہ آہستہ ڈوبتا جارہا ہے۔اپنا اور اپنے آباواجداد کا مرثیہ لکھوں گی؟ کیوں کہ ہم بے حد نااہل ثابت ہوئے۔ہماری نسل اس بات کو نہ اٹھاسکی۔جوابا میاں تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ہمیں سونپا تھا۔ہم تمہارے معیاریوں پر جوانسانیت اور شرافت کے معیار تھے۔پورے نہیں اُتر سکے۔''

''ہندستان کے اوپر متوسط طبقہ کی یہ وہ نسل تھی جو انگریزی کورسوں اور مورس ناچوں کے زیر سانچہ پروانہ چڑھی۔عجب ترجم انگریز اور مضحکہ خیز دور ہے۔پر یہ لوگ زندہ رہے تھے۔اپنے آپ کو یہ فیوڈل تہذیب کا وارث بھی گردانتے تھے اور ہر وقت اپنی تعریف کرنے میں مصروف رہتے تھے۔''

قرۃ العین حیدر پر اکثر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ ان کے کردار اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔لیکن یہ اعتراض بے جا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر آزادی کے منافی تصور ہے۔فن کار اس زندگی کو پیش کیا ہے وہ سب ان کے اپنے طبقے کے ہیں۔واضح رہے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو برصغیر کی تقسیم کے سبب سے زیادہ متاثر ہوا۔زمینداریاں ختم ہوگئیں،نواب اور رجواڑے ختم ہوگئے۔ان کے مشترکہ کلچر کی بنیادیں سرک گئیں۔یہ طبقہ پریشان حال ہوکر پاکستان پہنچا یا پھر ہندوستان ہی بدحالی کی زندگی گزارتا رہا۔''سفینۂ غمِ دل'' کا موضوع اسی طبقے کی نوجوان نسل کی خوابناک اور بے فکر دنیا کی تباہی ہے۔قرۃ العین حیدر جاگیردار طبقے کے زوال کی داستان سناتے ہوئے اس طبقے کی حرکات وسکنات کو پیش کرتی ہیں۔جو بجائے خود زوال کا ایک سبب بن کر سامنے آتا ہے۔مثلاً سفینۂ غمِ دل میں رضا میاں کی زندگی کا ایک نقشہ دیکھئے :

''رضا بھائی ایک یہ عالم تھا کہ جب ہوش سنبھالا تو خود کو پال پور اور ملہر پور اور ہردوار دونوں جگہ کا کرشن کنہیا تصور کیا۔

رضا بھائی اپنے مصاحبوں کے ساتھ پرانی سرائے کی گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے اور رام گنگا کے گھاٹ پر آنے والی کہارنیوں اور اہیرنوں کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ساتھ راس لیلا رچاتے پروان چڑھے۔ بڑی دھوم دھام اور اللہ آمین کے ساتھ ان کو پہلے لا مارٹیز پھر کالون پھر علی گڑھ بھیجا گیا۔ علی گڑھ میں ان کے لیے کوٹھی لی گئی۔ کیوں کہ ہوسٹل میں رہنا شان وضعداری کے خلاف تھا۔ کوٹھی بد قسمتی سے ڈگی کے قریب گرلز کالج کے بالکل سامنے تھی۔ لہٰذا انجام پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ذاتی عملے میں چھ نوکر اور دو مصاحبین تھے کئی سال بعد جب وہ بخیر وخوبی انٹر میڈیٹ میں کامیاب ہوئے تو پڑھانے کا پروگرام منقطع کیا گیا۔ گوپال پور واپس لوٹ کر انھوں نے شوقیہ ایک تھیٹر کمپنی قائم کی۔ لکھنؤ کی ماہ منیر، کان پور کی تارا، گورکھ پور کی شمیم اور الٰہ آباد کی کرشنا گاہے بگاہے اس کمپنی کی رویا گیسٹ اسٹار بن کر گوپال پور جایا کرتی تھیں اور ان کے ڈراموں کو ملاحظہ کرنے کے لیے ضلع کا انگریز کلکٹر اور دسرے حکام مدعو کئے جاتے تھے۔ روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ رضا میاں کہتے تھے کہ جان عالم کی سنت ہے۔ جس پر وہ سعادت مندی سے عمل پیرا ہیں۔''

یہ طبقہ جس نوع کی زندگی کا عادی ہے وہ اسے زوال کی طرف لے جانے کے لیے کافی ہے۔ قرۃ العین حیدر اس طبقے کے کھو کھلے پن کو پیش کرنے کے بعد اچانک ۴۷ء کا واقعہ دکھلاتی ہیں جب ملک تقسیم ہو جاتا ہے اور رضا میاں ہجرت کر کے پاکستان جاتے ہیں :

''اس نے آنکھیں اٹھا کر انسانوں کے ہجوم کی طرف دیکھا جو دھیرے دھیرے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جلوس کے آخری سرے پر نواب رضا قاسم تھے۔ ان کی باریک نفیس مونچھیں نیچے کو جھک آئی تھیں اور ان کا جامدانی کا انگرکھا اتنا صاف شفاف نہیں رہا تھا۔''

''سفینۂ غمِ دل'' میں مسلمانوں کی دربدری کی تصویر کش بڑی چابک دستی سے کی گئی ہے۔

''یہ لوگ دوسرے نئے دیش سے واپس کر دیئے گئے تھے اور اب یہاں لوٹ کر سر چھپانے کے لیے کسی ٹھکانے کی بھیک مانگ رہے ہیں۔''

قرۃ العین حیدر نے تقسیم ملک کے نتیجے میں ہجرت کے مسئلے کو قومی یک جہتی اور ملکی سالمیت کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کی ذیل کی سطریں ان کے علامتی انداز بیان کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کی آزادی سے متعلق تقریروں کی یاد بھی دلاتی ہیں۔

''یہ لوگ؟ سیاست؟ گیہوں کی بالیوں نے حقارت سے سر ہلا کر کہا۔ یہ لوگ جو تم کو ترک وطن پر

ISSN : 2582 - 3612



مجبور کر رہے ہیں تم نے ان کو کیوں نہ بتایا کہ تمھیں تمہارے ملک سے نکال کر انھوں نے زندگی کے ابدی سکون کو زندگی سے بے دخل کر دیا ہے۔ پھر ہوا رام گنگا پر سے قہقہے لگاتی ہوئی آئی اور اس نے کہا ''رنج مت کرو'' دکھوں کی سلطنت بہت وسیع ہے لیکن پھر ہوا نے کہا میں نے غلط کہا تھا۔ تم کو تو نئی دنیاؤں میں سکھ مل جائیں گے۔ لیکن ہم کیا کریں گے گوپال پور کا کسان کیا کرے گا۔ سارے ہندوستان کا کسان کیا کرے گا۔ جس کو تم یہیں چھوڑے جا رہی ہو۔ اسے ان ہی کھیتوں پر زندہ رہنا اور یہیں مرنا ہے۔ کیوں کہ تم جاتی ہو لیکن اسے اپنی ان مسجدوں اور امام باڑوں کی حفاظت کرنی ہے۔''

قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے بعض کرداروں کو حقیقی دنیا سے لیا ہے۔ اپنے والد محترم سجاد حیدر یلدرم کو کمال خوبی سے افسانوی کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ علی ایک علامتی کردار ہے۔ جیسے قرۃ العین حیدر نے اپنے خاندان سے اٹھایا ہے۔ سادات ٹھٹور کے اولادوں میں احمد علی نے انگریز سرکار کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ اور انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس کا مفصل ذکر قرۃ العین حیدر نے کارِ جہاں دراز ہے میں کیا ہے۔ ''سفینۂ غمِ دل'' کا علی بھی احمد علی ہی کی طرح ایک باغی ہے وہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور نئی صورت حال سے نالاں ہو کر ملک کی دہشت پسند تحریک میں شامل ہو جاتا ہے۔ ناول میں دیگر کردار بھی ''میرے بھی صنم خانے'' کے کرداروں کے قبیل سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ملک تک کے واقعات و حالات سے یہ کردار تشکیل پاتے ہیں اور ان سے ذہنی طور پر اثر قبول کرتے ہیں۔ ناول کے نمائندہ کرداروں میں ایلمر ریکٹسن علی، راحیل، احسن، فواد، میرا، ریاض الدین، عالیہ، نادرہ، لیلیٰ پدما، مسز اسٹنیلا، ارون وغیرہ اہم ہیں۔ یہ کردار اپنے عہد کے مسائل سے الجھتے ہیں۔ اور نتیجے میں ذہنی کرب اور نفسیاتی الجھنوں کے شکار ہوتے ہیں۔ ان میں حالات اور سماج میں خوش آئند تبدیلیاں لانے کی رومانی امنگ بھی ہے اور عہد شباب کا لاابالی پن بھی، تقسیم ملک کا واقعہ ان کی زندگی میں ایک تباہ کن حادثہ بن کر سامنے آتا ہے۔ جس سے ان کی دنیا، ان کے خواب، ان کی آرزوئیں سب ریت کی دیوار کی مانند ڈھ جاتی ہیں۔ سارے کردار بکھر جاتے ہین۔ ان کی محفلیں، کلب، رقص گاہیں، ڈرامے، تفریح گاہیں سب پرانی کی نذر ہو جاتی ہے۔ اور سارے کردار غم و مایوسی اور کرب کی فضا میں کھو جاتے ہیں۔ ان پر ایک عجیب Neurasthentic کیفیت چھائی رہتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی زبان کی مٹھاس اور اسلوب کی حلاوت اس ناول میں بدستور موجود ہے۔ لیکن بقول وارث علوی ''یہ ناول اتنا ہی حوصلہ شکن ہے جتنا کہ ان کا پہلا ناول امید افزا تھا''۔

**Raushan Jahan**
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Ranchi Unviersity, Ranchi

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد شاہد

# شائقؔ مظفرپوری کی غزل گوئی

اُردوزبان وادب کی اِرتقاء میں صوبہ بہار (دبستان عظیم آباد) غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ نظم ونثر کی تقریباً تمام اصناف کو یہاں کی زرخیز مٹی نے سیراب کیا ہے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک شاعر، نثر نگار، مورخ، محقق، ناقد، فلسفی، طنز ومزاح نگار اور اساتذہ علم وادب نے جنم لیا جن کے وجود پر اردو دنیا کو ناز ہے۔ شائق مظفرپوری بھی اسی قبیل کی شخصیت ہیں۔ جنہوں نے بہار وجھارکھنڈ کی شعری وادبی فضا کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ استاد شاعر کی حیثیت سے شائق مظفرپوری کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ لیکن یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے کارناموں کا صحیح معنوں میں اب تک اعتراف اردو دنیا میں نہیں ہوسکا۔ اس مقالے میں ہم جہاں شائق مظفرپوری کے خدمات پر مختصر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے وہیں ان کی شاعری پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالیں گے۔

شائق مظفرپوری کہنہ مشق، باکمال اور قادرالکلام استاد شاعر کی حیثیت سے موجودہ جھارکھنڈ میں اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ غیر منقسم بہار کے ضلع مظفرپور کی ایک مردم خیز بستی خواجہ چاند چھپرہ میں ۱۹۳۹ء میں شائق مظفرپوری کی ولادت ہوئی۔ سیّد معین احمد اصل نام تھا۔ قلمی نام شائق مظفرپوری سے اردو دنیا میں مشہور ہوئے۔ والد ڈاکٹر سیّد آلِ رسول معالج کے حیثیت سے علاقے میں اپنی پہچان رکھتے تھے۔ شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق تھا۔ گرد ونواح میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں اکثر و بیشتر ان کی شرکت ہوا کرتی تھی ساتھ ہی مشق سخن بھی کیا کرتے تھے۔ الغرض ایک علمی وادبی گھرانے میں شائق کی پرورش ہوئی جس کی نتیجے میں شائق بھی اردو ادب اور خصوصاً شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ دوران طالب علمی ہی انہوں نے مشق سخن کرنا شروع کردیا۔ ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے شائق شاعری کے دلدادہ ہوچکے تھے اسی اثنا میں ان کی شادی کردی گئی اور بغرض ملازمت اپنے خسر محترم کے یہاں جمشید پور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ٹاٹا سکو کمپنی میں ملازم ہوئے۔ جمشید پور میں اس زمانے میں کئی نامور شعرائے کرام گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مصروف تھے۔ شائق کو یہاں کا ادبی ماحول راس آیا انہوں نے علامہ سروش مچھلی شہری کی شاگردی اختیار کی جو دبستان داغ کے نمائندہ شاعر تھے۔ اپنے منفرد لب و لہجے کی بنیاد پر جلد ہی شائق مظفرپوری جمشید پور کی ادبی فضا میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ استاد نے تھوڑے ہی

ISSN : 2582 - 3612



عرصے میں فارغ الاصلاح کردیا۔ نہایت شریفانہ طبیعت کے حامل تھے۔ جس کی بنیاد پر چاہنے والوں کا ایک جم غفیر شائق کا گرویدہ ہوگیا۔ نوآموز شعراء بھی اپنا کلام بغرض اصلاح دکھانے لگے اور یہ سلسلہ چل پڑا۔

نتیجتاً شہر سنگ وآہن جمشید پور (ٹاٹا) کی شعری وادبی فضا کی تعمیر وتشکیل کی اہم ذمہ داری شائق کے کاندھوں پر آپڑی جسے انہوں نے کمال حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا۔ ان کی حیثیت شجر سایہ دار کی سی ہوگئی تھی جس نے اس شہر کو اپنے سایۂ عاطفت میں ڈھانپ لیا تھا۔ ان کے اردگرد شاعری کے رموز ونکات سیکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد پچاس سے بھی زائد ہے۔ جو آج ملک کے مختلف علاقوں میں اردو ادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ گذشتہ چار پانچ دہائیوں میں شاید ہی کسی استاد شاعر کو اتنے شاگرد میسر ہوئے ہوں۔ ان میں کئی باکمال شاعر کی حیثیت سے اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ اس فہرست میں افسر کاظمی، جی۔ ڈی۔ احمر، محشر جیبی مہتاب انور، گوہر عزیز، جگند رسنگھ دیپ، نازاں جمشید پوری، ڈاکٹر انوری بیگم، ذکی ہاشمی، سوز پیشاوری، ہری کمار صبا، خورشید اظہر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ دور میں یہ حضرات جس طرح اردو شعروادب کی خدمت کررہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے اور شائق مظفرپوری کو ''حیات جاوداں'' عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ۱۲؍اکتوبر ۲۰۰۸ء کو شائق کا انتقال ہوا۔

شائقؔ مظفرپوری اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ان کی غزلیں ملک کے موقر رسالوں جیسے شمع بیسویں صدی، آج کل، پاسبان، سہیل، مژگاں، زبان وادب وغیرہ میں اکثر شائع ہوا کرتی تھیں۔ شائق مظفرپوری کے چار مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔ پہلا مجموعۂ کلام ''نیا سورج'' ۱۹۸۳ء میں دوسرا مجموعہ کلام ''سفر لہجے کا'' ۲۰۰۳ء میں، تیسرا ''آئینہ احساس کا'' ۲۰۰۷ء میں اور چوتھا مجموعۂ کلام ''نقطہ اور زاویہ'' پس از مرگ ۲۰۱۶ء میں شاگردوں کے اہتمام سے شائع ہوا۔

پہلے مجموعۂ کلام ''نیا سورج'' میں کل ۹۸؍غزلیں ہیں۔ چونکہ شائق مظفرپوری بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے شاید اسی وجہ سے پہلے مجموعہ کلام میں ہمیں صرف غزلیں ہی ملتیں ہیں۔ ان غزلوں کو دیکھنے ہی سے شائق کی فنکارانہ مہارت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ غزلیں عہد شباب کی یادگار ہیں پھر بھی ان میں جمالیاتی شعور کے ساتھ حیات وکائنات کے سنجیدہ و پیچیدہ مسائل کو سمیٹنے کا بہترین سلیقہ نظر آتا ہے۔ جوہر بلیاوی لکھتے ہیں :

> ''دبستان داغ کے توسط سے ان کی شاعری میں وہ ساری اقدار خود بخود درآئی تھیں جو اس اسکول کے غزل گو شعرا کے کلام کا خاصہ کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ بھی مدتوں زلف ولب ورخسار کے اسیر رہے۔''
>
> (نیا سورج، شائق مظفرپوری، ص ۱۰)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ذیل میں چند اشعار دیئے جا رہے ہیں جس سے ان کے جمالیاتی شعور کا ایک واضح تصور سامنے آتا ہے ۔

اس لئے تو شیشہ دل میں اتارا ہے تجھے
تیرا پردہ بھی سلامت اور ہم دیکھا کریں

ترا گماں ہے کہ میں تجھ سے دور ہوں لیکن
مرا یقیں ہے کہ تو میرے پاس اب بھی ہے

تصورات میں جب تک تجھے نہیں پاتا
مرے شعور کی کھیتی ہری نہیں لگتی

حالانکہ شائق جلد ہی غزلوں کی روایتی فضا سے باہر نکل کر زمانے کے نت نئے مسائل اور تقاضوں سے اپنی شاعری کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ۔ بلکہ یہی رنگ وآہنگ شائق کی شاعری کی پہچان بن گیا۔شائق کو احساس ہو چلا تھا کہ شاعری کی یہ رنگین دنیا اور رومانی فضا ان کی شخصیت اور ماحول سے میل نہیں کھاتی ۔انہوں نے سادگی کے ساتھ پرکاری کے ذریعے اپنے کلام کو انفرادیت بخشی ہے۔ایک شعر بطور مثال کے ملاحظہ ہوں ۔

ذہن یوں الجھا ہوا ہے مسئلوں کے درمیاں
جیسے سورج گھر گیا ہو بادلوں کے درمیاں

ویسے تو شائق مظفرپوری نے اردو شاعری کے اکثر اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن ''نیا سورج'' میں صرف غزلیں ہیں۔فنی نقطہ نظر سے اس میں خامیاں بہت ہی کم ہیں۔اس مجموعہ کی دو تین غزلوں کو چھوڑ کر تمام کی تمام غزلیں سات اشعار پر مشتمل ہیں۔ان غزلوں میں الفاظ ومعانی ربط نظر آتا ہے۔فنی اور فکری دونوں سطحوں پر پختہ کاری جھلکتی ہے۔اشعار بامعنیٰ اور ایک خاص قسم کی تاثیر لئے ہوئے ہیں۔ روایتی اسلوب کی پاسداری کے ساتھ ہی جدید لب ولہجے کا خوبصورت امتزاج شائق کی ابتدائی دور کی غزلوں سے ہی ملنا شروع ہو جاتا ہے۔جو آگے چل کر مزید پختہ ہو گیا ہے۔اور انہیں ''جدیدیت'' سے قریب لا کھڑا کیا ہے۔''نیا سورج'' کی پہلی ہی غزل چونکا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اور یہ باور کراتی ہے کہ شائق تجربات اور مشاہدات کو حسین پیکر عطا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ شعر اس کی ترجمانی کرتا ہے ۔

جھیل کا ٹھہرا ہوا شفاف پانی اور میں
چاند کا بوجھل تصور سرگرانی اور میں

شائق مظفرپوری نے ''نیا سورج'' میں سورج کو علامتی طور پر استعمال کر کے زندگی کو نئی حرارت دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔چند اشعار بطور دلیل پیش کر رہا ہوں ۔

کہاں مجھ سے بچھڑ کے رہ گیا ہے
میں سورج لے کے سایہ ڈھونڈتا ہوں

سورج سے اتفاق کی صورت نکالیئے
کیا کیجئے گا سایۂ دیوار دیکھ کر

ISSN : 2582 - 3612



یوں تو سورج کو لئے پھرتے ہیں سر پر کتنے
پھر بھی سائے سے بہت دور ہیں پیکر کتنے

شائق نے ایک جگہ لکھا ہے :

''میں نے روز وشب کے گزرتے ہوئے لمحوں کو نچوڑ کر ذہن ودل کی کشت زار کو سیراب کرنے کی سعی کی ہے۔''

(نیا سورج، شائق مظفرپوری،ص ۱۳)

شائق کا کلام ان کی فکری گہرائی وگیرائی کا غماز ہے۔انہوں نے روز اول سے ہی سرسری باتیں نہیں کیں بلکہ ان کا ہر شعر اپنے اندر بے پناہ معنویت رکھتا ہے۔

دوسرا مجموعہ کلام ''سفر لہجے کا'' بیس سال کے بعد ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔''سفر لہجے کا'' شائق کی شاعری کے سنہرے دور کا انتخاب بھی ہے۔جس میں شائق نے نظم کی کئی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ باجود غزل گو شاعر ہونے کے شائق نے نظموں کی وسعت بھری دنیا میں بھی اپنی مہارت کے جوہر دکھلائے ہیں اور غزل کے حصار سے باہر نکل کر اپنے مخصوص لہجے اور فکر سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا ہے۔''سفر لہجے کا'' میں ۶۶ ،غزلیں ،۴؍ آزاد غزلیں،۲۰؍معرا نظمیں،۸؍ پابند نظمیں،۱۲؍رباعیات،۱۶؍ قطعات،۸؍ثلاثی کے علاوہ ایک سانیٹ موجود ہیں۔اس اعتبار سے یہ شعری مجموعہ ''عطر مجموعہ'' بن گیا ہے۔ جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔شعور کی بالیدگی اور فکری کی وسعت نے اس مجموعے کی بنا پر شائق کو جدید شاعری سے اور زیادہ قریب کر دیا ہے۔ دنیا کی جلوہ سامانیاں اور دل فریبیاں اب شائق کی آنکھوں کو خیرہ کرنے سے قاصر تھیں۔اس لئے کہ شائق حسن کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکے تھے۔اشعار بطور مثال کے پیش کر رہا ہوں ۔

مقدر میں ہے طوفانوں کا تیور دیکھتے رہنا
ابھرتی ڈوبتی کشتی کا منظر دیکھتے رہنا

غبار بن کے نہ اُڑتے جو رہ گزار سے ہم
تو منزلوں کا پتہ پوچھتے غبار سے ہم

اسی پہ سنگ زمانہ اچھالنا چاہئے
جو ذہن و دل کا سمندر کھنگالنا چاہئے

اس طرح کے اشعار شائق مظفرپوری کی عصری حسیت اور فکر ونظر کی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شائق سماج سے گہرے طور پر وابستہ تھے اور آئے دن رونما ہو رہے نئے نئے حالات پر اچھے برے واقعات اور نت نئی تبدیلیوں کا براہِ راست مشاہدہ کر رہے تھے۔ان کیفیات سے دوچار ہو کر ایک حساس دل شاعر

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کیسے بے چین ہوا ٹھتا ہے شائق کی شاعری میں اس کی اعلیٰ تریں مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہ اشعار دیکھنے کے قابل ہیں ۔

نہ دن ہی چین سے گزرا نہ کوئی رات مری — وہ سبز باغ دکھاتی رہی حیات مری

بے حس انساں کیا سمجھے گا حس کی بھٹی گرمانے میں — کتنی آنکھیں سوج گئی ہیں گیلی لکڑی سلگانے میں

ہمارے عہد کا ہر طفل مختلف ہوگا — نئی زمین، نیا آسماں رکھتا ہے

شائق مظفر پوری شاعری سے دلوں کو جوڑنے کا بہترین اور مؤثر ذریعہ نکالتے ہیں لیکن اپنے عہد کے اہلِ ادب کے رویے سے مطمئن نہیں نظر آتے۔ گروہ بندی اور تعصب پرستی نے جس طرح سے ادبی فضا کو مسموم کردیا ہے اس سے شائق کو دلی صدمہ پہنچا تھا۔ وہ ادب کو ذاتی، سیاسی، علاقائی، اغراض و مقاصد کی ترجمانی کے خلاف تھے۔ (جس کا اب عام چلن ہو گیا ہے) بلکہ وہ ادب کو ان مفادات سے بالاتر انسانی جذبات و احساسات کا ترجمان مانتے ہیں۔ شائق اپنی شاعری کے ذریعے ایسے ماحول سازی کے لئے کوشاں ہیں لیکن اکثر انہیں مایوسی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ ان اشعار میں اس خیال کو یوں پیش کیا ہے۔

میں ازل ہی سے تو شائقؔ ہوں وفا کا تاجر — نفع پہنچائے بھلا خاک تجارت میری

اور کہیں شائق یوں دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

ہوس کی آندھی میں اُڑنے والوں سکوں کے سائے نہیں ملیں گے — ہمارے زخموں کی انجمن سے ہی لطف کیف اماں لے لو

شائق اہلِ ادب کے رویے سے مایوس تو ضرور ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے۔ ان کا عزم و استقلال انہیں یہ کہنے پر مجبور کررہا ہے کہ ۔

منزلوں کے سمٹ گئے ہیں رستے — اور شائقؔ تھکا ابھی نہیں ہے

مخالف ہے شائقؔ ہوا تو ضرور — مگر بے لباسی ضروری نہیں

غزلوں کے علاوہ اس مجموعے میں کئی بہترین نظمیں شائقؔ کی تخلیقی صلاحیت کا مظہر ہیں۔ ان نظموں میں شائق نے حیات انسانی کے مختلف مسائل اور پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ شائقؔ کی شاعری کا اصل محور مرکز ''انسان اور انسانی قدریں ہی ہیں''۔ نظم مزدور ''لاوارث'' جیسی معرا نظمیں ''بچوں'' کے تعلق سے شائق کے اعلیٰ ترین سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شائق حساس دل اور سلجھا ہوا دماغ لیکر آئے تھے۔ انہیں انسانوں سے بے پناہ ہمدردی تھی۔ لوگوں کی پریشانیاں مزدوروں اور کمزور طبقوں کے

ISSN : 2582 - 3612



مسائل و مشکلات کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور ان کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے۔ شائق نے اپنی شاعری کے ذریعے ایسے کئی مسئلوں پر معاشرے کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ نظم ''تلک''، تشدد، خواب مسلسل، تقاضہ'' اور ''شکست'' جیسی نظمیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ رباعیات میں شائق کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ یہ رباعی اپنی مثال آپ ہے ۔

ہر طرف پتھروں کی ہے بارش — سوچئے تا مآل کیا ہوگا

آئینے کو سنبھال کر رکھئے — ورنہ چہرے کا حال کیا ہوگا

اردو کے دو عظیم شاعر جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کو شائق نے اپنے اس مجموعے میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ''نذرِ جوش'' اور ''نذرِ فراق'' کے عنوان سے یہ دونوں نظمیں شائق کی فنکاری کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں :

''شائق مظفر پوری کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ ہمارے معاصرین میں ایسے منفرد اور پہلودار لہجہ کے سخنور اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔''

(شائق مظفر پوری فکر و فن: ڈاکٹر انوری بیگم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶، ص ۱۰)

شائق مظفر پوری نے روایت اور جدت کے حسین امتزاج سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا جس سے جدید اردو شاعری میں وسیع امکانات روشن ہوئے۔ یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ شائق مظفر پوری کو اردو ادب میں ممتاز مقام دیا جائے جس کے وہ بلاشبہ مستحق ہیں۔

**Md. Shahid**
Research Scholar
Deptt. of Urdu
J. P. University, Chapra

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد رضوان

# مظہر امام کی شاعری ''زخم تمنا'' کے حوالے سے

ڈھونڈتا ہے اگر زخمِ تمنا کا مداوا    اک نرگسِ بیمار کی بات آ ہی گئی

دربھنگہ کی سرزمین پر ہر زمانے میں گیسوئے ادب کی مشاطگی ہوتی رہی ہے اور آج بھی اردو زبان وادب کی آبیاری میں اس کی خدمات نمایاں ہے۔ مظہر امام بھی دربھنگہ کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے ایک معتبر جدید شاعر ہیں۔

مظہر امام ۵/ مارچ ۱۹۳۰ء کو مونگیر میں پیدا ہوئے۔ وطن دربھنگہ ہے۔ والد سید امیر علی جوانی ہی میں پنجاب سے منتقل ہوکر بسلسلۂ ملازمت دربھنگہ آگئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ابتدائی تعلیم وتربیت کے بعد مظہر امام کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۱ء میں امتیازی نمبروں کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ روزنامہ ''کارواں'' کی خواہش پر کلکتہ گئے اور وہاں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک اسکول میں ملازمت مل گئی۔

۱۹۵۸ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو کی سروس میں آئے۔ ۱۹۶۷ء میں مختلف ریاستوں میں قیام کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے پٹنہ اسٹیشن سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر ترقی پاکر سری نگر تشریف لے گئے۔ مظہر امام نے دوران ملازمت اردو اور فارسی دونوں مضامین میں ایم۔ اے کیا اور طلائی تمغے حاصل کئے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ''زخم تمنا'' شائع ہوا۔ مظہر امام کو ترقی پسند تحریک سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے ترقی پسندی سے بھی وابستگی رکھی۔ وہ جدیدیت سے بھی بیزار نہیں تھے اور پھر وہ نئے رجحان کے ساتھ بھی رہے۔ حالات ومسائل میں تغیرات کے ساتھ ہی ان کے نقطۂ نظر میں بھی خوشگوار تبدیلیاں آئیں۔ نظموں اور غزلوں دونوں ہی صنفوں میں انہوں نے طبع آزمائی کی۔ مظہر امام جدیدیت پسندی کی طرف مائل ہیں اور وہ دور جدید کے اہم شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

مظہر امام کا شعری مجموعہ ''زخم تمنا'' ان کے ذہن وفکر کی تخلیق ہونے کے باوصف انفرادیت کا عکاس ہے۔ اس کا شعری آب ورنگ ہمارے لئے جاذبیت اور دلکشی کا باعث ہے۔ ہم چاہیں تو اس میں شاعر کی ذات سے مماثلت کے بعض پہلو تلاش کرسکتے ہیں۔

''زخم تمنا'' میں شامل غزل کا یہ شعر ؂

آندھیاں کتنی اٹھائیں وقت نے لیکن امام    آج بھی جلتی ہے وہ شمع وفا میرے لئے





فراق گورکھپوری اپنے ایک خط میں جو انہوں نے ۲۷/ دسمبر ۱۹۶۴ء کو الہ آباد سے ارسال کیا تھا رقمطراز ہیں:

''مظہر امام صاحب کے کلام کا مجموعہ ''زخم تمنا'' کے نام سے شائع ہوا ہے ان کی شاعری لطافت احساس اور طہارت وپاکیزگی کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے یہاں ایسا چٹیلا پن اور نشاط آمیز دل گرفتگی ہے جو ان کے کلام کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہے اور دل نوازی بھی۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی قابل ستائش ہے کہ شاعر نے حساس اور پرخلوص انداز میں اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں یہ بات ریاضت اور مشق سے حاصل ہوتی ہے۔''

مظہر امام اپنی شاعری کے متعلق ''زخم تمنا'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''مجھے احساس ہے ہر وقت آنسو بہاتے رہنا کوئی مہذب فعل نہیں ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ خود تہذیب کی حسین قدروں کا حسن مشتبہ ہوگیا ہے۔ انسان اپنی عظمت کھوتا جارہا ہے تباہی وبربادی کی طاقتیں سرفراز ہورہی ہیں۔ نیکی، حق پسندی اور انسان دوستی کے نعروں میں پہلی سی حرارت نہیں رہی میرے غم کی نوعیت انفرادی نہیں اجتماعی بھی ہے لیکن میری شاعری میں غم ہی غم نہیں ہے۔ دراصل میری شاعری یاس ورجا اور محرومی وآسودگی کی کشمکش سے عبارت ہے۔''

''زخم تمنا'' کے چند اشعار جو مظہر امام کے ذہن وفکر کی عکاسی کرتا ہے ؂

آداب وفا سے واقف تھے ہم جرأت بے جا کیوں کرتے
خاموشیٔ لب ہی کافی تھا، الفاظ کو رسوا کیوں کرتے
جب ترک تعلق کرکے بھی اس عہد میں جینا ممکن تھا
اے جانِ تغافل! تو ہی بتا پھر تیری تمنا کیوں کرتے

مظہر امام کی فنی اور فکری بصیرت کافی وسیع اور متنوع ہیں میدان سخن میں ان کی حیثیت مستحکم ومسلم ہے۔ وہ آزاد غزل کے بانی ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ''زخم تمنا'' اس بات کا مظہر ہے کہ مظہر امام کی شخصیت کئی رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے اور ہر بار ان کی قوت کا احساس دلاتی ہے۔ کبھی وہ خرم محتاط اور صبر وتحمل کے پیکر نظر آتے ہیں تو متلون مزاج اور کبھی ایک جہاں شناس شخص کی طرح طنز کے تیر برساتے ہیں کبھی مسلسل برداشت پر راضی۔ بغور نظر ڈالئے تو ایک ایسے باغی اور روایت شکن فن کار کی شخصیت ہے۔ جسے قدم قدم پر خوابوں، امنگوں اور ارادوں کو گھٹن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زخمی آرزوئیں ان کے لاشعور میں کھولتے لاوے کی صورت میں تہہ نشین ہوگئی ہیں جو گاہے گاہے ان کے رعب کے باوجود اپنے اظہار پر مصر رہتی ہے۔ بقول راجندر سنگھ بیدی:

''زخم تمنا'' میں سیکڑوں ایسے اشعار ہیں جن میں چمک ہے جو فرزانگی کی حدوں کو پھاند گئے ہیں ہماری ترقی پسندی نے جہاں ہمارا ذہنی افق وسیع کیا ہے وہاں کئی برلن کی دیواریں بھی کھڑی کردی اور یوں :

بنے ہوئے ہیں جو آقائے حال و مستقبل      ستم تو یہ ہے کہ وہی ارتقاء کے دشمن ہیں

اور

خون گلشن ہے پس پردہ اعلان      دیکھنا غنچۂ نورس میں شرارا تو نہیں
تھم گئی صوت جرس رک گئے رہبر کے قدم      کسی گم کردہ منزل نے پکارا تو نہیں

مظہر امام شعری حسیت کے متشدد لمحوں میں خارجی اور داخلی کیفیات کو بھی بڑے سلیقے سے شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ نازک اور پاکیزہ رشتوں کے انہدام اور قدروں کے زوال کے نتیجے میں انسان کو خوف و وحشت اور اجنبیت کا سامنا ہے۔ ان کے اشعار میں جو تخیلی فضا ابھرتی ہے وہ روشنی اور تاریکی کے مسلسل تصادم کا منظر پیش کرتی ہے۔ بڑے نفسیاتی اور حقیقت افروز اشعار ہیں۔

میں نے مانا ترے کوچے میں قدم اٹھ نہ سکے      زیست کی دور میں لیکن کبھی ہارا تو نہیں
چونک اٹھتا ہے جو ہر گام پہ رہبر کا شعور      کسی گم کردہ منزل نے پکارا تو نہیں

مظہر امام قاری کو لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتے تخیلی دنیا کی سیر کراتے ہیں اور وہ خوف، محرومی، پسپائی، درد، حیرت اور غم کے تجربات سے گزرتا ہے۔ صنعتی شہروں میں بڑھتی ہوئی بے بسی، فریب و شکستگی کی آگہی نے مظہر امام کو عشق اور انسانی رشتوں کے ان رومانی تصورات کی بضاعتی سے آگاہ کیا ہے۔ جو شباب معصومیت کے عہد میں ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور جن کی بنا پر وہ عہد حاضر میں سانس لینے کے باوجود ہمارے لئے اجنبی تھے۔

دامن حسن سے کچھ اور سلگ اٹھتی ہے      عشق کی آنکھ میں شبنم بھی شرارا تو نہیں

یہ اشعار مظہر امام کی رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید حسیت کا پتہ بھی دیتے ہیں اور ایک نئے اسلوب کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

مجموعۂ کلام ''زخم تمنا'' ان کے ذہنی سفر میں ایک نئے موڑ کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں شامل نظمیں استعاراتی پیرائے اور غزلوں کے اشعار علامتی انداز میں اس دکھ، درد اور کرب کا احساس دلاتے ہیں جو رومانیت سے عصری حسیت تک کے کڑے سفر کو طے کرنے میں انہیں جھیلنا پڑا ع

روز ازل سے تُرشی حالات ہے نصیب

صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین (۸/جنوری ۱۹۶۳ء) کو بذریعہ مکتوب مجموعۂ کلام ''زخم تمنا'' کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ISSN : 2582 - 3612



''میں ایک نشست میں زیادہ شعر نہیں پڑھتا۔ ٹھہر ٹھہر کر دم لے لے کر چلتا ہوں۔ لیکن آپ کی غزلیں جو رات شروع کی تو سب پڑھ ڈالیں کئی شعروں کو دیر تک گنگنایا اور آپ ہی کے لفظوں میں کہوں تو بار بار ایسا لگا کہ :

تیرے اشعار کا یہ رنگ امام      ان کے ہونٹوں کے شفق ہو جیسے

مظہر امام ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر ہیں ان کے لہجے میں شیرینیت اور حسن بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی نظمیں عام طور پر وہ ترکیبی حسن اور تجربے کا ارتکاز نہیں رکھتی۔ جو ان کے غزلیہ اشعار کی خصوصیت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صنف نظم میں ان کے تجربے کی سچائی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ ان کے تجربے کی سچائی سے انکار ممکن نہیں البتہ تجربہ بعض دفعہ کچھ غیر معمولی عناصر میں گھرا ہوا ملتا ہے جیسے کوئی گہر پارہ سنگ ریزوں میں پڑا ہو۔

مظہر امام نظم کی بہ نسبت غزل کے بیشتر اشعار میں تخلیق کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ وہ بلاشبہ صنف غزل پر حاوی ہے اور لفظوں کے استعاراتی و علامتی امکانات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شعر ایک زندہ متحرک اور پہلو دار تجربہ بن جاتا ہے۔ ان کے شعری شعور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ تجربے کے لئے کسی خارجی واقعے کے پابند یا دست نگر نہیں ہیں۔ اپنے وجودگی کی داخلی سیاحت کے تجربات کے لعل و گہر کی شناخت کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر حسی پیکر تجربے کی تہہ داری کا احاطہ کرتی ہوئی ان کی شعری دنیا حیرت زار اور جاذب نظر ہے اس دنیا میں قاری پتھر کے دل میں بتان آذری کا رقص دیکھ لیتا ہے۔

مظہر امام غیر معمولی قوتوں کے مالک ہیں۔ ان کے لہجے میں احتیاط پسندی کے ساتھ ساتھ بر انگیختگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ایک انفرادی فکر کو عزیز رکھتے ہیں۔ پوری دیانت داری اور ثابت قدمی سے اپنے انداز فکر کا اظہار کرتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی :

''زخم تمنا میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے بعد نہ آپ کے نہ آپ کے کلام کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کی ترجمان و تصدیق کرتے ہیں۔''

مظہر امام اپنی شعری شخصیت کو شوخ، طرحدار اور تابناک بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

میں نے مانا تیرے کوچے میں قدم اٹھ نہ سکے      زیست کی دوڑ میں لیکن کبھی ہارا تو نہیں

**Md. Rizwan**
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

سیدہ تفسیر فاطمہ

# جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کا مختصر جائزہ

جمیؔل مظہری جدید دور کے شاعر تھے۔ جدید اردو شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ اردو ادب کی دنیا میں ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ نثر و نظم دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی کئی حیثیت سے خدمت کی ہے۔ جمیؔل مظہری کا اصل نام سید کاظم علی اور تخلص جمیؔل ہے۔ اپنے دادا سید مظہر حسن مرحوم کے نام کی نسبت سے خود کو مظہری کہلاتے تھے۔ ان کی پیدائش ۲ر ستمبر ۱۹۰۴ء کو محلّہ مغل پورہ، پٹنہ میں ہوئی۔ جمیؔل مظہری نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ملک کو غلامی کی زنجیروں میں گرفتار پایا۔ تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی اور ایک ہوائے انقلاب سے وطن کی گراں خوابی کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ آپ کے آباء و اجداد غازی پور یوپی کے تھے لیکن ان کے جداعلیٰ مولانا سید ریاض الحسن سلسلۂ معاش کے لئے ترکِ وطن کر کے عظیم آباد آ گئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور مدرسہ سلمانیہ پٹنہ میں ہوئی۔ آپ کے والد مولوی خورشید حسین خورشید فارسی و اردو کے معلم تھے۔ دو سال بعد جب ان کے والد کا تبادلہ مظفر پور ہوا تو آپ وہیں جا کر ضلع اسکول میں داخل ہو گئے۔

جمیؔل مظہری ۱۹۲۷ء میں بی اے کے طالب علم تھے۔ آپ نے سید رضا علی وحشتؔ کلکتوی کی خدمت میں ایک قطعہ پیش کر کے ان کی شاگردی قبول کی۔ یوں تو ہر چھوٹا بڑا شاعر اپنے کلام کے ذریعہ دنیا کو اپنے افکار سے مستفیض کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن کربلا کے واقعے کو مفکر کی نظر سے دیکھ کر شاعری کی زبان میں ادا کرنا بہت مشکل ہے۔

جمیؔل مظہری نے چودہ سال کی عمر میں اپنی شاعری کی ابتداء ''سلام'' سے کی۔ ان کی مرثیہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۰ء میں ہوا اور ''عرفانِ عشق'' ان کا پہلا مرثیہ تھا۔ دوسرا مرثیہ ''پیمانِ وفا'' ہے یہ جارج پنجم کی سلور جبلی پر کہا گیا تھا اور ماہِ عزا کے موقع پر ہی سلور جبلی کے لئے چراغاں کا اہتمام کیا گیا تھا جس کے لئے انہوں نے یہ مرثیہ ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا۔ تیسرا مرثیہ ''عزمِ محکم'' ہے۔ یہ انہوں نے اپنے قید و بند کے زمانے میں لکھا تھا۔ اس مرثیہ میں حضرت زینبؑ کی زبانی مکالماتی بند ادا کروائے ہیں۔ چوتھا مرثیہ ''مضرابِ شہادت'' ہے جو تقسیم ہند کے بعد کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ پانچواں مرثیہ ''افسانۂ ہستی'' اور چھٹا مرثیہ ''شامِ غریباں'' ہے۔ یہ جمیل مظہری کا سب سے کامیاب مرثیہ ہے۔ ساتواں مرثیہ ''لمحۂ غور'' آٹھواں مرثیہ ''علمدارِ وفا'' ہے۔ یہ حضرت عباسؑ کی شان میں لکھا گیا ہے۔ نواں مرثیہ ان کا آخری مرثیہ ہے جو ''حقیقت نور و نار'' ہے۔

جمیؔل مظہری کا شمار ملک کے نامور اور جدید مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے مرثیہ کو نئی





سمت اور ایک نئی جہت عطا کی۔ اب تک آپ کے مراثی کے دو مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''نقش جمیل''، ''عرفان جمیل''، ''فکر جمیل'' اور ''وجدان جمیل'' آپ کی کتابوں کے نام ہیں۔

جمیؔل مظہری کے مرثیوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی نظر کو پہلے وسعت دینی ہوگی۔ مرثیہ کی راہ میں کتابیں اور مکتبی دیوار کھڑی ہے ہمیں اسے گرا کر ذہن کو کشادگی بخشنی ہوگی۔ تب ہی ہم جمیل مظہری کے مرثیہ کو سمجھ سکیں گے۔

عرفان جمیل'' کا پہلا مرثیہ ''عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا'' در حال شہدائے کربلا'' ہے۔ اس میں ۳۷ر بند ہیں۔ تاریخ تصنیف ۱۹۳۰ء ہے۔ واقعہ کربلا دراصل عشق ہی کی ایک تفسیر ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا — اور رہا ہو کے گرفتارِ بلا ہو جانا
بے پیئے مستِ مَے جامِ فنا ہو جانا — بس کہ دشوار ہے پا بند وفا ہو جانا
قید یہ اس میں بڑی ہے کہ دل آزاد رہے
فکرِ انجام نہ ہو کوشش برباد رہے

اہل دل عشق کو اک مشق فنا کہتے ہیں — گرمیِ انجمن ارض و سما کہتے ہیں
عرفان قلب مکرر کی صفا کہتے ہیں — ہم مسلماں ہیں محبت کو خدا کہتے ہیں
وہ محبت نہیں جو ایک سے بدنام رہے
وہ محبت جو خدائی کے لئے عام رہے

مرثیہ نگاری میں جمیل مظہری نے فکر و نظر سے کام لیا ہے۔ قومی و سیاسی شاعری کا ''پیوند مرزا اوج لکھنوی نے لگایا تھا۔ دوسرے شاعر جمیل مظہری ہیں جنھوں نے پیوند اس حسن و خوبصورتی کے ساتھ لگایا کہ مرثیہ کے فنی تقاضے مجروح نہیں ہوئے۔ ''عرفان جمیل'' کے جس مرثیے میں سیاسی عنصر سب سے زیادہ نمایاں اور یادگار رہے وہ ''پیمانِ وفا'' ہے۔ ''رہبری کرتی ہے مقصد کی اشاعت کیونکر'' بند ۹۳ در حالِ سفر جناب سید الشہداءعلیہ السلام، تاریخ تصنیف ۱۹۳۶ء یہ ''عرفانِ جمیل'' کا دوسرا مرثیہ ہے۔ جس میں جمیل مظہری نے جناب سید الشہدا کا سفرِ حال بیان کیا ہے۔ دو بند دیکھئے۔

رہبری کرتی ہے مقصد کی اشاعت کیونکر — منتقل ہوتی ہے سینوں سے حرارت کیونکر
بدل جاتی ہے زمانے کی طبیعت کیونکر — بولتی ہے لبِ انساں سے مشیت کیونکر
دل سمجھتے ہیں حوادث کا اشارہ کس طرح
وقت کا پھیر دیا جاتا ہے دھارا کس طرح

گھر سے نکلا تو سوئے خانۂ مسجود چلا یعنی عابد طرفِ کعبۂ معبود چلا
ایسے رستے سے سوئے منزلِ مقصود چلا ساتھ ساتھ اپنے لئے تحفۂ موعود چلا
یعنی بیٹے بھی ، بھتیجے بھی ، برادر بھی تھے
ساتھ گہوارے میں عبد اللہ اصغر بھی تھے

اس مرثیہ میں آئین مذہب پر ایک عالمانہ بحث ہے۔جمیل مظہری اسلام کی زریں خدمات کی یاددلاتے ہیں اورعوام کواس سورۂ حسنہ کی جانب متوجہ کرتے ہیں جس کی بقا کے لئے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی جان قربان کردی تھی۔جمیل مظہری نے ''عرفان جمیل'' کے مرثیے ''عزم محکم'' میں مکالماتی طرز بیان اختیار کر کے اسے ڈرامائی وصف سے نوازا ہے۔سارا منظر تصور کے سامنے آجاتا ہے۔اس موقع پر سیرت نگاری کا پورا حق بھی ادا ہوتا ہے۔اس مرثیہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام اوران کی ہمشیر جناب زینب علیہ السلام کی گفتگو نقل کی گئی ہے کہ کیسے جناب ثانیٔ زہرا اپنے خیمہ میں بے قرار و بےچین ٹہل رہی ہیں۔ ''عزم محکم'' عرفان جمیل کا تیسرا مرثیہ ہے۔''کھولا عروس شب نے جوزلفِ درازکو'' درحالِ شہدائے کربلا و جناب امام حسینؑ میں ۱۲۰/بند ہے۔تاریخ تصنیف ۱۹۴۲ء ہے۔اس مرثیے میں جمیل مظہری نے جناب زینبؑ کے باعظمت کردار کی جو نقاشی اور تصویر کشی کی ہے ویسی عکاسی انیسؔ و دبیرؔ بھی نہیں کر سکے۔امام حسینؑ اور جناب زینبؑ کی گفتگو پر غور کیجئے،جس میں جناب زینبؑ کی سیرت کی عمدہ مثال ملتی ہے۔

کھولا عروسِ شب نے جو زُلف دراز کو خواب گراں نے پیار کیا چشم ناز کو
شعلہ بنایا نرگسِ جادو طراز کو جھولکا دیا تخیلِ راز و نیاز کو
سر سے ردائیں ڈھل کے سرِ دوش ہوگئیں
انگڑائیاں تصورِ آغوش ہو گئیں

کیونکر نہ اوڑھے پیرِ فلک چادر عزا ہے یہ شب شہادت سلطان دوسرا
صحرامیں نصف شب سے ہے جاروب کش صبا کیوں کر نہ ہو کہ ارضِ مقدس کی یہ فضا
مشہد بنے گی سبطِ رسالتؐ پناہ کی
شبنم سے دُھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی

''عرفان جمیل'' کا چوتھا مرثیہ ''مضراب شہادت'' ہے۔''جنبش سے پرے خامۂ افسوں طراز کی'' میں بند۳۰۷/رہے۔درحال جناب سید الشہداءعلیہ السلام اور تاریخ تصنیف ۱۹۵۱ء ہے۔اس مرثیے کے بندوں میں جمیل مظہری نے صرف قوم کے حال کا رونا نہیں رویا ہے بلکہ ان کے سامنے تمام انسانیت ہے۔وہ انسان جو ترقی کے اس دور میں بھی بھوکا ہے۔''مضراب شہادت'' کے ان بندوں کا بغور مطالعہ کریں تو شاعر کے حساس دل





کی دھڑکن صاف طور پر سننے کو ملے گی۔

مضراب بڑھ کے کردی مہیا حُسینؑ نے خوں اپنا نبضِ وقت کو بخشا حسینؑ نے
خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑا حسینؑ نے فطرت کو کر دیا تہہ و بالا حسینؑ نے
اللہ رے صبر سنگ کا دلِ آب ہو گیا
ہر ماجرا فسانۂ مضراب ہو گیا

ممکن ہے اس سے قوم کو کچھ زندگی ملے غفلت کو حس ، جمود کو کچھ بے کلی ملے
غیرت ملے، شعور ملے، آگہی ملے مستقبلِ حیات کو اکِ روشنی ملے
میں جانتا ہوں مصلحتِ بے نیاز کو
مضراب چاہیے دلِ انساں کے ساز کو

اردو مرثیوں میں جنگ کے مناظر کو پیش کرنا اردو مرثیہ نگاروں کا خاص شیوہ رہا ہے۔جنگ کے منظر کے ساتھ تلوار کا ذکر بھی ضروری ہے۔امام حسینؑ اوران کے رفقاء نے جو جنگ کی اس میں تلوار کا خاص حصہ رہا ہے۔بعض شہادتیں تیر برچھی سے بھی ہوئیں جس سے شہداء کے جسم پاش پاش ہوگئے۔جمیل مظہری نے تلوار کی تعریف میں بھی مرثیے قلمبند کئے ہیں۔''مضراب شہادت'' سے تلوار کی جنگ کا ایک منظر پیش ہے۔

اس تیغ دو زبان میں طاقت بلا کی ہے تلوار کیا ہے حجت قاطع خدا کی ہے
کیوں کر نہ شوخ ہو کہ سہیلی قضا کی ہے ناز اس پہ ہے کہ تیغ شہِ لافتا کی ہے
چاٹا تھا ظالموں کا لہو ہنروان میں
پیاسی ہے جب سے کیوں نہ ہو خشکی زبان میں

پانچواں مرثیہ ''افسانہ ہستی''،''خم بہ خم کا کل ہستی کا فسانہ ہے عجیب'' درحالِ حضرت عونؑ و محمدؑ ہے۔اس میں بند۴۷ ہے اور تاریخ تصنیف ۱۹۵۷ء ہے۔جمیل مظہری نے اس مرثیہ میں جناب زینبؑ کے دولختِ جگر حضرت عونؑ و محمدؑ کا حال بیان کیا ہے۔دونوں نونہالوں کی جنگ کا نقشہ کھینچا ہے،ان کی پیاس کی شدت کو بیان کیا ہے۔'افسانۂ ہستی' کے حوالے سے دو بند پیش نظر ہیں۔

تھے جو کمسن تو طریقہ تھا نرالا ان کا زد پہ آگئے تیڑھا کیا بھالا ان کا
نوک شمشیر سے عمامہ اُچھالا ان کا ایک ہی ضرب میں ارمان نکالا ان کا
جو کہ تلوار کو بچپن سے کھلونا سمجھیں
کیوں نہ وہ جنگ کے میداں کو گھروندا سمجھیں

تمنچے ان کے ہلالی تھے کہ ابروئے اجل کاٹ کر رکھ دیا دو بچوں نے سارا جنگل

دو بچھیڑوں نے مچا دی تھی صفوں میں ہلچل — صفِ اول صفِ آخر صفِ آخر اول

پھینک کر بار غلط پشت سے گھوڑے بھاگے

گھوڑے پیچھے رہے اس طرح بھگوڑے بھاگے

مراثی میں منظر نگاری کا تعلق موضوع سے ہوتا ہے۔صرف تفریحی شاعری نہیں ہوتی۔اگر موضوع سے ہم آہنگی نہیں تو منظر نگاری بے معنی ہو جاتی ہے۔منظر کشی کی ضرورت تو مرثیے میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ جمیل مظہری کا چھٹا مرثیہ ''شامِ غریباں'' شاعری میں بحرِ معانی کا تلاطم ہے۔اس میں بند۸۱۰/اور تاریخ تصنیف ۱۹۶۳ء ہے۔فن شاعری پر ایک فاضلانہ بحث کی ہے اور اسالیب بیان، لفظ و معنی کے روابط، علامات نغمگی اور اخلاص جذبہ اور صداقت شعری کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔مندرجہ ذیل بند ان کی تنقیدی بصیرت اور رموز شاعری سے گہری واقفیت کا علم دیتے ہیں۔

شاعری کیا ہے فقط قصہ زلف و رخسار — ہے یہ جذبات کی نقاش تو جذبے ہیں ہزار

جذبہ حب وطن جذبہ عزم احرار — جذبہ مہر و فا جذبہ رحم و ایثار

صبر خدام ہو یا غیرت سائل ائے دوست

کتنے جذبا ت ہیں تشریح کے قابل اے دوست

آج اٹھتا ہے دھواں شامِ غریباں سے جمیلؔ — شور ماتم ہے عزا خانۂ ویراں سے جمیلؔ

نیکیاں کیوں نہ اُگیں مزرعِ ایماں سے جمیلؔ — آبیاری جو ہوئی خونِ شہیداں سے جمیلؔ

اس میں ہے خونِ دل زینبؑ کبریٰ بھی شریک

ان کے آنسو بھی شریک اُن کا پسینہ بھی شریک

'مرثیہ شام غریباں'' حضرت زینبؑ کے حال میں قلمبند کیا گیا ہے۔اس میں جمیل مظہری نے کربلا کے میدان میں جو جنگ ہوئی تھی اس منظر کشی کی عکاسی کی ہے۔ان کا ساتواں مرثیہ ''لمحہ غور'' ہے اس مرثیے کے اول دو مصرعے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جمیلؔ مرثیہ کے پردے میں کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

آج دنیا میں نہ شب ہے نہ سویرا ہے جمیل — کچھ سیاست کے کہاسوں نے بھی گھیرا ہے جمیل

جوش اور جذبے کے اضطراب اور قوتِ بازو کو جمیلؔ مظہری نے مرثیہ ''علمدار وفا'' میں لکھا ہے۔ یہ حضرت عباسؑ کی شان میں لکھا گیا ہے جس میں حضرت عباسؑ کی بہادری اور جاں سپاہی کو ظاہر کرتے ہیں 'علمدار وفا' کے دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

بجلی چمک رہی تھی جنوب و شمال میں — بجلی چمک رہی تھی سہال و جبال میں

ظلمت میں آفتاب کی پہلی کرن تھا وہ — جس طرح دفعتاً ہو اُجالا خیال میں





نوک اس کی ایک آیت ربِّ جلیل تھی

ظلمات کفر و شر میں سحر کی دلیل تھی

پھٹنے لگے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر — بکھرے ہوئے سروں کے تھے جنگل اِدھر اُدھر

لاکھوں ہیں اور ہوش کسی کے بجا نہیں — بھگدڑ یہاں وہاں ہے تو ہلچل اِدھر اُدھر

کہتی تھی عقل گوش پر ایماں فروش میں

بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش میں

اس مرثیے میں انہوں نے تیسرے مصرعے کو قافیے کی پابندی سے آزاد رکھا ہے۔اور بھی کئی مرثیے ہیں جن میں اسی طرح بند کے تیسرے مصرعے کو آزاد کیا ہے۔نیزے کی نوک کو آیت جلیل کہنا ایک نازک تشبیہ ہے جس سے فطری طور پر ایک چمک سی پیدا ہو جاتی ہے۔ڈھالوں کے بادل کا پھٹنا اور سروں کے جنگل کا استعمال جمیل مظہری کی قوت پیکر تراشی کی پختگی کو ظاہر کرتا ہے۔''حقیقت نور و نار'' ان کا نواں اور آخری مرثیہ ہے۔جمیل مظہری اس مرثیہ کے بند میں 'ستی' کی رسم کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔بند دیکھئے۔

آگ ہے آگ دلِ خستہ دلاں تک پہنچے — بن کے پروانہ رخِ شمع کرخاں تک پہنچے

بات چھپنے کی نہیں ہے کہ چھپائی جائے — دلِ تخلیق کا یہ راز جہاں تک پہنچے

شہہ رگِ بیوۂ مجبورِ وفا تک جائے

کسی مجبور سہاگن کی چتا تک جائے

مرثیہ میں جمیل مظہری نے فنکارانہ طلسم کاریاں دکھائی ہیں۔ان کی طبیعت خیال بندی کے لئے نہایت موزوں تھی۔انہوں نے اپنے مرثیہ میں واقعہ کربلا کو امام حسینؑ کا کارنامہ تو بتایا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ امام حسین کو ایک عظیم انسان کی حیثیت سے عالم انسانیت کے لئے نجات کا ذریعہ بھی بتایا ہے۔امام حسینؑ کا کردار تمام انسان کے لئے راہیں دکھاتا ہے۔مثلاً

یوں اٹھایا علم فوج کہ ہے نام اب تک — سر اٹھائے ہوئے ہے پرچم اسلام اب تک

جمیل مظہری نے عام روش سے ہٹ کر مرثیے لکھے ہیں۔اسی لئے ان میں انفرادیت ہے۔

**Syeda Tafsir Fatma**
At - Moghalpura, Husainabad
P.o. - Mirjahat, Mojahidpur
Distt. - Bhagalpur

## آسماں خاتون

# ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری : ''خلش بے نام سی''

صادقہ نواب سحر خواتین اردو افسانہ نگاروں میں ایک بلند مقام رکھتی ہیں۔ وہ فن افسانہ نگاری کے تمام رموز نکات سے واقف ہیں اور انہیں اپنے عہد کے معاشرتی زندگی کے مسائل سے بھی بھرپور واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں معاشرتی زندگی کے مختلف مسائل کو پیش کرتی ہیں جس میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، نفسیاتی اور جنسی مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات آنکھوں کے سامنے پیش آئے ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر چونکہ درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ انہیں طلبہ وطالبات کے جذبات، احساسات اور نفسیات کا مشاہدہ کرنے کا موقع بہت قریب سے ملا ہے۔ لہٰذا موصوفہ اپنے افسانوں میں کالج کی زندگی اور وہاں کی ہمامی کے مسائل ان کا استحصال اور پھر نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے نفسیات جنریشن گیپ کی وجہ سے نوجوان نسل کے سوچ، مزاج اور فکر میں تبدیلی فیشن زدہ ماحول اور اس معاملے میں کسی قسم کی مداخلت کا برداشت نہ کرنا جیسے موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔

صادقہ نواب سحر کی تمام کہانیوں اپنے عہد کے مسائل، جیتی جاگتی زندگی، بڑے شہر کی ہل چل، نئی نسل کی سوچ لڑکیوں کے مسائل، دولت کمانے کی ہوس وغیرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ جو ہمیں بار بار مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں نے ''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری: خلش بے نام سی کی روشنی میں'' عنوان منتخب کیا۔ خلش بے نام سی مجموعہ کی پہلی کہانی ''شیریاں والی'' کے عنوان سے ہے جس میں مختلف کرداروں کے توسط سے صادقہ نواب سحر نے ایک پسماندہ مسلم خاندان اور وہاں کی معاشی تنگ حالی اور اس سے پنپنے والی برائیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

''شیریاں والی'' کے اس کہانی میں صادقہ نواب سحر نے ایک مسلم ماحول کا نقشہ کھینچا ہے جہاں غربت آنکھیں پھاڑے کھڑی ہیں۔ وہاں عورتوں کی تین شادی کرنے میں کوئی سماجی بندش نہیں۔ مرد بھی دو تین شادی کرنا کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ صادقہ نواب سحر نے شیریاں والی کی اس ہیروئن نصیباً کے حوالے سے سماجی زندگی کی کئی تہیں کھولی ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے یہاں و ہندوانہ رسم ورواج ہیں اس کی طرف بھی اشارے کیا ہے۔ کہانی پنجاب کی سماجی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ مثلاً :

ISSN : 2582 - 3612



> ''مسلمانوں میں بھی منگل سوتر ضروری ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ اس کے نصیب پر لوگ کہتے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے گھروں کی ساری شادی شدہ لڑکیاں، عورتیں ساڑیاں پہنتی تھیں اور نصیباً کنواریوں کی طرح شلوار قمیض۔ اس لیے نصیباً اب ''شیریاں والی'' یعنی شلوار والی کہلاتی تھی۔ اس اصلی نام لوگ بھول چکے تھے۔'' (ص۔۱۰)

اس کہانی میں نصیباً پوری طرح قاری کے ذہن ودماغ پر چھائی رہتی ہے۔ وہ زمانہ اور حالات کی ماری ہوئی ہے اسے کئی بار بیوگی کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔

شوہر اس کے نصیب میں آئے اسے کسی سے شکایت نہیں رہی۔ اس کی صرف ایک تمنا تھی کہ مستان کے گھر والے اسے قبول کرلیں اور وہ اس کے بچوں میں گھل مل جائے لیکن اس کا موقع اسے نہیں مل سکا۔ اسے سب سے بڑی خوشی اس وقت ہوتی جب رقیہ نے کہانی کے اختتام پر اسے چھوٹی امی کے نام سے پکارا اور اس کے پیر پر گرگئی۔ صادقہ نواب سحر نے اس کہانی میں جذبات نگاری کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے اور اپنے کئی مقامات آئے ہیں مثلاً حج کے پہلے جاتے وقت نصیباً جو بات اپنی بہن سے کہی ہے اس میں بھی جذبات نگاری ہے اور اس سے زیادہ جذبات نگاری اس وقت اجاگر ہوتی ہے جب نصیباً بغیر بلائے مستان خاں کے پرانے مکان میں چلی جاتی ہے :

> ''السلام علیکم۔ دروازہ کھولتے ہی اسے پہچان کر چھوٹی بیٹی نے جھٹ سے سلام کیا تو اس نے خوشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔''
>
> ''تم رقیہ ہونا بیٹا!
>
> جی
>
> امّاں سے کہنا چھوٹی امی آئی ہے۔ اور اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑا تھیلا رقیہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔
>
> تمہاری آپا کی شادی کے لیے۔۔۔۔۔
>
> ''چھوٹی امی! بچی نے حیرانی سے پوچھا اور تھیلا لے کر اندر چلی گئی۔ ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے۔ تمہارا جو رشتہ ہے وہ ہمارے ابّا سے ہے۔ اس دروازے پر پھر قدم نہیں رکھنا۔ کچھ دیر بعد چار بیٹے دروازے پر آئے اور اس سے کہہ گئے۔ نصیباً کی اس کھلے دروازے کے اندر ایک قدم رکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ کافی دیر تک وہ چوکھٹ کے کنارے بیٹھی رہی۔'' (ص۔۱۲)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

صادقہ نواب سحر کی یہ کہانی کردار پر مبنی ہے اور اسے ہم معاشرتی زندگی پر مبنی بہترین کہانی قرار دے سکتے ہیں۔

صادقہ نواب سحر نے بہت ہی ہنرمندانہ طریقے سے بمبئی کے نچلے طبقے کے مصائب اور مسائل کو اس چھوٹی سی کہانی میں پیش کیا ہے۔ ہر شخص یہاں بھیڑ میں گم ہے۔ طرح طرح کے اس کے مسائل ہیں اور وہ ان مسائل میں ایسا گھرا ہوا ہے محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ کہانی کا بیانیہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی کرب آگہی زندگی کی ایک مثال ملاحظہ ہو جس کی آپ بیتی جگر بیتی بن جاتی ہے۔

ارے صاحب بمبئی میں اتنا ٹریفک ہوگیا ہے کہ کیا بولے گا۔ مزہ بولے تو سالا ایئرپورٹ کا بھاڑا مارنے والے لوگ کا ہے۔

ایئرپورٹ سے کولابہ جاتا ہے۔ ہیرو لوگ کا اسٹائل مارتا ہے۔
بمبئی میں تو ٹیکسی چلانے کا مزہ نہیں ہے صاحب۔
زندگی بھر ٹیکسی چلا کے بھی بمبئی میں لاکھ روپیہ کا ایک جھونپڑی نہیں لے سکتا۔
بس ''دو ٹائم کا کھانا مل جاتا ہے'' (ص۔۲۴)
اس مجموعے میں شامل کہانی شرارہ ہے۔

اس کہانی میں صادقہ نواب سحر موجودہ عہد کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی فکری رومان اور کسی معاملے میں ذاتی انتخاب کو فوقیت دینے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کہانی میں ایک روشن خیال مڈل کلاس فیملی کی لڑکیوں کی ذہنی اٹھان کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے معاملے میں کسی کسی طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں کہانی کی ابتدا بہت ہی المناک ماحول میں ہوئی ہے جس میں کہانی کی ہیروئن رانا کے رونے کا واقعہ ہے :

''رانا نے جاوید کو دیکھا مگر اس کا اثر کچھ دیر سے ہوا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ پھر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دوڑی اور جاوید سے لپٹ گئی۔ جاوید مجھے معاف کردو اس کے بھولے چہرے پر زلفیں اڑی ہوئی تھی سوجی ہوئی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور بے چین نظریں جاوید کے خوبرو چہرے پر ٹکی ہوئیں۔
گھبرا گیا۔ رعنا کا حسین چہرا اس کے بازوؤں میں ڈھلک گیا۔ اب جاوید بری طرح پریشان ہوگیا یہ لڑکی ہے! صبح جھگڑ رہی تھی اور اب اتنے میں ان کی نظر اپنی پھوپھی جان، چھوٹی آپا اور بڑی آپا پر پڑی امی کی رم جھم آنسو برساتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور چھوٹی اور بڑی آپا کے چہرے پر مسکراہٹ





پھسل گئی تھی۔'' (ص۔۳۱)

اس کہانی میں صادقہ نواب سحر کی فکری وفنی عظمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ کہیں بھی اظہار و ابلاغ کس مسئلہ نہیں رہتا۔ یہ کہانی کی ابتدا راعنا کے رونے سے شروع ہوتی ہے اور کہانی کا اختتام راعنا کی مسکراہٹ اور خوشی پر ہوتا ہے۔ افسانے میں جو بیانیہ زبان استعمال ہوتی ہے اس میں لہجہ کا برتاؤ قابل توجہ ہے اور لہجے میں ڈرامائی خاصیت موجود ہے۔

**منّت** : یہ کہانی ایسی مجبور لڑکی کی کہانی ہے جو زندگی کا کوئی سُکھ نہیں اٹھا سکی اس کی شادی نہیں ہوسکی موکتا جو نہایت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ 18 سال میں اس کے جسم کا گدراپن، تیکھیں آنکھ کے نقوش، کھلتا ہوا رنگ دیکھ کر محلے کے لڑکے تلملا اٹھتے، کبھی کبھی طنز بھی کرتے کہ مجھ سے شادی کروگی۔ موکتا کے خاندان میں ماں باپ کے علاوہ بھائی اور دو چھوٹی بہنیں بھی تھیں موکتا کی شادی اس لیے بھی نہیں ہوسکی کہ نسوانی مرض نے اس کو گھیر رکھا تھا :

''اگلی بار تبھی آؤں گی جب میری منوتی پوری ہوگی۔ بہن کی آتی اپنی بہو کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں۔ ہے وٹھل پانڈرونگ! میری سون کی گود بھر دے اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے شردھا سے کہا تھا اور وہ ہری وٹھل، ہری وٹھل ہری دلا کا جاپ کرنے لگ گئیں۔ (ص۔۵۹)

صادقہ نواب سحر نے اس افسانے میں تجسس کی وہی فضا قائم کی ہے کردارنگاری میں فنی ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ مثلاً موکتا کی کردارنگاری میں بیانیہ کی تفصیل کی جگہ دی ہے۔

دیکھئے اقتباس :

''اس وقت موکتا اٹھارہ سال کی تھی گدرائے جسم کی تیکھیں نین نقش، درمیانہ قد، کھلتا ہوا رنگ، شوخ رنگ چوڑیوں سے ہاتھ بھرے ہوئے بیچ مانگ، دو چوٹیاں لال ربن سے بندھی ہوئی بڑھے کھرے کے لہنگے جیسا ٹخنوں تک پر کر، اور شرٹ جیسا چھوٹا کرتا، ماتھے پر کم کم کا ٹیکہ کھیت پر باپ کو کھانا دینے جاتی، تو گاؤں کے لڑکے آہیں بھر کر دیکھتے۔ بین کی آنکھ چل جاتی اور وہ فوراً آنکھ پکڑ کر گرانے لگتا۔ کیوں کہ اک کراس کو موکتا گھورتی۔'' (ص۔۵۲)

جہاں تک کہ اس کہانی میں فنی رموز ونکات کی بات ہے۔ صادقہ نواب سحر نے اس کے برتاؤ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے کہانی کے کردار قاری کے ذہن پر چھاتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی کی ہیروئن موکتا سے قاری کو شروع سے آخر تک المیاتی دور سے گزرتی ہے اس کی ماں

گرچہ تیمارداری میں کوئی کمی نہیں رکھتی کہیں اسے یہی غم ستائے جارہا ہے کہ موکتا کا انتقال اس کی زندگی میں ہوتا ہے پھر کوئی غم لے کر نہ مرے۔

کہانی کے اختتام پر سندر کے کردار کہانی کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔موکتا سندر سے ملاقات کے بعد جس رنج وغم میں مبتلا ہوتی ہے یہی اس کی موت کا سبب بنتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب سحر کی یہ کہانی فن کار کے گہرے مشاہدات، انسانی نفسیات سے پوری آگہی اور ایک جوان دل کے احساسات وجذبات کی ضامن ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی'' کے تجزیے سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے موصوفہ فن افسانہ نگاری کے رموز ونکات سے واقف ہیں۔انہیں اپنے عہد کے معاشرتی زندگی کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی ہے جس میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، نفسیاتی اور جنسی مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔16 افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ صادقہ نواب سحر کا مقام اردو افسانے میں متعین کرتا ہے۔

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ نواب سحر کی تمام کہانیاں اپنے عہد کے مسائل، دولت کمانے کی ہوس وغیرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔طرز تحریر بہت ہی سادہ اور رواں ہے۔الفاظ خود بہ خود زبان پر پھسلتے چلے جاتے ہیں۔جس طرح کا کردار ہے اسی طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے جہاں پر ضروری سمجھا داکٹر صادقہ نواب سحر نے دانشوری کا بھی ثبوت دیا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں جن خواتین فن کاروں کی تخلیقی توانائی کے سہارے اردو فکشن آگے بڑھ رہی ہے ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا بھی ہے۔

**Asma Khatoon**
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Ranchi University
Ranchi (Jharkhand)

ISSN : 2582 - 3612



حُسنِ جہاں

# تانیثی سروکار اور عصمت کا ناول ''ٹیڑھی لکیر''

انیسوی صدی کی آخری دہائی میں جا گیردارانہ نظام سے تنگ اور اوب چکی زن، معاشرے اور سماج کے بے شمار بندشوں کا شکار سمٹی، سہمی، ڈری ہوئی اور خوف وہراس کے ماحول میں سانس لے رہی عورت بیسوی صدی کے چوتھے عشرے تک پہونچتے پہونچتے اس قابل ہو چکی تھی کہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے قالب وسانچے میں ڈھل کر اپنے اظہار کے لئے الگ اور منفرد راستے منتخب کر سکے اور نئی نئی راہیں اپنی تلاش وجستجو سے معرض وجود میں لا سکیں۔

بیسویں صدی کے صفِ اول اور اردو کے نامور فکشن نگاروں میں عصمت چغتائی محتاجِ تعارف نہیں ہیں، اردو فکشن نگاری میں عصمت چغتائی نسوانی کردار، طے شدہ اقدار وروایات، زمیندارانہ وجاگیردارانہ نظام میں جکڑی اور مقید، طاقت وطبقات کے پیچ وخم کو پھلانگ کر اور روند کر اپنے لئے الگ راہیں اور نئی جہتیں نکالتے ہوئے نظر آتی ہیں۔

بیسویں صدی کا ابتدائی دور سیاسی وسماجی تبدیلیوں کا دور تھا، اس دور میں معاشرتی نظام میں بڑے پیمانے پر تغیرات اور انقلابات رونما ہو رہے تھے، آزادئ نسواں کے بیباک نعرے فضا میں گونجنے لگے تھے، ایسے میں کئی خاتون خانہ آزادئ نسواں کے علمبردار کے طور پر سامنے آتی ہیں، وہیں سے اردو فکشن میں تانیثیت کے ابتدائی نقوش ملنے شروع ہو جاتے ہیں، جنھوں نے ان تمام فرسودہ اور استحصالی طرزِ نظام کے حصار کو یکسر ڈھا دیا اور ایک ایسی روایت کی بنا ڈالی گئی جس کی آبیاری عصمت چغتائی اور دوسرے فکشن نگاروں نے کی اور اس رجحان وفکر کو آگے بڑھایا۔

اردو ادب میں عصمت چغتائی ایک ایسی مشہور ومعروف ناول نگار ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے دور میں ناول کے فن میں نمایاں مقام حاصل کیا، عصمت ایک ترقی پسند فکشن نگار کی حیثیت رکھتی ہیں اور اپنے دور کی اہم فنکار ہیں، ناول کی دنیا میں ان کے بنائے ہوئے نقوش ہمیشہ خاص اہمیت کے حامل رہیں گے، نہ جانے کتنے ہی چھوٹے بڑے ناول لکھ کر انہوں نے نہ صرف اس صنف سے اپنی دلچسپی کا بھرپور ثبوت دیا ہے بلکہ اپنے طرز کی ایک ممتاز اور بیباک فکشن نگار بن گئیں، انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سماج کی تمام مظلوم ومقہور آبادی کے حق میں آواز بلند کیا ہے، نیز جنسی میلان، سماجی

بے راہ روی، قدامت پرستانہ رویہ، نسائی خودمختاری اور تعلیم نسواں پر بے باکی کے ساتھ اپنے قلم وفکر کے جوہر دکھائے ہیں۔

عصمت جو کچھ کہنا چاہتی ہیں وہ بلا جھجھک اور نڈر ہو کر کہتی ہیں جو انہیں دوسرے فکشن نگاروں سے ممتاز بناتی ہے۔ انہوں نے اپنے فکشن کے ذریعے خواتین ومرد کے درمیان پائی جانے والی نابرابری کے خلاف آواز اٹھائی ہے بلکہ یوں کہیں کہ مرد اساس سماج میں عصمت چغتائی عورت کو آزادانہ طور پر سوچنے ، فیصلہ کرنے اور اپنے طور پر اپنی زندگی جینے کا احساس دلاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی فکر کا یہ دھارا بچپن سے ہی ان میں موجود تھا، کیونکہ بچپن میں ہی انہوں نے والدین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دیا تھا، بلاشبہ عصمت نے اپنی طرز زندگی اور اپنی تحریر دونوں سے ہی خواتین کو یہ پیغام و پیام دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی ایک انسان ہیں اور ان کی بھی اپنی خودمختاری اور آزادی ہونی چاہیئے، بقول شبنم آرا :

> ''عصمت چغتائی کی زندگی اور تحریر دونوں اس بات کی شاہد ہیں کہ انہوں نے عورت کی انسانی حیثیت کو پہچانا، معاشرے میں اس کی حیثیت کو مسخ کرنے والی لاتعداد بندشوں اور حصاروں کو توڑنے کی کوششیں کیں اور بے مثل، بے باک تحریروں کے ذریعے ان دقیانوسی ذہنیت اور معاشرتی رسموں اور رواجوں کو سینچنے والے نظام کے خلاف احتجاج کیا۔''

(تانیث کے مباحثے اور اردو ناول، شبنم آرا، ص ۱۹۹-۲۰۰)

عصمت چغتائی کے ذہنی رویے، ان کے تانیثی سلوک اور ان کے تانیثی سروکار کی باتیں کریں تو یقینی طور پر ان کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' بغیر کسی تامل کے ہمارے ذہن میں ابھر جاتا ہے، یہ ناول شمن نامی ایک لڑکی کی سوانح ہے، جو اس کے بچپن اور گھریلو ماحول سے شروع ہوتی ہے اور اس کے انجام تک پہونچتے ہی اس کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی پیش کرتا ہے، اس کی زندگی کے نشیب وفراز یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ مرد اساس سماج کے آگے جھکنا نہیں چاہتی بلکہ آزادانہ طور پر اپنی زندگی جینا چاہتی ہے اور وہی کچھ کرتی ہے جو اس کا دل کہتا ہے، بعض اوقات تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض دوسرے کو نفسیاتی زک دینے کی خاطر بعض باغیانہ عمل انجام دیتی ہے۔

شمن اپنے گھر میں جس طرح صرف نظری ہونے کا شکار ہوتی ہے وہ اسے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے، گھر میں دیگر بچوں کے مقابلے اسے پیار کم دیا جانا اور بات بات پر اسے ڈانٹ پھٹکار ملنا اسے ایک ضدی لڑکی بنا دیتا ہے، وہ زندگی کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اپنی مرضی سے ایک غیر ملکی نوجوانون کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے، بچپن میں جنسی استحصال کا شکار ہونے والی شمن اگرچہ اس طرح نوجوانی

ISSN : 2582 - 3612



میں بھی دھوکہ کھاتی ہے مگر کسی بات کو وہ جی کا روگ نہیں بناتی، اسے جگہ جگہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی زندگی کشمکش سے پر ہے، سماج کی بندشیں بھی اسے اپنے پیروں کی بیڑیاں پہنانا چاہتی ہیں، لیکن وہ کسی بات کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس کے کردار کا یہی پہلو اسے جاندار بناتا ہے اور وہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے، قاری کو اس کی بے راہ رویوں کے باوجود اس سے انس ومحبت پر مجبور کرتی ہے، کیونکہ وہ اسی سماج کی پروردہ ہے۔ پروفیسر عبدالسلام نے شمن کی نفسیات کے لئے ماحول کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، وہ لکھتے ہیں :

> ''عصمت نے ٹیڑھی لکیر میں ایسے کردار کی کہانی بیان کی ہے جس کی زندگی ٹیڑھی لکیر ہے، اس کی فکر اور اس کے عمل کو کجروی عطا کرنے میں اس کے ماحول کو بڑا دخل ہے۔''

(اردو ناول بیسویں صدی میں، پروفیسر عبدالسلام، ص ۳۷۱)

عصمت چغتائی نے اس ناول میں اس عہد کو پیش کیا ہے جب سماج میں تبدیلی آرہی تھی، روشن خیال لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے اسکولوں اور کالجوں میں بھیج رہے تھے، مرد عورت کے درمیان کا دبیز پردہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا لیکن سماج اس کے باوجود اس طرح نہیں بدلا تھا کہ ایک عورت کو کھلی آزادی مل سکے اگر وہ پڑھ لکھ بھی لیتی تھی تو بہت سی باتیں نہیں کہہ پاتی تھی، خاموشی اور سکوت ان کا مقدر تھیں، سوسائیٹی اور سماج و معاشرے کے بنائے خود ساختہ قوانین اور اصول وضابطے انہیں پابند سلاسل کئے ہوئے تھیں جن سرحدوں کو پھلانگنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس صورت حال پر عصمت سے پہلے رشید جہاں نے توجہ دی تھی، لیکن عصمت چغتائی نے اس روایت کو ایک مستحکم ومضبوط بنیاد عطا کیا، خود عصمت چغتائی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ افسانہ 'لحاف' کی اشاعت اور اس مقدمے کے سلسلے میں جب وہ لاہور گئیں تو ایم سلیم نے انہیں سخت سست کہا۔ ان کا بیان ہے کہ :

> ''شاہد صاحب کے ساتھ میں بھی ایم اسلم کے یہاں ٹھہر گئی، سلام ودعا بھی ٹھیک سے نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے مجھے جھاڑنا شروع کر دیا، میری عریاں نگاری پر برسنے لگے، مجھ پر بھی بھوت سوار ہو گیا، شاہد صاحب نے بہت روکا، مگر میں الجھ پڑی: اور آپ نے 'گناہ کی راتیں' میں اتنے گندے گندے جملے لکھے ہیں، باقاعدہ سیکس ایکٹ کی تفصیل بتائی ہے صرف چٹخارے کے لئے، میری اور بات ہے،، میں مرد ہوں۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟،،،، کیا مطلب؟ وہ غصے سے سرخ ہو گئے۔ مطلب یہ کہ آپ کو خدا نے مرد بنایا، اس میں میرا کوئی دخل نہیں اور مجھے عورت بنایا اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں۔ مجھ سے آپ جو چاہتے ہیں وہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

سب لکھنے کا حق آپ نے نہیں مانگا، نہ میں آزادی سے لکھنے کا حق آپ سے مانگنے کی ضرورت سمجھتی ہوں۔، آپ ایک شریف مسلمان خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی ہیں۔اور آپ بھی تعلیم یافتہ ہیں اور شریف مسلمان خاندان سے ہیں، آپ مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں ؟ ہرگز نہیں، میں کلاس میں زیادہ سے زیادہ نمبر پانے کی کوشش کرتی تھی اور اکثر لڑکوں سے زیادہ نمبر لے جاتی تھی۔''

( کاغذی ہے پیرہن، عصمت چغتائی، ص۔۵۱ )

اس طویل مکالمہ نما اقتباس سے اول تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ فحش باتیں لکھنے والا ایک مصنف بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ ایک عورت اس طرح کی باتیں لکھے، دوسری بات یہ کہ عصمت چغتائی نے جس تیور سے اپنی بات کہی ہے وہ مرد عورت کے درمیان تفریق کی کھائی کو پاٹتی ہے اور بلا شبہ یہ کام عصمت چغتائی نے اپنے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں بخوبی کی ہے ۔ یہ ناول سماجی نفسیات کا آئینہ ہے جس میں سماج کا مکروہ چہرہ صاف صاف نظر آتا ہے۔ناول کی شمن اپنا حق طلب نہیں کرتی بلکہ خود کو اس قابل بناتی ہے اور اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔شمن کا کردار ایک خود مختار، آزاد خیال اور اپنی فطرت سے آشنا کردار ہے، یہ ایک ایسا کردار ہے جس کو پڑھ کر اردو ادب کے قاری کے ساتھ اس کا ناقد آج بھی حیران رہ جاتا ہے ۔

عصمت نے اپنے دیگر ناولوں میں بھی نسوانی کرداروں کو ایسے ہی سراپا احتجاج بنا کر پیش کیا ہے۔ عصمت کے ناول کی عورت ایک ایسی عورت ہے جو بظاہر ایک مظلوم کردار معلوم ہوتی ہے، لیکن بباطن ایک مضبوط کردار کے طور پر اپنے حق کے لئے لڑتی ہے اور اپنے سماج کو مجبور بھی کرتی ہے ۔بقول عظیم الشان صدیقی :

''عصمت کے ناولوں کے ذریعہ عورت پہلی مرتبہ اپنے حقیقی خدو خال، فطرت ونفسیات ، جذبات اور تصورات کے ساتھ اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ صرف مرد ہی کو نہیں بلکہ عورت کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی روپ کیا ہے جس کی تفہیم سے وہ اب تک محروم رہی تھی ۔ناول میں شمن کا کردار بچپن سے ماں بننے تک ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتا ہے۔اضافہ عمر اور ماحول کے ساتھ اس کی شخصیت اور کردار میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان سے بے راہ روی کے بجائے اس کی خود شناسی اور خود مختاری میں اضافہ ہوتا ہے۔''

(اردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصہ، عظیم الشان صدیقی، ص۔۳۸۱ )

ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کی ہیروئن اگرچہ بے راہ روی کے راستے سے ہو کر گزرتی ہے، لیکن عصمت کا کمال یہ ہے کہ اس کردار میں وہ قاری کے لئے ہمدردی کا پہلو رکھ دیتی ہیں۔شمن جس طرح سے اپنی خود





شناسی کے ساتھ خود مختاری کا اعلان کرتی ہے وہ قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے اور قاری اس کی بے راہ روی کو حالات کی مجبوری، سماج کی دین اور مرد کی بے اعتنائی تصور کرنے لگتا ہے ۔

دیگر ترقی پسندوں نے بھی خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق کے تعلق سے بہت کچھ لکھا۔عورتوں کے مسائل بھی ترقی پسند تحریک کے منشور میں شامل تھے۔ترقی پسند مصنفین نے بھی صرف محنت کش طبقہ اور مظلومین کی بات نہیں کی بلکہ سماجی ستم کا ہدف بننے والی عورتوں اور لڑکیوں کی بھی باتیں کیں، لیکن ان میں اور عصمت میں وہی فرق ہے جو نزدیک اور دور کا جلوہ دیکھنے اور دکھانے والوں کے انداز و اظہار میں ہوتا ہے بلاشبہ انہوں نے اپنے ناولوں میں خواتین کے مسائل کو جس انداز اور اسلوب میں پیش کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔

عصمت ایک خاتون ہونے کے ناطے خواتین کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتی تھیں، انہوں نے ایک کردار کے ذریعہ عورت کی نفسیات کو اس حس اور کامیابی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے کہ یہ جگ بیتی آپ بیتی بن گئی ہے۔شمن کی یہ آپ بیتی صرف ایک عورت کی مظلومی اور مرد اساس سماج کے جبر کی داستان نہیں ہے بلکہ اس کے سہارے عصمت نے مرد اساس سماج کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے اور سماج کو بدلنے کی بات بھی کی ہے۔دراصل یہی بات عصمت چغتائی کا اصل مقصد تھی۔کہانی کا ایک کردار افتخار جو باغی اور چالباز بھی ہے، شمن کے دل میں اپنی باتوں کے ذریعہ جگہ بنالیتا ہے، لیکن جب وہ اس سے یہ کہتا ہے کہ اسے چار آدمیوں کی گواہی کی ضرورت نہیں تو دونوں کے درمیان ایک بحث چھڑ جاتی ہے، افتخار کے سوال کا جواب دیتے ہوئے شمن کہتی ہے کہ :

''جن عورتوں کی زندگی اس طرح خراب ہو جاتی ہے وہ کیا کریں ، کیوں صاحب عورتوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے تو مردوں کی نہیں ہوتی ؟ لوگ تو عورتوں کی ہی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں ۔مردوں کی نہیں کرتے ۔مرد پرواہ جو نہیں کرتے !عورتوں سے کون کہتا ہے کہ وہ پرواہ کریں، کہہ دیجئے سماج اور کیا؟ اور یہ سماج بنایا کس نے خود انڈا پھوٹ کر بچہ نکل آیا؟ نہیں تو! جب ہم نے ہی یہ سماج بنایا ہے تو ہم اسے توڑ سکتے ہیں ، مگر اور بھی مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنا پڑتی ہیں........شمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔یعنی بچہ وغیرہ! جی ہاں ! بھئی واہ کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں ۔جبھی تو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہئے.....مگر وہ بچے ہوں گے وہ.......وہ حرامی ہوں گے.........۔''

(ٹیڑھی لکیر، عصمت چغتائی، ص۔۲۴۶ )

لیکن افتخار بھی دھوکہ باز تھا۔ثمن کئی مردوں سے محبت کرتی ہے اور مصنفہ کی نظر میں یہ مرد اساس سماج کو اس کا چیلنج ہے،اس لئے کہ وہ اس طور پر دوسرے مردوں کو جلاتی ہے۔ناول نگار کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجئے :

''وہ ان سب پر یہ ظاہر کئے رہتی تھی کہ اوروں سے تو صرف مروت کی وجہ سے ملتی ہے۔اصل چوٹ تو اس نے لگائی ہے۔اگر ایک سے بے تکلف ہوتی ہے تو چاہتی دوسرا بھی دیکھ لے کہ ایک چولھے پر کھانا پکے تو اپلے کی آنچ بیکار نہ جائے۔کچھ نہ کچھ وہاں بھی بھنتا رہے۔یہ بڑا کارگر حربہ تھا اور اس کی فتح کا سب سے بڑا راز۔''

(ٹیڑھی لکیر،عصمت چغتائی،ص۔۳۹۷)

اسکول میں بے راہ روی،مس چرن کے ساتھ ہم جنسی اور اس کا علم ہونے کے سبب انہیں اسکول سے خارج کئے جانے کے بعد دیگر لڑکیوں کے ساتھ ہم جنسی کے تعلقات،پھر رشید سے محبت،رشید کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد اعجاز کا اسے آغوشِ محبت میں لینے کی کوشش،پھر سہیلی کے باپ رائے صاحب سے محبت اور اپنا مذہب تبدیل کرنے تک آمادہ ہو جانا،رائے صاحب کی موت کے بعد افتخار کے چنگل میں پھنسنا اور بعد میں یہ راز منکشف ہونا کہ افتخار شادی شدہ اور کئی بچوں کا باپ ہے اور لڑکیوں کو دھوکہ دینا اس کی فطرت ہے،پھر ثمن کا آئرش نوجوان رونی ٹیلر سے شادی کرنا یہ ایک ایسی لڑکی کی زندگی کی کہانی ہے جو سکون اور پیار کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتی ہے اور اس کی پوری ذمہ داری اس گھر پر عائد ہوتی ہے جس میں کثرت سے بچے پیدا کرنا اور ان کی تربیت پر توجہ نہ دینے کا چلن رہا ہے،لیکن ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد ثمن کا دل ایک ایسا پتھر بن چکا ہے جس پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔کسی کے دھوکہ دینے پر وہ زیادہ ملول نہیں ہوتی اور اپنی راہ پر کامزن ہو جاتی ہے۔

افتخار کی حقیقت سامنے آنے کے بعد ثمن آئرش نوجوان رونی ٹیلر سے اس لئے شادی کر لیتی ہے کہ وہ فوجی اور محبّ وطن ہے،لیکن ٹیلر سے بھی اس کی نہیں بنتی۔کچھ ہی دنوں کے بعد دونوں میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور ٹیلر جب محاذ جنگ پر جاتا ہے تو پھر واپس لوٹ کر نہیں آتا۔اس طرح ثمن پھر اکیلی ہو جاتی ہے۔لیکن اس کا اکیلا ہونا بھی سماج پر ایک طنز ہے،وہ ساری زندگی مردوں کے ذریعہ بنائے گئے سماج کی چکی میں پستی رہتی ہے وہ جس مرد سے ملتی ہے اس سے دھوکہ ہی ملتا ہے۔اگرچہ یہ سچ ہے کہ ثمن کو اپنے فیصلوں کا کامیاب انجام نہیں ملتا اور بہر حال اس کی آواز بار بار دہائی دیتی ہوئی آواز معلوم ہوتی ہے تاہم ''ٹیڑھی لکیر'' کے حوالے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول یا اس میں ثمن کی آواز اس مرد اساس سماج پر ایک بھرپور طنز ضرور ہے جو خواتین کو اعلیٰ تعلیم اور برابری کے حق سے روکتا رہا ہے۔ثمن اگر ایک نفسیاتی مریض بن گئی ہے تو یہ اس کے





سماج اور ماحول کا عطیہ ہے۔حیات افتخار کے مطابق :

''ثمن کی اس حرکت کے آئینے میں ہمیں ایسے سماج کا عکس بھی نظر آتا ہے جہاں والدین دھڑا دھڑ بچے پیدا کرنا تو جانتے ہیں لیکن ان کی طرف سے عائد ہونے والے بنیادی فرائض سے کوتاہی برتتے ہیں،ایسے ماحول اور سماج میں پیدا ہونے والے بچے ثمن ہی کی طرح نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں کہ ان کا علاج نہیں اور ان کی ذات میں اتنی نفسیاتی گرہیں پڑ جاتی ہیں کہ ان کا سلجھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔''

(عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر،مرتبہ جمیل اختر،ص۴۲۴)

ثمن کے بدلتے اور بگڑتے کردار کو پروفیسر وہاب اشرفی براہ راست اس سماج کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جس میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا ہے۔وہ کہتے ہیں :

''دراصل یہ ناول کسی حد تک خود عصمت کی آپ بیتی لگتا ہے،جس میں ثمن کے کردار کی تمام تر کجی کا پرتو ابھرتا ہے یا کم از کم تلاش کیا جا سکتا ہے۔دراصل یہاں المیہ ثمن کا نہیں بلکہ ان تمام لڑکیوں کا ہے جن کی پرورش کا کوئی معقول انتظام نہیں۔''

(تاریخ ادب اردو،جلد دوم،وہاب اشرف،ص۸۹۰۔۸۹۱)

ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''ٹیڑھی لکیر'' فی الحقیقت نظریۂ تانیث کے زیرِ اثر لکھا گیا ایک ایسا ناول ہے جس میں اپنی تمام تر ناکامی کے باوجود اس کی کردار ثمن تھک کر نہیں بیٹھتی اور طبقۂ اناث کو یہ راہ دکھاتی ہے کہ یہ ناکامیاں ایک دن کامیابی میں ضرور بدلیں گی بس یہ ہے کہ پورے خلوص اور یقین کے ساتھ انہیں اپنا احتجاج جاری رکھنا چاہئے کیونکہ اِس سماج کو بدلے بغیر خواتین کو برابری کا درجہ اور حق ملنا مشکل ہے۔ثمن کا توانا کردار یہ باور کراتا ہے کہ اس کے باغیانہ تیور سے سماج کا یہ پتھر ٹوٹے گا اور ضرور ٹوٹے گا۔عصمت چغتائی کے نظریے کی حامل کردار ثمن ایک نہ جھکنے والی ضدی لڑکی کی شکل میں اسی لئے سامنے آتی ہے کہ عصمت چغتائی کا یہ ناول خواتین کے لئے ایک پیغام بن سکے۔بلاشبہ :

''عصمت چغتائی نے ثمن کو اس قدر جاندار،سخت جان اور خوددار پیش کر کے معاشرے کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ بھلے ہی اس پر مختلف حملے ہوتے ہیں،گھر کی بے اعتنائی و بے توجہی نے اسے ضدی اور سرکش بنا دیا ہے،وہ محبت کی بھوکی ہے،پھر زمانے کی بے رحم طاقتیں بھی اسے اپنے شکنجے میں دبوچتی ہیں

جن سے وہ لرزہ لرزہ ہوجاتی ہے۔باوجود اس کے وہ معاشرے کے رویے سے
بغاوت کرتی ہے وہ کسی بھی حال میں شکست قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، وہ
ہر لمحہ زیر ہونے کے باوجود زندگی میں کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہتی ہے۔''

(تانیث کے مباحث اور اردو ناول، شبنم آرا، ص ۲۰۹)

اگر تانیثیت عورتوں کی ہمہ جہت خود شناسی کے عمل، اس کے لئے جدو جہد اور پر عزم پیامی روش اپنانے کا نام ہے ہے تو پھر کہنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہئے کہ عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' شمن کے کردار کے حوالے سے خاص طور پر ایک ایسا نمائندہ ناول قرار پاتا ہے جسے تاریخ اردو ادب کسی دور میں بھلا نہیں سکتا۔چونکہ عصمت چغتائی ایک انقلابی ذہن کی مالکہ ہیں اور اختراع ان کی صفت کا خاصہ ہے، عصمت چغتائی کے لکھنے کا انداز تیکھا، برجستہ اور چبھنے والا ہے، چونکہ ان کی آواز نئی اور انداز انوکھا، ترش رو اور چبھتا ہوا تھا اور کچو کے لگانے والا تھا اس لئے ان کے فن کی قدر و قیمت سے کوئی منکر نہ ہوسکا، عصمت کے یہاں روایت سے بغاوت اور قدامت سے انحراف ہے جس کی صحیح عکاس ان کی ناول ''تیڑھی لکیر'' ہے، صحیح معنوں میں ان کے ناول حقیقت نگاری سے کافی قریب تر معلوم ہوتی ہیں، عصمت چغتائی بے شک برصغیر پاک وہند کے ان نامور و مخصوص لکھنے والوں میں سے ہیں جنھیں اپنی زندگی میں لازوال شہرت حاصل ہوئی اور ادبی افق پر اپنی فنکارانہ صلاحیت سے اپنے نام کو تابندگی اور درخشندگی عطا کرگئیں۔اور پروین شاکر کے اس شعر کا مصداق بن کر رہ گئیں۔

بس ایک نام کا تارا سدا چمکتا رہے گلہ نہیں جو مقدر میں آفتاب نہ ہو

**Husne Jahan**
Research Scholar
Deptt. of Urdu
T. P. S. College
(Magadh University)
Patna (Bihar)

ISSN : 2582 - 3612



لطیف الرحمٰن

# مولانا شبلی نعمانی کے اثرات اردو ادب پر

سرسیّد کے رفقا میں سب سے نمایاں نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے جن کی تحریروں و مقالات کا گہرا اثر اردو ادب پر پڑا اور جن کے احسان سے اردو ادب کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتا۔علامہ شبلی نعمانیؒ بے مثال ادیب و انشا پرداز ادیب، عربی کے قادر الکلام مصنف، اقلیم نثر کے تاجدار اور میدان شعر کے شہسوار ہیں۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین، اعظم گڑھ) مولانا شبلی نعمانی اور ان کی ادبی خدمات اور اردو ادب پر ان کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ارقام کرتے ہیں کہ :

''مولانا شبلی نعمانی ایک جامع کمالات شخص تھے۔وہ اپنے معاصرین میں بہ استثناء سرسید احمد خاں سب سے قدآور اور بلند شخصیت کے مالک تھے۔ان کے حدود تصنیف اور قلمی فتوحات کا دائرہ بڑا متنوع تھا۔ان کا خاص موضوع تاریخ و سوانح نگاری کو خیال کیا جاتا ہے لیکن انھوں نے ماضی کے شان دار واقعات اور قومی مفاخر کی داستان سرائی ہی نہیں کی ہے بلکہ فلسفہ و کلام کی پیچیدہ گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔تنقید و تحقیق کی سنگلاخ وادیاں بھی قطع کی ہیں اور شعر و ادب و بلاغت و فصاحت کے نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک فطری ادیب و انشاء پرداز تھے، اس لیے ان کے بہار آفریں قلم نے شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی کتابوں ہی میں ادب و انشاء کے گل بوٹے نہیں کھلائے ہیں بلکہ ان کے خامۂ جادو نگار اور قلم معجز طراز نے سیرۃ النبیؐ، الفاروق، المامون، الغزالی اور سوانح مولانا روم میں بھی ادبی لالہ کاری کی ہے اور ان کی تمام تحریروں اور ساری تصانیف کو زعفران زار اور ادب و انشاء کا چمنستان بنادیا ہے۔''

(محلّہ کاروان ادب لکھنؤ)

علامہ شبلی نعمانیؒ کا شمار اردو ادب کی ان بلند و بالا شخصیوں میں ہے جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔شبلی نے علم و ادب کی جو خدمات کی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انھوں نے نثر نگاری کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کی مثال نہیں ہوسکتی۔اردو نثر کو نئی طرز اور نیا آہنگ بخشنے والوں میں سرسید کے ساتھ ان کا نام بھی ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

شبلی نے اردو نثر کو نئی جہتوں سے متعارف کرایا، انھوں نے اردو میں تاریخ نگاری، سیرت نگاری، موازناتی تنقید کی بنیاد رکھی۔ ان کے بے شمار نثری کارنامے ہیں جنھیں اردو ادب میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

علامہ شبلی نعمانی ایک علمی، ادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ دینی اور مذہبی شخصیت کے حامل بھی تھے اور دنیائے اسلام کی ایک پر وقار شخصیت بھی تھے۔ ان کی شعر و شاعری زیادہ مقبول نہیں ہوئی لیکن ان شعر فہمی نے اردو ادب کو تنقیدِ شاعری کی صفات سے مالا مال کر دیا۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' اور ''شعر العجم'' کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ میر انیسؔ کے مراثی کے بیشتر اوصاف سے قارئین کو روشناس کرانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ انھوں نے اردو تنقید میں موازناتی تنقید کی ایک راہ نکالی اور ''شعر العجم'' میں فارسی اور اردو شاعری کے رموز و نکات پر روشنی ڈالی۔

مولانا شبلی نعمانیؒ نے اردو میں تاریخ نگاری، سیرت نگاری اور سوانح نگاری کی بنیاد رکھی ''سیرت النعمان''، ''المامون''، ''الفاروق'' اور الغزالی جیسے تاریخی دستاویز ان کی نثر نگاری کی اعلیٰ تصنیفات ہیں۔ ان کی سب سے عظیم تصنیف ''سیرۃ النبی'' ہے جو ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی، ان کے بعد ان کے مایۂ ناز شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؔ نے ان کی اس تخلیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

مولانا شبلی نعمانیؒ نے مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے مضامین ''مضامین شبلی'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانیؒ اپنی اعلیٰ درجہ کی نثر نگاری اور اپنی گراں قدر تصنیفات کی بدولت اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے چھوڑے ہوئے نقوش ہمیشہ نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

اردو ادب کی دنیا میں مولانا شبلی نعمانیؒ ایک قد آور شخصیت کہے جاتے ہیں۔ ان کی نگارشات اور مقالات کا اثر اردو ادب پر بہت زیادہ پڑا ہے۔ ان کی تصنیفات و تخلیقات اردو زبان و ادب کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔

سر سید کی دیو قامت شخصیت نے ان کی صلاحیت میں نکھار پیدا کیا۔ الفاروق، الغزالی اور سیرۃ النبی ﷺ نے جہاں انھیں ایک محقق کی شکل میں پیش کیا وہیں سوانح نگار کی حیثیت سے بھی انھیں اجاگر کیا۔

مولانا شبلی نعمانیؒ اردو کے ممتاز نقاد اور سوانح نگاری میں بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ حالیؔ اور آزادؔ کے ساتھ تنقید نگاری کی داغ بیل ڈالنے میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ شبلی کا انداز تنقید ان دونوں سے مختلف ہے۔ ان کی انفرادیت میں ان کے اسلوب کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ انداز نگارش اور پر لطف فقرے کے ذریعے تنقیدی حقائق کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا مزاج حالیؔ کی طرح تجزیاتی نہیں ہے۔ پھر بھی اردو ادب میں شبلی کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ بیک وقت ایک عالم، ایک مؤرخ، ایک سوانح نگار، ایک ماہر زبان، ایک شاعر اور ایک نقاد تھے۔

ISSN : 2582 - 3612



ان کی تنقید میں یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ تنقید نقاد کے مزاج، اور افتاد طبع کا عکس ہوتی ہے۔ شبلی کی بھی تنقید کا یہی عالم ہے۔ ان میں علمیت ہے، گہرا تاریخی اور معاشرتی شعور ہے جو ایک روایت کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ ان میں انسانی زندگی کے جذباتی نظام کا بڑا دخل ہے۔ غرض وہ خاصی وسیع، ہمہ گیر پہلو دار ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو ایک نقاد کی حیثیت سے شبلی کو نمایاں کرتی ہیں۔

مولانا شبلی نعمانیؒ نے تنقید کے فطری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ تنقید نگاری میں ان کا خاص میدان شاعری ہے۔ شاعری کے اصولوں سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے اصناف سخن کے اصول بھی وضع کیے ہیں۔ شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے۔ اس سے متعلق ان کی تصنیف ''شعر العجم'' خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ تنقیدی اعتبار سے ان کی اہم تصنیف ''موازنہ انیس و دبیر'' ہے۔

اس میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ نگار کے متعلق تفصیلی بحث ہے۔ ان دونوں کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس بحث کا انداز توضیحی اور تشریحی ہے لیکن اس میں جگہ جگہ اعلیٰ درجہ کی تنقید بھی ملتی ہے۔ شاعری کو وہ ذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے خیال میں شاعری کی مکمل اور جامع تعریف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ چند مثالوں سے حقیقت واضح کرتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانیؒ کے خیال میں تمام عالم ایک شعر ہے۔ زندگی میں شاعری بکھری ہوئی ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں شاعری موجود ہے۔ جہاں شاعری ہے وہاں زندگی ہے۔ غرض ساری زندگی میں شعریت پائی جاتی ہے۔ یوں تو اور چیزیں بھی انسان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مثلاً موسیقی مصوری اور صنعت گری وغیرہ، لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانیؒ کے نزدیک شاعری تمام فنون لطیفہ سے بلند اور برتر حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا تعلق حواس سے ہے اور بیک وقت تمام حواس کو متاثر کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ ایک عمدہ شعر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں وزن ہو۔ کسی حالت یا چیز کی تصویر کھینچی گئی ہو۔ خیال بندی ہو الفاظ سادہ اور شیریں ہوں، بندش صاف ہو اور طرز ادا میں جدت ہو۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شبلی کی شخصیت علمی اور ادبی دونوں ہے مگر سب سے بڑا کمال ان کا اسلوب ہے۔ یہ اسلوب جو اردو کا بنیادی اور معیاری اسلوب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

**Lateefur Rahman**
Moh.- Shaikh Toli
Near - Imam Bara
P.o. - Chapra - 841 301
Saran (Bihar)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

## گل شمع آرا

# جدید ترین غزل کا شاعر : عبیدالرحمٰن

عبیدالرحمٰن (۱۹۶۱ء - ۲۰۱۴ء) بحیثیت شاعر اردو ادب میں روشناس زمانہ ہوئے۔ ان کی تین کتابیں ''آواز کے سائے'' ۲۰۰۱ء، ''سوچ آبشار'' ۲۰۰۷ء اور ''سخن دریا'' ۲۰۱۹ء میں منظر عام ہو چکی ہیں۔ تینوں مجموعہ کلام میں بیشتر غزلیں ہیں نظمیں کم ہیں اور اس کے علاوہ قطعات، دوہے اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے واضح ہے کہ ان کا فطری میلان غزل گوئی کی طرف ہے۔ انہیں ما بعد جدیدیت کے غزل گو شعراء میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے فکر و فن اور موضوعات سے عصرِ حاضر کے رجحانات واضح نظر آتے ہیں لیکن موضوعات کی پیش کش میں موصوف کا اپنا منفرد انداز و اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

عبیدالرحمٰن غزل کے کلاسیکی ادب سے واقفیت رکھتے ہیں کلاسیکی ادب کے رموز و نکات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اسی لئے تجدید کا رنگ اپنی غزلوں میں بخوبی شامل کر لیتے ہیں۔ کلاسیکی خوبیوں کو تجدید کا لبادہ اس سلیقے سے پہناتے ہیں کہ ایک لطیف فکر ان کی غزلوں سے نمودار ہوتی ہے۔ یہی تازگی انہیں دیگر شعراء میں اپنی الگ شناخت دلاتی ہے۔ غزل کے تمام مروجہ موضوعات میں ان کا یہی اجتہادی رویہ نظر آتا ہے۔ اسی لئے وہ جدیدیت کی شکست و ریخت سے بھی اپنا دامن بچا کر ایک الگ جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوثر مظہری کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''عبیدالرحمٰن کی شاعری میں زمانہ اور معاشرے کی اتھل پتھل کے ساتھ ساتھ انسانی سرشت تک رسائی اور بصیرت افروزی کا سامان بھی ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں انسانیت کی تلاش بلکہ کھوئے ہوئے انسان کے لئے ایک سعئ مسلسل کا رجحان نظر آتا ہے ماضی بھی اور ماضی کی خوبصورت یادیں بھی اور پھر حال کی کشمکش اور ڈوبتے ابھرتے سرخ و سفید سورج کی کہانی بھی۔ جبر و استبداد، استحصال، ناکامی، کامرانی، گھر کے اندر اور گھر سے باہر کی روداد............ یہ سب کچھ عبیدالرحمٰن کے فن سے ہم آمیز ہو کر بڑی شائستگی اور خوش سلیقگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر ابھر آیا ہے ہر آدمی اپنی تصویر غزل کے اس نگار خانے میں





دیکھ سکتا ہے۔ زمانہ کی تشنج کو اپنی تخلیقیت میں ضم کر کے فن پارا بنانا یوں بھی آسان نہیں۔ عبید نے جدیدیوں والی تنہائی اور خوف و ہراس یا انفرادیت پسندی سے الگ ہٹ کر اپنے جینے کا جواز مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نئی نسل کا یہی اجتہاد ہے جو غزلیہ متون سے اسے جدا کرتا ہے۔''

(سخن دریا: عبیدالرحمٰن : مضمون نگار، کوثر مظہری، ص ۳۸)

عبیدالرحمٰن کلاسیکی ادب سے واقف ہونے کے ساتھ جدیدیت کی بے جا لایعنیت سے بھی بیزار نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جدیدیت کے مرکزی رجحانات تنہائی، خوف و ہراس اور زندگی کے مسائل سے کنارہ کشی وغیرہ سے اپنی غزلوں کو پاک رکھا ہے۔ انہوں نے جدیدیت کے الفاظ و تراکیب استعارہ، کنایہ اور تمثیلات سے کافی حد تک پرہیز کیا ہے۔ تاکہ اپنی غزلوں سے قاری کو محظوظ کر سکیں اور اکتاہٹ کا شائبہ اس پر نہ پڑ سکے۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنی غزلوں میں تنوع اور گوناگوں مسائل کا مختلف ڈھنگ سے اظہار کیا ہے۔ موصوف نے اپنی غزلوں میں سوئے ہوئے ذہن کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے، انسان کے اندر ختم ہو رہی انسانیت کو واپس حاصل کرنے کی طرف راغب کیا ہے، ماضی کی یاد دلا کر اسے تابناک مستقبل کی طرف پیش رفت کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ ان کی نظر آفاقی نقطۂ نظر کی قائل ہے۔ مگر مقامی تصورات اور ارضیت کو وہ ہرگز نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ غزل کو عصری مسائل و تصوورات کا وہ آئینہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ زمانے کے تغیرات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ فن میں بھی تبدیلی لانے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں زبان و بیان پر خصوصی توجہ نظر آتی ہے۔ موصوف کی غزلیں اپنے عہد کے نشانیاں رکھتی ہیں۔ جبکہ غزل ایسی صنف ہے جس میں عہد کی نشانیاں معدوم ہوتی ہیں۔ موصوف کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مولا بخش نے ان کی غزلوں کے چند امتیازات گنائے ہیں ملاحظہ فرمائیں :

''عبید غزل کی شعریات کے نظری پہلوؤں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اس لئے خود کو غزل کی ہیئت میں ڈھالتے وقت بہت محتاط معلوم ہوتے ہیں۔

فن شعر اور پیغام کے توازن کی مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ استعارہ کے بجائے زیادہ جھکاؤ میٹانوی اور مجاز مرسل کی طرف رکھتے ہیں۔

عام طور پر غزل کی شاعری پر زمان و مکان کی محدودیت کا لیبل نہیں لگتا یعنی غزل کے اشعار یہ نہیں بتاتے کہ وہ کس عہد میں لکھے گئے ہیں لیکن آج کے شعراء اور بالخصوص عبید کے یہاں غزلوں میں ایک فکری نظام نظر آتا ہے۔ جن میں عصری صورت حال کے ایسے ایسے استعارے ملتے ہیں جو

اکیسویں صدی کی تاریخ پر منطبق ہوجاتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ
ہماری تنقید ان شعراء پر بھی توجہ دے جن کا تعلق براہِ راست اردو شعبے سے نہیں
ہے۔عبید ایسے شعراء میں بڑی اہمیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔''
(سہ ماہی مژگاں (نئی نسل نیا ادب نمبر) مضمون نگار، ڈاکٹر مولا بخش، ص ۵۱۸)

مندرجہ بالا وضاحت عبیدالرحمٰن کی غزل گوئی کے فکری اور فنی تمام پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ان کی غزلوں میں ایک الگ رنگ و آہنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں کلاسیکیت کی مثبت اقداروں کا پاس بھی ہے اور جدید افکار و نظریات کے شکست و ریخت سے گریز بھی ہے۔؛اور جدید ترین مسائل و آلام سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ہے اور معاشرے کی تبدیلیوں کا اعتراف بھی ہے۔اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں اپنے مذہب سے والہانہ انسلاک بھی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ عبید کی غزلوں میں مذہب اسلام کے افکار و نظریات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کردئے جائیں جن سے ان کی غزل گوئی کے جملہ خصوصیات بروئے کار آجائیں اور میری بات مدلل بھی ہوجائے۔ملاحظہ فرمائیں ۔

تصور میں مِرے ایسے کوئی چہرہ نکلتا ہے
کہ سوکھی شاخ پر جیسے ہرا پتہ نکلتا ہے

وہاں کے واسطے بھی سوچیے عبیدؔ ذرا
یہاں سکوں تو بہت ہے مگر سکوں کب تک

ہمارا ذہن تو بس تیرہویں صدی کا ہے
اور اس پہ زعم ہے اکیسویں صدی دیکھیں

تجربہ ہم نے کیا آپ بھی کر کے دیکھیں
شخصیت کیسے بدل جاتی ہے پوشاک کے ساتھ

زندگی ایسے گزار آئے عبیدؔ الرحمٰن
ٹوٹی کشتی رہی، موجیں رہیں، طوفان رہا

زمانہ گزرا کہ مہماں ہوا تھا وہ میرا
مگر وہ عکس ابھی تک مرے سبو میں ہے

پلٹ کر آئے گی ہم تک ہوائے گم گشتہ
رہِ کہن یہ سفر کا جو پھر اعادہ کریں

سوال یہ نہیں، چلنا ضروری ہے کہ نہیں
سوال یہ ہے کہ چلنا ہے، چل سکوں تو چلوں





ایک پردہ ہے اور اس کا خیال
چاندنی میں ٹہل رہا ہوں میں

جب سے آیا وہ زندگی میں مری
لمحہ لمحہ بدل رہا ہوں میں

زباں تو رنگ خوں مانگتی ہے
یہاں چونے پہ کتّھا کیا کرے گا

تقاضا وقت کا ہے شعر جو ہیں کھردرے یارو
کہ اب غزلوں میں پہلی سی نزاکت ہو نہیں سکتی

بہت اچھا ہے اپنی بات کو کھل کر بیاں کرنا
غزل کا پر تمہیں مخصوص لہجہ دیکھ لینا تھا

لفظوں کے جسم چھلنی ہیں آنکھیں ہیں خوں فشاں
تازہ ہوئی پھر سے غم کر بلا کی بات

عبیدالرحمٰن کی غزلوں میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے مقامیت اور ارضیت سے ایک خاص لگاؤ دیکھنے کو ملتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنے ماضی کی یادوں کو سمیٹ کر رکھنا بھی چاہتے ہیں۔ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

آنکھوں میں نہیں دور تلک نیند کے سائے
دادی کی کہانی کو ترستے ہیں یہ بچے

جیسا کہ میں نے گذشتہ سطور میں عرض کیا ہے کہ عبیدالرحمٰن کی غزلوں میں استعارہ اور کنایہ کا استعمال کم ہوا ہے۔جدیدیت پسند شاعروں کے یہاں ان صنعتوں کا استعمال بہ کثرت ہوا ہے جس سے جدید ترین شعراء نے گریز کیا ہے۔اس کے بدلے میں جدید ترین یا مابعد جدیدیت پسند شاعروں کے یہاں نئے لوازم شعری کا داخلہ بھی ہوا ہے۔ڈرامائی انداز اور شدت بیان سے غزلوں میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔جس کی وجہ سے شعر میں ایک نئے قسم کا جمالیاتی حسن مرتسم ہوتا ہے۔عبید کی غزل میں یہ نئے رجحانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری اپنے ادب و ثقافت کی ایک خوش نما تصویر بھی پیش کرتی ہے۔اس سلسلے میں بھی اشعار ان کے مجموعہ کلام میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔

المختصر یہ کہ عبیدالرحمٰن کی غزل گوئی عصر حاضر کے غزل گو شاعروں میں ایک واضح آواز اور اسلوب خاص کی حامل ہے۔اس لحاظ سے انہیں مابعد جدید غزل گو شعرا میں شمار کیا جانا حق بہ جانب ہے۔

**Gulshama Ara**
NET Qualified
Pankhatoli
Muzaffarpur

ثمینہ خاتون

# شمالی بہار میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش

تحقیق وتنقید زبان واظہار کے وسیلہ اور رابطہ کا ایک طاقت ور ذریعہ ہے۔اس کی ابتداء الفاظ یا فقروں سے ہوتی ہے جب روزمرہ کے ضروری کاموں کے لئے آپس میں ملتے ہیں۔ پہلے اشاروں سے کام چلایا جاتا ہے پھر ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ کا استعمال شروع ہوتا ہے۔رفتہ رفتہ دونوں زبانوں سے ایک مشترکہ زبان وجود میں آجاتی ہے۔وہ زبان دونوں زبانوں کی طرح ہوکر بھی ایک علیحدہ شکل میں نمو پاتی رہتی ہے اوراس طرح ایک مخلوط زبان وجود میں آجاتی ہے۔نشوونما پاتی ہے اور جوان ہوکر پرانی اور ماخذ زبانوں کے ساتھ اپنی شوخی اور رعنائی کی وجہ سے متاثر کرنے لگتی ہے۔اردو زبان کی پیدائش بھی اسی فطری اصولوں کے تحت ہوئی۔اس کے آغاز وارتقاء میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی محرکات کا اہم رول رہا ہے۔ ماہر لسانیات کے درمیان اردو کے آغاز کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔سید سلیمان ندوی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، محمود شیرانی، محی الدین قادری زور، اختر اورینوی، ڈاکٹر مسعود حسن خاں وغیرہ نے قدیم ماخذات اور بولیوں کو سامنے رکھ کر اردو زبان کے ارتقاء وابتداء کے نظریات پیش کیے۔اردو کی ابتداء سندھ میں ہوئی، اس کے ابتدائی نمونے پنجاب میں ملتے ہیں، ارض دکن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں یا یہ دوآبہ گنگ جمن کے علاقے کی زبان ہے وغیرہ نظریات سے اردو کی ابتدائی نشوونما کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ اختلافی نظریات کے باوجود سبھی ماہرین نے اس زبان کو مشترکہ کلچر یعنی ہندو مسلمان کے سماجی اور تہذیبی اختلاط کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اردو کی ابتدا مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہم میل جول اور کاروباری تعلق سے ہوئی۔ یہ تعلق ساتویں صدی عیسوی سے قائم ہوتی ہے جب مسلمانان عرب نے ۶۴۳ھ میں بلوچستان کو فتح کیا اور بہت کم عرصے میں کابل سے ملتان تک اپنی حکومت قائم کرلی۔ آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کا فتح سندھ اوراس کے بعد بارہویں صدی کی آخری دہائی تک دہلی پر مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہوگیا۔اس طرح دہلی کے گردونواح اور شمال ہند پر مسلم تہذیب کے اثرات پڑنے لگے۔ زبان بھی باہمی میل جول سے اچھوتا نہ رہا۔ لہٰذا بول چال کی زبان ترقی کرتی گئی۔ یہاں کی زبان اور بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ شامل ہوئے۔ برج بھاشا کا اختلاط ہوا اور پنجابی، ملتانی، اودھی، ہندی وغیرہ نے اس سے قرب حاصل کیا اس طرح ایک نئی زبان نے جنم لیا جس کو ''اردو زبان'' کہا گیا۔لفظ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''لشکر'' کے ہوتے ہیں۔ابتدا میں یہ زبان محدود خطے تک بولی جاتی تھی۔ خاص طور پر چھاونی میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔اس وقت درباریوں اور تعلیم یافتہ حضرات کی زبان

ISSN : 2582 - 3612



فارسی تھی اور سرکاری کام کاج بھی فارسی میں ہی ہوا کرتے تھے لیکن اس زبان کی ہمہ گیری اور مٹھاس نے آہستہ آہستہ اسے مقبول بنادیا۔ ہندوستان آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی اور فارسی تھی جس کا اپنا رسم الخط تھا۔اس لئے اردو رسم الخط کو اپنانے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔فارسی رسم الخط نے اردو زبان کو رائج الوقت زبان سے قطعی ممیّز کردیا۔ صوفیائے کرام نے بھی اشاعت اسلام کے لئے اس زبان کو اختیار کیا، کیونکہ عوام میں یہ زبان رائج تھی۔سلاطین وقت کی سرپرستی پاکر یہ زبان تیز رفتاری سے ارتقائی منزلیں طے کرتی گئی۔شمال ہند اور جنوبی ہند کے درمیان محمد شاہ تغلق نے تعلق پیدا کردیا۔انہوں نے دہلی کے بجائے دیوگری کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔اس کے بعد کئی ریاستوں کے سربراہان نے اس زبان کی سرپرستی کی اور یہ زبان ملک گیر پیمانے پر مقبول ہوگئی۔اردو زبان کی مقبولیت نے ادباء شعراء کو ادب تخلیق کرنے کی جانب مائل کیا۔اردو زبان وادب کے ابتدائی نمونے اس امر کے شاہد ہیں کہ اس میں مختلف علاقائی اور لسانی اثرات بولیوں کی شکل میں موجود ہیں۔

شمالی بہار میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں پروفیسر اختر اورینوی کی تحقیق کو اب تک حتمی مانا جاتا ہے۔انہوں نے موجودہ ماخذات کی روشنی میں شمالی بہار میں اردو زبان کی ابتدا اور ترقی کو ہندو مسلم تہذیب سے جوڑ کر دیکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں :

> ''.....بہار میں نہ صرف سپہ سالار اور ان کی فاتح فوجیں مغربی علاقوں سے آئیں بلکہ بہ کثرت خاندان شمال مغربی ہند اور ایران وعرب سے آکر یہاں آباد ہوئے۔اور انہوں نے تہذیب وتمدن اور زبان وادب کو گہرے طور پر متاثر کیا۔آج بھی سارے صوبۂ بہار میں سادات، شیوخ عربی (صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، جعفری، دردانی وغیرہ) پٹھان، ترک ملک، مغل اور مرزا آباد ہیں۔مختلف بہاری خاندان کے کچھ نسب نامے اس کی گواہی دیتے ہیں۔نیز شہروں کے پرانے محلوں، قصبوں اور گاؤں کے نام اس بات کے شاہد ناطق ہیں۔ مثلاً شہر پٹنہ کے محلے لودی کٹرہ، مغل پورہ، لوہانی پور، لودی پور وغیرہ۔سارے اثرات میں اہم ترین اثر صوفیائے کرام کے ذریعہ پڑا۔ان کی تبلیغ وتلقین سے بہ کثرت اہل بہار مشرف بہ اسلام ہوئے۔نومسلم خاندان سارے صوبہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ان کی اولاد اب بھی حلقہ بگوش اسلام ہے۔نومسلموں کے حلقے ریختہ اور کھڑی بولی کی ترویج کے دائرے بن گئے۔ عہد وسطی میں صوفیائے عرب وعجم دہلی ہوتے ہوئے بہار آئے۔اور بڑی تعداد میں آئے۔ ان کے فیض سے وہ روحانی، اخلاقی، تہذیبی اور ادبی خلا پر ہوا جو صدیوں سے پاٹلی پترا کی تباہی کے بعد چلا آرہا تھا۔ بہار شریف اور پھر پٹنہ اس عہد کی نئی ترقی پسند ایشائی تہذیب کا مرکز تھا اور سارے بہار میں اجالا ہوگیا۔''

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

(بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء، از اختر اورینوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص: ۸۲)

مذکورہ سماجی اثرات کے جائزے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فاتحین، سپہ سالارن، فوجیوں کے ساتھ بزرگان دین نے اس خطے کو اپنا مسکن بنایا جس سے مشترکہ تہذیب کو فروغ ہوا اور اسی راستے اردو زبان کی ترویج کا سفر آسان ہوا۔

بہار میں اردو زبان کی ابتدا یوں تو مسلمانوں کے یہاں آنے سے قبل ہو چکی تھی مگر ہندی اپ بھرنش میں عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال باضابطہ طور پر ترکوں کی فتح بہار کے بعد شروع ہوا۔ اس میں کئی بولیوں کا سنگم بھی ہوا۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اسے ''بہاری ریختہ'' کا نام دیا ہے۔ جس میں کھڑی ریختہ سے مرکب زبان بہار کے ادبی حلقوں میں رائج ہوا۔ پھر کھڑی بولی ہندوستانی ریختہ کا معیاری عہد بہار میں آیا جس میں ادبی تخلیقات وتحاریر نے بہار کو مقام و معیار عطا کیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ بہار کی بولیوں اور لب ولہجہ وآہنگ کے اثرات اس میں باقی رہے۔ زبان وادب کے تحقیق نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے بہار میں ''معیاری اردو'' کا عام وطن بتایا ہے۔ اختر اورینوی کا خیال ہے کہ بہار میں معیاری اردو کا غلبہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی ہونے لگا تھا۔ ''اردوئے وسطیٰ'' کی ابتدا تو تغلقوں کے زمانہ سے ہوئی تھی اور یہ دور جہانگیر کے عہد تک رہا۔'' (بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء ص: ۹۳) اس طرح شمالی ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترویج میں بہار کا اہم حصہ رہا۔

شمالی بہار میں کئی بولیاں رائج تھیں۔ یہ بولیاں اپنے آس پاس کے علاقے سے متاثر تھیں۔ آپس میں باہم تبادلہ کی زبان بولیوں کا مشترکہ وجود سے ممکن تھا۔ صوبہ بہار میں بھی لسانی طور پر مسلمہ اصول قائم رہا۔ آپسی میل جول نے زبانوں کے درمیان مشترکہ ضرورت کے پیش نظر نئے اسالیب نئی زبان کی داغ بیل ڈالی۔ ڈاکٹر آفتاب اشرف نے بہار میں اردو زبان کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے کارآمد نکتہ پیش کیا ہے جس سے یہاں زبان ہندوی یا اردو زبان کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔

بہار میں اردو زبان کی ابتدا اور ترویج کے سلسلے میں یہ تسلیم شدہ نکتہ ہے کہ مسلمانوں کے فتوحات نے اس زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ صوفیائے کرام کی یہاں آمد نے تہذیب اور زبان کے سلسلے میں نمایاں اثرات چھوڑے۔ چونکہ بزرگان دین کو دلوں پر حکومت کا ہنر آتا تھا اور مذہب کی تبلیغ واشاعت کا ہنرمندانہ عمل ان کا شیوہ تھا اس لئے بہت جلد عوام کے نزدیک آجاتے تھے۔ عوام کے قرب کا ذریعہ بلکہ بہترین ذریعہ زبان ہے۔ مقامی بولیوں سے اثر انداز ہونا اور انہیں اپنی زبان کا حصہ بنا کر استعمال کرنا بزرگان دین سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ متھلا زمانہ قدیم سے ہی ایک طاقت ور تہذیب ومعاشرت کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔ یہاں سنسکرت زبان کے مراکز رہے ہیں۔ دور دراز سے سنسکرت زبان کو سیکھنے والے یہاں آتے رہے تھے۔ سنسکرت ادبیات کا یہاں کافی فروغ ہوا۔ مگر چونکہ یہ زبان رابطے اور عوام کی زبان نہ بن سکی اس لئے دنیا کی بڑی زبانوں کی طرح یہ بھی مردہ ہوگئی۔ یہاں کے لوگوں کے درمیان رابطے کی زبان ہندی یا میتھلی تھی۔ میتھلی بولنے والوں میں خاص وعام سبھی شامل تھے۔

ISSN : 2582 - 3612



جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے متھلا بنگال سے قریب ہونے کے سبب اس کے لسانی اثرات سے اثر پذیر تھا۔ اس لیے میتھلی پر بنگلہ کا اثر ہے۔ ماہر لسانیات کا ایک طبقہ اس کے رسم الخط کو بنگلہ رسم الخط کے طور پر دیکھتا ہے۔ میتھلی زبان کے اس علاقے میں اردو کی ترویج واشاعت کا ایک اہم پہلو تاریخی بھی ہے جو ترہت یا متھلا پر مسلمان حکمران کی فتوحات سے وابستہ ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ عربی فارسی اور ترکی جیسی زبانیں لائے جس کا اختلاط یہاں کی مقامی بولیوں سے ہوا پھر مرکزی طور پر اردو کی ترویج میں حکمرانوں کا واضح رول رہا تو یہ خطہ بھی اس سے مبرا نہیں۔ دربھنگہ (ترہت) پر مسلمانوں کے حملوں نے یہاں کی تہذیب اور زبان کو متاثر کیا ہی ہوگا کیونکہ زبانوں کی ترقی کا یہ کلیہ اصول ہے۔ اپنے ایک اہم مضمون ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ۔ ایک خصوصی مطالعہ'' مطبوعہ ۱۹۴۹ء، ص: ۶ دربھنگہ پر مسلمانوں کے حملوں کے بارے میں مشہور مورخ جناب الیاس رحمانی لکھتے ہیں :

> ''دربھنگہ پر مسلمانوں کا سب سے پہلا فاتحانہ حملہ ۵۹۱ھ بمطابق ۱۲۹۲ء میں محمد بختیار خلجی ۶۰۲، ۵۹۹ھ، بمطابق ۱۲۰۵۔۱۲۰۲ء) کے زیر سرکردگی ہوا۔ موصوف نے راجہ لکشمن سین فوج کشی کے ایام میں پہلے اس کو ضمیمہ سلطنت اسلامیہ بنایا اس کے بعد بنگال کی مہم پر روانہ ہوئے۔ اس وقت دہلی کے تخت پر سلطان شہاب الدین غوری کا وا سرائے قطب الدین ایبک داد سلطنت دے رہا تھا اور راجہ نرسنگھ دیو بنگال کے راجہ لکشمن سین کے زیر اقتدار دربھنگا کا حکمراں تھا، راجہ سلطنت اسلامیہ کا باج گزار بن گیا اور غیاث الدین (۶۲۴۔۶۰۸ھ بمطابق ۱۲۲۶ء۔۱۲۱۱ء) کے عہد حکومت تک خراج ادا کرتا رہا۔''

(عہد اسلامیہ میں دربھنگہ اور دوسرے مضامین مرتب ڈاکٹر امام اعظم، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ص: ۹۲)

مسلمانوں کا دوسرا حملہ التمش کے زمانے میں ہوا۔ انہوں نے اس پر حملہ کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یہ ۶۲۲ھ بمطابق ۱۱۲۵ء کا واقعہ ہے۔ علاء الدین خلجی کے دور حکومت یعنی ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء تا ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء میں مسلمانوں کا ایک اور حملہ ترہت پر ہوا اور یہاں کا راجہ سکر سنگھ دیو نے اپنی شکست قبول کرتے ہوئے سلطنت خلجیہ کا باج گذار بن گیا۔ اس کے بعد کا حملہ سلطان غیاث الدین تغلق کی جانب سے ہوا۔ انہوں نے یہاں کے راجہ ہرسنگھ دیو کو ہرا کر اسے اپنا فرمانبردار بنایا۔ یہ حملہ ۷۲۴ھ بمطابق ۱۲۲۴ء میں ہوا۔ چند برسوں کے بعد ہی سلطان محمد بن تغلق نے پھر راج پرسنگھ دیو پر ۷۲۴ھ بمطابق ۱۲۲۴ء میں ہوا۔ چند برسوں کے بعد سلطان محمد بن تغلق نے پھر راجہ ہرسنگھ دیو پر ۷۲۴ھ بمطابق ۱۲۲۱ء میں حملہ کیا۔ اس حملہ کی تاب ترہت کا راجا ہرسنگھ دیو نہ لا سکا اور اپنے قلعہ بیرسنگھ پور میں جا چھپا۔ مگر سلطان یہاں بھی اس پر حملہ آور ہوا۔ راجہ وہاں سے بھاگ نکلا اور قلعہ سلطان محمد بن تغلق کے قبضہ میں آگیا۔ اس خطہ پر دہلی سلطان کا تصرف ہو گیا۔ سلطان محمد بن تغلق کے قبضہ میں آگیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے وہاں کی قلعہ داری حضرت شاہ صوفی کو سونپی۔ شاداں فاروقی کے مطابق :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''سلطان نے وہاں کے قلعہ کی قلعہ داری حضرت شاہ صوفی قدس سرہ کو تفویض کی چنانچہ یہ بزرگ ''بوریائے بوزداوڑھ کر سریر سلیمانی کے مالک ہوئے اور یہیں سے نظام دین ودنیا پر حکمرانی کرنے لگے۔ظاہر ہے ان کے فرمودات وارشادات زبان وادب کے ارتقاء میں کس درجہ موثر ہوئے ہوں گے''

(شمالی بہار میں اردو کی ترویج واشاعت، ایک سرسری جائزہ، شاداں فاروقی، شعرستان نورالحسن لین، دربھنگہ، ص:۱۸)

ترہت کے راجا شیو سنگھ ادب نواز تھے۔ان کے دربار سے سنسکرت اور مقامی زبانوں کے عالم اور شعراء وابستہ تھے۔انہیں کے دربار سے متھلا کا عظیم المرتبت شاعر ودیا پتی منسلک تھا۔جون پور کے فرمارواسلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ۱۴۰۲ء میں ان پر حملہ کیا۔راجہ شیو سنگھ گرفتار ہوا۔سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے یہاں کی حکومت دیو سنگھ کو سپرد کی۔اسی دور کی دو اہم تصانیف سے اس وقت کے تہذیب وتمدن وثقافت کا علم ہوتا ہے اور راجہ کرتی سنگھ اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی بہادری کا ذکر ملتا ہے۔یہاں کی بولیوں میں میتھلی نے قابل لحاظ ترقی کی اور ادبی حیثیت اختیار کر لی۔متھلا کا مشہور شاعر ودیا پتی کی شاعری اس زبان کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ودیا پتی میتھلی کے ساتھ ساتھ مغربی اپ بھرنش (اوہٹ) میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا۔ان کی کتابیں ''کرتی لتا'' اور ''کرتی پتا'' میں میتھلی اب بھرنش اور مقامی بولیوں کا بہترین سنگم ہے۔ودیا پتی کی چھند اور پداولیوں سے متھلا دیش یعنی ترہت میں زبانوں کے ارتقا کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

اردو زبان کی ترویج وترقی میں صوفیائے کرام کی کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ملک گیر پیمانے پر جس طرح بزرگان دین اور اولیا اللہ نے اس زبان کی آبیاری کی اسی طرح ترہت میں آنے والے صوفیائے کرام نے بھی مقامی بولیوں کو اپناتے ہوئے اس زبان کو آگے بڑھایا۔حضرت مدار مکن پوری (متوفی ۱۴۳۱ء) کے مرید وخلیفہ حضرت بھیکا شاہ سیلانی مکن پور، یوپی سے دربھنگہ تشریف لائے اور رشد وہدایت میں مصروف ہوگئے۔ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔سن وصال ۱۴۳۶ء ہے۔آپ کی مقبولیت وشہرت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کا مزار اقدس مرجع خاص وعام ہے۔آپ کے نام کی نسبت سے یہ محلّہ، محلّہ بھیکا شاہ کہلاتا ہے۔آپ گنگا ساگر تالاب کے مغربی اور جنوبی حصے میں مدفون ہیں۔شاداں فاروقی نے ان کے دوہے کو بہار خصوصاً متھلا میں اردو کے اولین نمونے کے طور پر دیکھا ہے۔

**Samina Khatoon**
Research Scholar
Deptt. of Urdu
L.N.Mithila Unviersity
Darbhanga

ISSN : 2582 - 3612



محمد آصف انصاری

# ادب اور جذبات

محمد حسن عسکری اردو ادب میں کلیم الدین احمد کی طرح ایک متنازعہ نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔جس طرح کلیم الدین احمد کو مغربی ادب مرغوب تھا اسی طرح محمد حسن عسکری کے لیے بھی مغربی ادب مرغوب تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کا بہ غور مطالعہ کیا۔

اردو ادب کے قارئین بہ خوبی یہ جانتے ہیں کہ عسکری صاحب کو کلیم الدین احمد کی طرح متنازعہ بنے رہنے میں کافی دلچسپی تھی۔عسکری صاحب نہ صرف ایک ممتاز نقاد تھے بلکہ وہ ایک افسانہ نگار، مترجم، خطوط نگار اور صحافی بھی تھے۔عسکری صاحب اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔نظیر صدیقی نے سلیم احمد کی کتاب ''محمد حسن عسکری'' آدمی یا انسان؟ کے دیباچے میں لکھا ہے :

''انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا، بعد میں انھوں نے افسانہ نگاری ترک کردی۔افسانوں اور ناولوں پر انھوں نے تنقیدی مضامین بھی زیادہ نہیں لکھے لیکن وہ فکشن کے بڑے بالغ نظر اور حساس نقاد تھے۔فکشن پر ان کی تنقید ایک الگ باب بن سکتی ہے۔مظفر علی سیّد نے ایک حالیہ ملاقات میں مجھے بتایا کہ وہ فکشن سے متعلق عسکری کی تنقیدی تحریروں کو یکجا کر رہے ہیں۔''

انھوں نے بہت سارے افسانے نہیں لکھے ان کا صرف دو ہی افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔ جزیرے اور قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' عسکری صاحب نے سرخ وسیاہ اور مادام بواری کی شکل میں دو ناولوں کے ترجمے کیے۔میرا بہترین افسانہ کے عنوان سے اپنے عہد کے چند اہم افسانوں کو مرتب کیا یہ بھی فکشن سے ان کی گہری دلچسپی کا اظہار ہے۔''جزیرے کا اختتامیہ'' میں افسانے کی تنقیدی کا پرتو نظر آتا ہے۔

یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی افسانہ نگاری زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یا تنقید گزشتہ کچھ دہائیوں میں ان کی تنقید نگاری پر بہت زیادہ گفتگو ہوتی ہے۔خاص کر سلیم احمد اور انتظار حسین کے یہاں محمد حسن عسکری کے فکر وخیال واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

زیر نظر مضمون کا مقصد ''ادب اور جذبات'' ہے۔انفرادی طور پر دنیا کے تمام ادب میں کہیں نہ کہیں اس کی مثال مل جائے گی کہ شاعر خود نہیں لکھتا بلکہ زمانہ بلوغت میں ہی وہ لکھنا شروع کرتا ہے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''شبلیؔ، کیٹسؔ، لافورگؔ، کوربیر، لوتریاموں ایسے لوگ جو اپنے ادب کو بہت کچھ دے کر تیس سال کی عمر سے پہلے پہلے ہی مرگئے۔ ان کے بارے میں یہ سوچنا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کیسی شاعری کرتے ادب کے لیے کچھ ایسا مفید مطلب، ادبی معمہ تو رینؔ بوہ ء جس نے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اتنی زبردست نظمیں تخلیق کیں اور شاعری سے ایک دم کنارہ کش ہوگیا۔ اس کے متعلق کئی ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں جو تخلیقی عمل کے مطالعے بڑی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ رینؔ بو نے اپنی نظمیں جلا کر شاعری سے توبہ کر لی تو اُسے رین بو کی شخصیت کا زوال کہیں یا ارتقا اس شاعرانہ خودکشی کی ذمہ داری خود رین بو پر تھی یا اس کے معاشرے پر؟ خود اس حرکت کو ایک زبردست نظم سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس طرز احساس میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس سے آگے تخلیقی عمل ممکن ہی نہیں تھا اس شاعر کی ذات سے ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں جن سے تخلیق کی ماہیت پر غور کرتے ہوئے دامن بچایا ہی نہیں جاسکتا۔''

دنیا میں کئی ایسے ادیب ہیں جنھوں نے کچھ عرصہ لکھنے کے بعد سالوں تک لکھنا چھوڑ دیا اور جب دوبارہ لکھنا شروع کیا تو بیسویں صدی کے بڑے تخلیق کاروں میں ان کا شمار ہونے لگا ایسے لوگوں میں مارسل پروست اور پال والیری جیسے لوگوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کے تخلیقی صلاحیت چالیس سال کے بعد ہی پیدا ہوا کہا جاتا ہے کہ چالیس سال بعد آدمی کا شعور پختہ ہوتا ہے :

''ہمارے ادیب جس عمر میں لکھنا شروع اور ختم کرتے ہیں یہ زمانہ وفور جذبات کا ہوتا ہے۔ دراصل وہ خور نہیں لکھتے بلکہ جذبات ان سے لکھواتے ہیں۔ ان کے پاس عموماً اسلوب نہیں ہوتا جذبات جس طرح کہتے ہیں وہ اسی طرح لکھنے چلے جاتے ہیں جیسے جیسے جذبات مدھم ہوتے جاتے ہیں ان کا لکھنا بھی کم ہوتا جاتا ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ عام انسانوں کی طرح ہمارے ادیبوں کو بھی جوانی میں اپنا جذبہ انوکھا نظر آتا ہے اور وہ اپنے کو اس تخیر میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ ان جذبات کے عادی ہوجاتے ہیں تو پھر ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی اور ادیبوں کا تخلیقی جوش بھی ٹھنڈا ہو کے رہ جاتا ہے۔ مغرب کے ادیب عمر بھر لکھتے رہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے جذبات ہمیشہ متلاتم رہتے ہیں یا روز اپنے اندر ایک نیا جذبہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اصل میں سوال جوش اور زور کا نہیں زاویوں کی قدر و

ISSN : 2582 - 3612



قیمت اس طرح متعین ہوتی ہے کہ فلاں صاحب کے پاس تین جذبے ہیں فلاح صاحب کے پاس پانچ انسان کے جذبات تو وہی گنے چنے ہوتے ہیں۔''

مرزا غالبؔ نے بھی غدر کے بعد شاعری چھوڑ دی تھی۔ اسی طرح حالیؔ نے بھی شاعری چھوڑ دی تھی لیکن غالب کے اصرار پر انہوں نے دوبارہ شاعری شروع کی۔ محمد حسین آزاد زندگی بھر لکھتے رہے اور اپنی عمر کے آخری بیس سال ان کا دماغ ٹھیک نہیں رہا جس کی وجہ سے انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ بہر حال انسان کے اندر جو جذبات ہوتے ہیں وہ ہر وقت ایک سا نہیں رہتے بلکہ گھٹتے اور بڑھتے کسی سرفرے عاشق کو ہی لیجئے جوانی میں اس کے اندر محبوب کو پانے کی جو خواہش ہوتی ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک نہ ایک دن کم ہو ہی جاتا ہے۔ آدمی کے اندر جو چیز باقی رہتی ہے وہ ہے جذبات اور اس میں نشو نما ہونی چاہیے۔ عسکری صاحب ''آدمی'' میں ''انسان'' کو دیکھنا چاہتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی حیثیت آدمی کی ہوتی ہے۔ وہ بچہ دودھ پیتا ہے، کھاتا ہے، روتا ہے اسی طرح جانور بھی کھاتا ہے، پیتا ہے، اسے زندگی کے لیے جسمانی صحت مندی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن آدمی کو جو چیز انسان بناتا ہے وہ شئے اس کی نظریہ اور اس کے جذبات ہیں۔ آدمی کا اندرونی جذبات انہیں قابل قدر بناتا ہے۔ خصوصاً ادب میں میر تقی میرؔ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی اسی لیے انھوں نے ایک صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ تم شعر کہنا کیا جانو کہ میاں تم خود اپنا چوما چاٹی کر لیا کرو تمہیں شاعری سے کیا سروکار ہے تو یہی مطلب تھا کہ شاعر اپنے جذبات کے بغیر شاعری کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ہر شاعر کے اندر جذبات کا ہونا لازمی ہے۔ شاعر جذبات کو قبول کرتا اور اس کا غلام بھی ہوتا ہے اور آزاد بھی حقیقی معنوں میں اگر دیکھا جائے تو کوئی بھی شاعر بغیر جذبات کے شاعر بن ہی نہیں سکتا میر تقی میرؔ محبت میں ناکام ہوئے تو انھیں چاند میں محبوبہ نظر آتی تھیں یہ ایک جذبات ہی تو تھا۔ جذبات ایک کرب ہے جس سے بچنے کے لیے شاعر کہیں بھی پناہ لے سکتا ہے۔ شاعر عشق بھی کرتا ہے اور عشق سے ڈرتا بھی ہے کہ کہیں عاشق بن کر نہ رہ جاؤں۔ اس طرح ایک شاعر کے دل میں جو اذیت کا درد ہوتا ہے اس کا درد انگریز اظہار بیٹسؔ اور میر کے یہاں پیدا ہوا ہے اس کا ثانی کہیں نہیں ملے گا :

''بیٹسؔ کو فخر ہے کہ میں نے اپنی شاعری میں اپنی محبوبہ کا جلوہ دکھایا۔ یہ تو ایک غیر ادبی، ذاتی اور جذباتی مقصد ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ وہ جذباتی تحریک ہے جس سے شعر کی شکل میں ارتقا پایا لیکن بیٹسؔ نے جو بات کہی ہے اس کا دوسرا جزو یہ ہے کہ دنیا اس کے کلام میں اس کی محبوبہ کا جلوہ دیکھنے کو راضی ہوتی تو اس لیے کہ اسے بڑا شاعر مانا گیا اپنے آپ کو بڑا شاعر منوانے کے لیے بیٹسؔ نے اپنے جذبات ہی کو نہیں بلکہ اپنے فکر اور شخصیت کو نشو نما دی خود شاعر کے خیال میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں سے اپنی محبوبہ کی عظمت منوالی۔ دوسروں کی رائے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

میں اس کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایسا آئینہ بنایا جس میں اس کی محبوبہ کا جلوہ
نظر آسکے اور یہ آئینہ اس کی پوری شخصیت کی بھٹی میں ڈھل کر نکلا ہے اور اسے دل و
دماغ، جذبہ، احساس فکر سب کی حرارت نصیب ہوتی ہے۔ آئینہ جاتی جذبات کے
کچے لو سے تیار ہوا ہے لیکن بھٹی سے نکلا ہے تو جام جہاں نما بن کر غرض سچی شاعری
میں جذبات کی قلبِ ماہیت اس طرح ہوتی ہے۔''

جذبات پرستی نیاز فتح پوری والے دور میں وجود پذیر ہوئی تھی، یعنی اس کا خاص شکل میں اس سے پہلے اردو شاعروں کے سامنے چند ایسے خارجی معیار موجود تھے جن سے اپنے جذبات کو ہم آہنگ بنانا پڑتا تھا، مثلاً تصوف کی روایت یا اور کچھ نہ سہی عیّاشی کی روایت، بہر حال آدمی اپنے جذبات کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اسے اپنے جذبات کو کسی نہ کسی رخ پر چلانا پڑتا تھا :

''۱۹۳۶ء کے بعد حرام اور حلال جذبات کا فرق تو مٹ گیا لیکن جذبات کے متعلق
رویہ بنیادی طور پر وہی رہا۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں دونوں کے لیے اچھے ادب کی
تعریف یہی رہی ہے کہ اس میں ذاتی احساس اور جذبے کا خلوص پایا جائے اس ادبی
نظریے کے ماتحت ادب کی تخلیق کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ لکھنے والے نے کوئی
دل چسپ بات دیکھ یا سن لی ہو یا اس کے دل میں کسی قسم کے دل چسپ جذبات
امنڈ آتے ہوں۔ ادیب کا کام بس اتنا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو تحریر میں منتقل
کردے۔ جذبات میں جتنا زور ہوگا تحریر بھی اتنی ہی اچھی ہوگی۔''

بہر حال یہ تو بات ہوئی ادب کی عام زندگی میں وہ آدمی قابل قدر اور لائق نہیں سمجھا جاسکتا ہے جس کے اندر شدید جذبات نہ ہو انسان کی تہذیب نفس اور اس کی شخصیت کا ارتقا نہیں جذبات سے نشو نما پاتی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ جذبات آدمی کو بڑی جلد تھکا دیتا ہے لیکن اس تہذیبی اور تخلیقی عمل کے ذریعہ زندہ رہنے کا نیا شوق حاصل کرتا ہے۔ ادب میں جذبات کی کیا حیثیت ہے اس سے متعلق عسکری صاحب ایک قصہ سناتے ہیں :

''جون اسٹوارٹ مِل نوجوانی میں ہی اتنا کچھ پڑھ گیا تھا اور اتنا کچھ سوچنے لگا تھا کہ
اسے زندگی سے دل چسپی ہی باقی نہ رہی اور اس نے ارادہ کرلیا کہ دریا میں ڈوب کر
جان دے دوں گا۔ ڈوبنے پہونچا تو اتفاق سے ووڑز ورتھ کی کتاب ساتھ چلی آئی تھی
اسے کھول کے پڑھنا شروع کردیا۔ ورڈ ورتھ کے کلام نے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ
زندگی سے پوری طرح مطمئن گھر واپس آگیا۔ تو مِل کی ذاتی زندگی میں شاعری کی یہ
کچھ جگہ تھی اپنے ذاتی تجربات پر غور کرنے کے بعد مِل اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ





شاعری جذبات کی پرورش کا نام نہیں بلکہ جذبات کی تہذیب کا نام ہے۔''

افلاطون اعلی اور اخلاقی شاعری کا قدر دان ہونے کے باوجود شاعری اور مصوری کو فلسفے سے نیچی سطح پر رکھتا تھا۔ افلاطون کو شکایت ہے کہ شاعر جذبات کو توڑ مروڑ کے اور مصور رنگوں کو خلط ملط کر کے پیش کرتے ہیں۔

نہ ہم سمجھے کہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھتے اپنی جبیں سے

یہ شعر کہہ کر شاعر نے اپنے محبوب کو جسمانی ایذا تو نہٰں دی لیکن اخلاقی یا جذباتی تکلیف ضرور دی۔ اس طرح شاعری کے بہارستان میں انسانی زندگی کے ایسے سدا بہار چشمے ابلتے دکھائی دیتے ہیں اور ان میں انسانی صورت حال کی نہایت ہی سچی اور حقیقی صورتیں ابھر کر اشعار میں انسانی جذبے اور کیفیت کو بیان کرنے کا ملکہ ایک ایک شعر کو ملتی جلتی صورتوں کے لئے مناسب قرار دیتے ہیں۔ شاعری میں تمثیلی الفاظ کی مدد سے انسانی زندگی اور رشتوں کی نزاکت و لچک کا ایسا حقیقی نقش ابھرتا ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اس طرح عسکری صاحب کے عالمی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہمارا ادب اس وقت منفرد ہوسکتا ہے جب ہمارے ادب میں جذبات ہوگا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جب تک کوئی فن کار اپنے روایت سے واقف نہیں ہوگا وہ نیا ادب خلق نہیں کرسکتا اگر وہ نیا ادب خلق کرنا چاہتا ہے تو اسے مشرق اور مغرب کی پوری ادبی تاریخ کو نظر میں رکھنا پڑے گا۔ عسکری صاحب کی نظر میں مشرق اور مغرب دونوں ادب ان کی نظر میں تھی۔ جذبات انسان کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں اور ان کے آگے انسان اکثر سرنگوں ہوجاتا ہے۔ یہ نہ ہوں تو زندگی کی بدصورتیاں شد و مد کے ساتھ ہوش و حواس پر حملہ آور ہوجاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جذبات انسان کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ خواہش، ارمان، آرزوئیں، تمنائیں یہ سب کسی نہ طرح جذبات کے دخیل ہوتی ہیں۔ یہ جذبات تمام حسیاتی وجود کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کے تحت نئے نئے فسانے تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔ نئے نئے پیرائے اختیار ہوتے رہتے ہیں :

''ادب اور جذبات'' ستارہ یا بادبان۔ محمد حسن عسکری۔''

**Md. Asif Ansari**
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
Ranchi University
Ranchi (Jharkhand)

شبیر عالم

# سرسید احمد خاں کی ادبی خدمات

سرسید احمد خاں کی پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والدہ محترمہ کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ نے کئی جگہوں پر جیسے متین پوری، فتح پور سکری، بجنور، مرادآباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں ملازمت کی۔ بنارس میں قیام پذیری کے دوران ہی آپ نے انگلستان کا بھی سفر کیا۔ آپ نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنا بیشتر وقت علی گڑھ کالج کی خدمت کرنے میں صرف کر دیا۔

آپ کی شناخت کسی ایک رخ سے نہیں بنتی ہے بلکہ آپ کی شخصیت کئی پہلوؤں سے معتبر و معروف تھی۔ آپ کے شخصی کوائف کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''سرسید علی گڑھ کے ادارے کے بانی ہی نہیں ہندوستان کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ پر ایک غیر فانی نقش چھوڑا ہے۔ سرسید نے زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈالا۔ انہوں نے خواب دیکھے اور دکھائے اور پھر خوابوں کو حقیقت بنانے میں لگے رہے۔ انہوں نے مذہب سیاست تعلیم معاشرت ادب صحافت سب میں بڑے بڑے انقلابی کارنامے انجام دئے۔ وہ بہت بڑے مصلح اور مجدد معلم اور مجاہد تھے۔''

(انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص تعارف)

یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں نے ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے بہترین کارہائے نمایاں انجام دئے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن میرے مضمون کا تعلق ان کی ادبی خدمات کے ذکر سے ہے اس لئے میں ان کی ادبی خدمات پر خصوصی توجہ دینا چاہوں گا۔ کیوں کہ انکی ساری خدمات کا ذکر چند صفحات میں کرنا ممکن بھی نہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''انہوں نے نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اس کو غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کے نشو و ارتقا میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نثر اردو کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے زمانے تک نثر میں عموماً





مضمون و معنی کو ثانوی اور طرز بیان کو اولین اہمیت دی جاتی تھی، مگر انہوں نے مضمون کو اولیت دی.............سرسید احمد خاں کی اہم خدمات یہ بھی ہیں کہ انہوں نے اردو نثر کی حدود کو وسیع تر کر دیا..............اردو کو جو علمی اعتبار سے اس وقت ایک بے مایہ زبان تھی تھوڑے عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیا۔''

(سرسید اور ان کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ص-۱۴-۱۲)

آپ کے ادبی سفر کے پہلے دور کی تحریروں پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تب ان میں مذہبی رنگ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کی تحریروں پر سرسید کا علمی نقطہ نظر بھی جلوہ نما ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی کی مادی حقیقتوں سے زیادہ علمی تصورات کے دلدادہ تھے۔ آپ کے پہلے دور کی تصانیف میں یہ خوبیاں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان تصانیف میں ''جام جم'' (۱۸۳۹ء) ''انتخاب الاخوین''، ''جلا القلوب بذکر المحبوب'' (۱۲۵۵ھ) ''تحفہ حسن'' (۱۳۶۰ھ) ''تسهيل في جرا الثقيل'' (۱۸۴۴ء) ''آثار الصناديد'' (۱۸۴۷ء) ''فوائد الافکار''، ''فی اعمال الفرجار''، ''قول متین''، ''درابطال''، ''حرکت زمین''، ''کلمۃ الحق'' (۱۸۴۹ء) ''راہ سنت ورد بدعت'' (۱۸۵۰ء) ''نمیقہ'' (۱۸۵۲ء) ''سلسلة الملوك'' (۱۸۵۲ء) ''کیمیائے سعادت'' (۱۸۵۳ء) ''تاریخ ضلع بجنور'' (۱۸۵۵ء) ''آئین اکبری'' ہیں۔

آپ کی تصنیفی زندگی کا دوسرا دور وہ دور ہے جب آپ غدر کی وجہ سے بجنور سے مرادآباد آتے ہیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی زندگی وبال جان بن چکی تھی ان پر ہنگامہ غدر میں شامل ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور سرسید کی پہلی کوشش تھی کہ وہ مسلمانوں کو اس الزام سے کس طرح بچائیں۔ اس کے لئے انہوں نے مصالحت کا طریقہ اپنانے پر خصوصی توجہ دی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لئے اپنی تحریروں میں عقلی اور نیچرل نقطہ نظر کی پیش کش پر توجہ دی۔ اس دور کی تصانیف میں ''تاریخ سرکشی بجنور''، ''اسباب بغاوت ہند'' (۱۸۵۹ء) ''رسالہ لائل محمڈنز، آف انڈیا'' (۱۸۶۰ء) ''تحقیق لفظ نصاریٰ''، ''تاریخ فیروز شاہی''، ''تبیین الکلام''، ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی''، ''رسالہ احکام طعام'' ۱۸۶۸ء ہیں۔

اسی طرح آپ کی تصنیف و تالیف کا تیسرا دور بھی اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں آپ کے اندر جو مصلحانہ جذبہ تھا اس میں کافی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ شدت آپ کی تحریر کردہ کتابوں میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ شدت کے ساتھ ساتھ بے خوف و خطر اپنی بات کہنے کا ہنر بھی ان کی تحریروں سے صاف عیاں ہے۔ وہ تصانیف اس طرح ہیں: ''سفر نامہ لندن''، ''خطبات احمدیہ''، ''تہذیب الاخلاق'' وغیرہ۔ تہذیب الاخلاق کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''تہذیب الاخلاق میں مذہب تہذیب ادب معاشرت قومی اخلاق پر برابر

مضامین نکلتے رہے۔ اس پرچے سے جدید خیالات کی روشنی اور عقلیت کی
کرن پھیلی حقیقت نگاری کا رواج ہوا۔ ادب کو بلند اور حیات بخش تصورات
کی گرمی ملی۔ سرسید نے اردو ادب کو خانقاہ دربار اور کوچہ و بام سے نکال کر
دفتروں، تعلیم گاہوں اور متوسط طبقے کے دل و دماغ تک پہنچایا۔''

(انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص-۹)

اردو ادب کی آبیاری کے سلسلے سے سرسید احمد خاں کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان و ادب کو ایک نئی معنویت اور رنگ و آہنگ عطا کرنے میں آپ کا قلم فعال رہا۔ مختصر یہ کہ آپ کی ادبی خدمات بیش بہا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے سے مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں :

''سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت
ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی
بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی
کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی سیاسی
اخلاقی تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور واثر وسعت و جامعیت، سادگی اور
صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ
بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشاپرداز موجود ہیں جو اپنے
اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی
نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔''

(انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص-۱۸-۱۷)

مختصر یہ کہ سرسید کی تحریریں فرد اور معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ بھی رہیں۔ ان کے تحریر کردہ مضامین متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین میں جہاں آپ کا خلاقانہ ذہن کارفرما نظر آتا ہے وہیں اخلاقی، سیاسی، تہذیبی، معاشی، ثقافتی، تعلیمی جیسے متعدد موضوعات پر آپ کا نظریہ فکر کیا ہے ان سے بھی ہم بہ آسانی آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے بیشتر مضامین لکھے جن میں امید کی خوشی، تعصب، گزرا ہوا زمانہ، خوشامد، عورتوں کے حقوق، بحث و تکرار، اپنی مدد آپ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کی انشاپردازی کے سلسلے سے مضمون ''امید کی خوشی'' کا یہ بند ملاحظہ کیجئے:

''لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی
ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے..........تو اے بہادروں کی قوت





بازو اور اے بہادروں کی ماں تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اس کے دل کو
تقویت دیتا ہے۔ اس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔''

(انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص-۲۳-۲۱)

تمام باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہیں گے کہ سرسید نے تحریر کو کبھی تفریح کا ذریعہ نہیں بنایا اپنے خیالات وافکار کی ترجمانی کا وسیلہ بناتے ہوئے اپنی نگارشات کی اہمیت وافادیت سے لوگوں کو بہرہ ور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصانیف اور دیگر تحریری کاوشوں کو اردو زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کا سیاسی نقطہ نظر آپ کی تحریروں میں صاف عیاں ہے۔ مختصر یہ کہ سرسید احمد خاں اردو نثر کے جدید معمار اول بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید کے زمانے میں فارسی حکومت کی زبان تھی اور عوامی زبان کے طور پر اردو کو مرکزیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی ابتدائی کتاب فارسی میں ہے۔ بعد میں انہوں نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس زبان کی جدید کاری کے بغیر مسلمانوں کی فلاح و بہبود نہیں کر سکتے۔ سرسید نے نہ صرف اپنی تحریروں سے اس زبان کے مشتملات بدلنے کی کوشش کی بلکہ مختلف اصناف اور شعبوں کے ماہرین کی ایسی تربیت کی جن سے اردو زبان ایک انقلاب آفریں دور میں پہنچ گئی۔

اس پر اضافہ یہ کہ شاعری سے نثر کی طرف مراجعت کا بھی پہلا سبق سرسید ہی نے دیا تھا۔ جس کا مثبت اثر یہ ہے کہ اردو زبان میں آج شاعری کے ساتھ ساتھ نثر سے متعلق بھی بیش قیمتی ادبی سرمایہ موجود ہیں۔ یہ سرسید کی اردو زبان سے بے لوث محبت کا بہترین نتیجہ تسلیم کیا جائے گا۔ میں اپنی بات اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں ملاحظہ کیجئے :

''سرسید جس صدی کے مصنف ہیں وہ اصولاً بحث و مناظرہ کی صدی ہے۔ آئین مشرق و
مغرب قدیم و جدید بدعت و سنت شاہی اور جاگیرداری مذہب اور سائنس جبلت اور عقل
غرض ہر شعبہ علم و عمل میں ایک طرح کا تصادم نظر آتا ہے..........اس لئے انہوں نے
پرجوش داعیوں اور جنگ آزما سپاہیوں کی طرح فکر و عمل کی اس آویزش میں عملی حصہ لیا۔''

(سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، ص-۲۵)

**Shabbir Alam**
M. Phil (Urdu)
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur - 842 001

سُنبل شاداب

# پروین شاکر کی غزل گوئی

اردو شاعری کے دامن کو جن خواتین نے گلہائے رنگارنگ سے بھر دیا ہے۔ان میں پروین شاکر کو سب سے اہم جگہ دی جاتی ہے۔انہوں نے اپنے کلام کو فطری سانچے میں ڈھال کر غزل کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ان کے یہاں روایتی شاعری سے نہ مکمل انحراف ہے نہ اندھی تقلید۔عشقیہ جذبات کا بے باکانہ اظہار بڑے ہی مناسب الفاظ میں جمالیاتی حُسن کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔بے حجابانہ نسوانیت میں لذت وحسن کا احساس اپنی شدت سے انگڑائیاں لیتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔وہ رومانیت سے اظہاریت کی جانب مائل بہ سفر ہیں۔

ساقی فاروقی کا خیال ہے کہ :

''اگر یہ رومانیت سے اظہاریت کی طرف سفر جاری رکھ
سکیں تو ان میں بہت آگے جانے کے بہت امکانات ہیں''

اب تک پروین شاکر کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ''خوشبو'' ۱۹۶۸ء میں ''صد برگ'' ۱۹۸۰ء میں اور ''خود کلامی'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروین شاکر نے اپنی تخلیقی بصیرت سے اردو شاعری کو مالا مال کر دیا ہے۔اور اُسے ایک نیا رنگ و آہنگ سے آشنا کیا ہے۔انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے دامنِ علم وادب کو بے انتہا فائدہ پہنچایا ہے اپنے صحیح اور سچے جذبات کو علی الاعلان شعر وادب میں ظاہر کرنا پروین شاکر کا بیش بہا کارنامہ ہے الفاظ کی مینا کاری اور ترکیبوں کا تراش دل کش ہے۔لہجے میں گھلاوٹ اور دلسوزی ہے۔ان کی شاعری عشقیہ صحیح لیکن سطحی نہیں ہے۔

چاند بھی مری کروٹوں کا گواہ   میرے بستر کی ہر شکن کی طرح
بارہا تیرا انتظار کیا   اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح
عکس خوشبو ہوں ، بکھرنے سے نہ روکے کوئی   اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گذرتا بھی نہیں   اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

پروین کی رومانی نظموں میں نسوانی جذبات اور رنگ تغزل قابل قدر ہیں۔ان کی رومانی نظموں میں ایک کشش ہے۔





جانتی ہوں کہ بچھڑنا مجبوری ہے   پر مری جان ملے مجھ کو سزا آہستہ
رات جب پھول کے رخسار پہ دھیرے سے جھکی   چاند نے جھک کے کہا اور ذرا آہستہ

پروین کے کلام میں نرم مزاجی اور دل لبھانے والی مٹھاس جذبات کو چھونے والی سرخوشی اور لگاؤ کی چاشنی نمایاں ہے۔ان کے یہاں ساز و آواز کی ہم آہنگی، موسیقی اور شعریت کا امتزاج ہے۔صناعی اور فن کارانہ چابکدستی ہے۔

اب ان دریچوں میں گہرے دبیز پردے ہیں   وہ تاک جھانک کا سلسلہ بھی گیا
ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا تعلق   بند مجھ پر جب سے اس کے گھر کا دروازہ ہوا
شدید دکھ تھا اگر چہ تیری جدائی کا   ہوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا
کوئی سوال جو پوچھے تو کیا کہوں اس سے   بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا

پروین کی شاعری میں داخلی کرب اور احساس ذات کے ساتھ عصری آگہی بھی ہے۔غم جاناں اور غم دوراں دونوں کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کا حسن تجربہ پروین کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ تہذیب وشرافت، خیالات کی پاکیزگی، اطاعت وفا شعاری اور ایثار ان کی غزلوں کی جان ہیں۔کلام میں فکری ونظر کی پختگی صاف طور پر جھلکتی ہے۔پروین عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی انفرادیت کو لئے ہوئے چلتی ہیں وہ اپنی ہر تخلیق پر اپنی شخصیت کا سکہ جماتی ہیں۔وہ اپنی نغمگی سے اشعار میں دلوں کو چھونے والی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ان کی غزل کے چند اشعار پیش نظر ہیں۔

وہ جب سے شہر خرابات کو روانہ ہوا   براہ راست ملاقات کو زمانہ ہوا
میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شئے کی   کہ سب کا ہو کے رہا وہ بس اک مرا نہ ہوا
دھنک کے رنگ میں ساری تو رنگ لی میں نے   اور اب یہ دکھ کہ پہن کر کسے دکھانا ہوا

پروین کی غزلوں کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ ان میں دوشیزگی اور دلآویز نسائیت پنہاں ہے۔سوز و گداز والہانہ پن اور وارفتگی ہر لفظ سے عیاں ہے۔غزل پڑھتے وقت ایک مسرت اور لذت کا احساس ہوتا ہے۔

بقول نظیر صدیقی :

''پروین شاکر کی شاعری لڑکی کی ترجمان ہے۔کشور ناہید کی شاعری عورت کی اور فہمیدہ ریاض کی شاعری جدید عورت کی ان تینوں میں جہاں تک شعری تکمیل کا تعلق ہے، پروین شاکر اپنی ہم عصر شاعرات پر فوقیت لے گئی ہیں۔''

پروین کی شاعری اپنے خام مواد کے لئے تخیّل کی دنیا میں پرواز نہیں کرتی بلکہ اپنے سماج کا

مطالعہ کر کے روزمرہ کے حقائق کو خوش نما جامہ پہناتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قارئین کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے اور جگ بیتی بھی۔ ماحول کی عکاسی ہر ہر قدم پر نمایاں طور پر نظر آتی ہے والہانہ جذبات کے بے باکانہ اظہار کے باوجود کہیں بھی عریانیت نہیں ہے۔ انداز بیاں سادہ اور فصیح ہے۔ سطحیت اور سوقیانہ پن سے پاک ہے سوز و گداز دلوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ موضوعات میں ندرت اور پیش کش میں سلیقہ ہے۔ یہ عشقیہ شاعری نئی نسل کو متاثر کر رہی ہے۔

بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار :

پروین شاکر محدود عشقیہ شاعری پر قناعت کر بیٹھی ہیں۔''

محمد علی صدیقی فرماتے ہیں :

''پروین شاکر کم عمری ہی میں رجحان ساز شاعری کا روپ دھارتی نظر آ رہی ہیں۔ پروین شاکر کے اسلوب کی انفرادیت نے انہیں ایک نئے رنگ کا بانی بنا دیا ہے۔ شاعرات کی انبوہ میں ان کا رنگ آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی فرماتے ہیں کہ :

''اردو شاعری میں ہر لحاظ سے یہ ایک نئی آواز ہے۔ منفرد جمیل اور مستقبل گیر آواز!''

المختصر پروین شاکر کے کلام میں ایک خاص نرمی، گداختگی اور کیف ہے اس کا ایک مخصوص ذائقہ ہے۔ فکر اور جذبے کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ یہ شاعری ہماری عقل اور فکر کو ہی نہیں ہماری روح اور وجدان کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خواتین کی شاعری پر لاکھ پابندی کے باوجود پروین شاکر کو نئی نسل کی ''نمائندہ'' کا درجہ دلاتی ہے۔

**Sumbul Shadab**
Dharikshan Singh T. T. College
Kulharia, Ara
Bhojpur, Bihar





# ''ساغرِ ادب'' کا چوتھا شمارہ (آپ کی نظر میں)

☆ عزیزی پروفیسر سیّد آلِ ظفر        سلامت رہیے۔

''ساغرِ ادب'' کا چوتھا شمارہ پیش نظر ہے۔ اظہار خیال کے لئے دفتر چاہئے۔ یہاں تو ایک مختصر سے مکتوب میں اپنے تاثرات پیش کرنا ہیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی ''حمد'' اور مکرمی پروفیسر عظیم الرحمٰن صاحب کی نعت شریف کا پوچھنا ہی کیا؟ میرے محترم پروفیسر صاحب نے نعت شریف کا اختتام تضمین کے مصرعے پر بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''۔ اِس شمارے کے سارے مضامین دلچسپ اور جالبِ توجہ ہیں۔ ان میں پروفیسر ممتاز احمد خاں کا مضمون ''علیم اللہ حالی کی نظم' ہوا سے ایک گفتگو' کا تجزیاتی مطالعہ'' قابلِ قدر اور محاسن سے لبریز ہے۔ پروفیسر نبی احمد کا مضمون ''لطیف الرحمٰن کی نسانح شناسی پر اِک نظر'' بھی تجزیاتی اور عرق ریزی سے معمور نظر آتا ہے۔ عزیزی پروفیسر قمر جہاں کا مضمون بھی عمدہ ہے اور علمی دنیا میں اُن کی بزرگی پر شاہدِ عادل بھی۔

پروفیسر عبدالواسع کا مضمون ''سورۂ کہف کا اعجاز'' بہت دلکش ہے۔ تجزیاتی بحث اور اخذِ نتائج میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ مَیں ایسی خوبصورت تحریر پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون ''اماوس میں خواب: معاصر ہندوستان کا استعارہ'' بھی اچھا لگا۔ ڈاکٹر شاہ ظل اللہ فاتح اور ڈاکٹر سیّد محمد حبان الحق کے مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر کبریا، ڈاکٹر سمیع حسن، ڈاکٹر عبدالوحید وغیرہ کے مضامین بہت اچھے لگے۔ جن لوگوں کا نام مَیں نہیں لے سکا، وہ یہ نہ سمجھیں کہ مَیں نے انہیں نہیں پڑھا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے۔ مضامین اُن کے بھی اچھے ہیں لیکن اظہار خیال کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے جو فی الوقت میسّر نہیں ہے۔

دعا گو

**پروفیسر نجم الہدیٰ، مظفر پور**

☆ مدیر محترم سیّد آلِ ظفر صاحب      سلام ورحمت

سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء مل گیا شکریہ۔ رسالہ حسب توقع ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ کسی بھی رسالہ میں مضامین و مقالات کو زیادہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس لئے عرض ہے کہ مکرمی پروفیسر عبدالواسع، ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر حبان الحق اور ڈاکٹر تحسین فاطمہ نے اپنے اپنے موضوعات کا بڑے سلیقے سے احاطہ کیا ہے۔ ''ساقی نامہ'' پر آپ کی تحریر بھی بہت خوب ہے۔ میں سمجھتا ہوں معاصر اردو رسائل میں ''ساغرِ ادب'' اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑنے میں کامیاب ہے۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کا آپ کو تعاون مل رہا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند اور طمانیت بخش بات ہے۔ خدا کرے ''ساغرِ ادب'' یونہی کامیابی کی منزلیں طے کرتا جائے۔

**پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مظفر پور**

☆ برادرِ عزیز سیّد آلِ ظفر سلمہٗ    خوش رہیے!

''ساغرِ ادب'' کا چوتھا شمارہ ملا، بہت بہت شکریہ۔ تسلسل کے ساتھ ایسا عمدہ ادبی جرنل نکالنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔اس شمارے میں بھی پرانے اور نئے قلم کاروں کی قابلِ مطالعہ تحقیقی وتنقیدی نگارشات ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔نئے لکھنے والوں کو معتبر قلم کاروں کے متوازی پلیٹ فارم دینا چاہئے تا کہ ان کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور تربیت بھی۔بہر حال اس شمارے میں پروفیسر عظیم الرحمٰن کی نعت شریف علمی شان اور قدرت بیان کی حامل ہے۔ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں جس انکساری اور بردباری سے انہوں نے حاضری دی ہے۔اور آیات قرآنی سے اپنے طاہر جذبات کو استحکام دیا ہے، یہ ان کے عشق رسول اور منظوم اظہار کا بیّن ثبوت ہے۔

نثری حصے میں پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور ڈاکٹر مظہر کبریا کے تجزیاتی مضامین نہ صرف قابلِ مطالعہ ہیں۔ بلکہ تحسین کے لائق بھی ہیں۔ پروفیسر قمر جہاں نے غیر مسلموں کے اردو افسانوں کے حوالے سے ایک اچھے اور نئے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔اس مضمون کے بین سطور میں بیسویں صدی کی تغیر پذیر ہندوستانی سماج اور تہذیب وثقافت کی وہ جھلک موجود ہے، جس سے متاثر ہونے پر عورت مجبور ہوتی رہی ہے۔موضوع ومواد دونوں لحاظ سے مضمون وقیع ہے۔کئی مضامین کا تعلق ایسے موضوعات سے ہے جن پر کم لکھا گیا ہے اور کئی درسیات میں اضافے کا باعث ہیں۔

مجموعی طور پر رسالے کے مشمولات اطمینان بخش ہیں۔خدا کرے علم وادب کی خدمت کا یہ سلسلہ جاری رہے۔

**پروفیسر رئیس انور، دربھنگہ**

☆ کرم فرما ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب    سلام مسنون

مارچ کا ''ساغرِ ادب'' لاک ڈاؤن کے ساتویں دن ملا ہے۔ ٹرین نہیں چل رہی ہے۔اس لئے ڈاک نہیں آ رہی ہے۔ یہ شمارہ غالباً RMS میں آ گیا تھا اسی لئے اب ملا ہے۔شکریہ اور مبارک باد

آپ کے رسالے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مضامین لکھوانے اور سجا سنوار کر پیش کرنے میں آپ ہر طرح سے کامیاب ہیں۔ اس شمارہ میں بھی الگ الگ موضوعات پر اُنتیس مقالے اور ریسرچ اسکالرز کے گیارہ مضامین ذہن کشا ہیں۔صرف شبنم مرزا کا مضمون ریسرچ اسکالرز کے کالم میں نہیں ہونا تھا کیونکہ وہ عمر کی ساٹھویں پڑاؤ سے آگے ہیں اور خانہ دار عورت ہیں۔ سلطان سبحانی کی اہلیہ ہیں اور ان کے بچے نوکری پیشہ ہیں۔قارئین کی جانکاری کے لئے اتنا بتانا ضروری ہے۔

اس شمارہ کے کئی مضامین سے میں استفادہ کر رہا ہوں۔ایک اور توجہ طلب مضمون پروفیسر عبدالواسع کا ہے۔''حملہ کے وقت'' کو انہوں نے مختصر ترین کہانی ضرور لکھا ہے لیکن آگے کی تحریر میں افسانہ اور افسانہ نگار بتایا ہے جب کہ یہ افسانچہ ہے اور افسانچہ نگار ہونا چاہئے تھا۔

آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ ہر شمارہ ۲۰۸ صفحے میں اور وقت پر شائع کر رہے ہیں۔مبارکباد قبول کریں۔

**پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور**





☆ السلام علیکم

''ساغرِ ادب'' کا تازہ شمارہ گھر کے پتے پر ہونے کے سبب مل گیا۔ان حالات میں بھی اتنا پُر مغز اور دیدہ زیب جریدہ آپ نے نکال لیا، بہت بڑی بات ہے۔ مشمولات سے لگتا ہے کہ مشاہیر ادب بھی کافی ملتفت ہو رہے ہیں نو آموز قلم کاروں کی تو آپ پہلے سے حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں۔اس طرح ''ساغرِ ادب'' خام وتام کا بہترین آمیزہ ہو گیا ہے۔ جو ایک صحتمند صحافتی رَوِش کی غماز ہے اور رسالے کی ترقی اور سربلندی کی علامت ہے۔ آپ کی ایثار، لگن اور اعلیٰ ادبی وصحافتی ذوق سے امید ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد آسمان صحافت پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند چمکنے لگے گا۔

**پروفیسر قاضی حبیب احمد، چنئی**

☆ برادرِ عزیز ڈاکٹر آلِ ظفر

سلام بصد شوقِ دید

آپ کی ادارت میں شائع ہو کر سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' جنوری تا مارچ نظر نواز ہوا جو آپ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ مطالعہ جب گراں اور جذباتیت سے الگ ہو کر کیا جاتا ہے تو ادب میں ایک نکھار آ جاتا ہے۔جس کا نمونہ ''ساغرِ ادب'' ہے۔اس کامیاب کاوش کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔آپ نے نئے نظریے زندگی کو گونا گوں رنگ دیتے ہوئے کائنات کے فلسفہ کو نئی روشنی عطا کی ہے۔ایک طرف زندگی کے مسائل دوسری طرف اس کا حل ڈھونڈنے کی جو کوشش آپ نے کی ہے وہ واقعی باذوق قارئین کے قلب کو روشن کرے گی۔''ساغرِ ادب'' ادبی لوگوں کے علاوہ ریسرچ اسکالروں کے لئے بھی مفید ہوگا۔

آپ نے اردو کی بقا اور زبان کے تحفظ کے لئے جو تعمیری کام کیا ہے۔اس کے لئے آپ کو مبارکباد اداریہ بھی کافی پسند آیا۔

آپ کا

**پروفیسر سیّد شبیہ الحسن، برہروا (جھارکھنڈ)**

☆ برادرم آلِ ظفر! دعائے خیر

بخیر ہوں امید ہے آپ بھی بخیر ہونگے۔''ساغرِ ادب'' کا حالیہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔پہلی ہی نظر میں اس کی ترتیب وتزئین کا معترف ہو گیا کیونکہ ع

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

A tree is known by the fruit it bears.''درخت کی پہچان اس کے پھل سے ہوتی ہے''۔

رسالے کی پہچان مجلس ادارت اور مشاورت نمائندہ افراد گان اور مقالے کی معنویت پر منحصر ہے۔ ماشاءاللہ آپ کا ذوق کافی بالیدہ ہے۔اللہ اسے پائدار رکھے اور نظر بد سے محفوظ بھی۔اس مشکل ترین یعنی عہد کورونا میں اچھا جریدہ نکالنا کافی مشکل ہے۔اور آپ نے اس مشکل کو بہ آسانی حل کر لیا۔قدیم وجدید عنوانات کی شمولیت مستند صاحب طرز قلم کار کے ساتھ جدید فن کار کی تحریروں کے آمیزاں نے ''ساغرِ ادب'' کو ہمہ رنگ کر دیا ہے۔اور یہی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

''ساغرِ ادبؔ'' عہد حاضر کا ایک معیاری جریدہ ہے۔ جس سے سرزمین بہار کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس لئے فارسی کا یہ شعراس پرصادق آتا ہے۔

ہرگز نہ یابد در نظر نقشے زرویت خوبتر
ہر چند و صفت می کنم در حسن زاں بالاتری

معتبراوردستاویزی رسالے کی کامیابی کے لئے بہت بہت مبارکباد۔

خیراندیش

**پروفیسرنبی احمد، چھپرہ**

☆ مدیرمکرم السلام علیکم

''ساغرِ ادبؔ'' کا شمارہ ۴رموصول ہوا۔ یہ شمارہ گذشتہ تمام شماروں سے خوبصورت اوروقیع ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی حمد اور پروفیسر عظیم الرحمٰن صاحب کی نعت شریف کی مطالعے سے طبیعت خوش ہوگئی۔ مقالات میں پروفیسر قمر جہاں صاحبہ کا مقالا''اردو کے غیر مسلم افسانہ نگاراور عورت کا تصور'' گہرے مطالعے کا حاصل ہے۔ یہ نیا موضوع بھی ہے۔ اجتبیٰ رضوی پر ڈاکٹر جمال اُویسی کا مقالا محنت اور بصیرت سے لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مقالا''اماوس میں خواب'' سے متعلق تجزیاتی وتنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' کی فنی وفکری خوبی' کے عنوان سے ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر کا مضمون قابلِ مطالعہ اور خوب ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون ''اردو کی ادبی نثر میں اقبال کا مقام'' عمدہ مضمون ہونے کے باوجود تشنہ ہے۔ اقبالؔ جیسے بڑے شاعر ومفکر کی نثر نگاری پر سرسری گفتگو نہیں کرنا چاہئے۔ اس موضوع پر مفصل و مدلل لکھنے کی ضرورت ہے۔ فیضؔ کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' کا تجزیاتی مطالعہ پڑھ کر ڈاکٹر تحسین فاطمہ کی ادبی بصیرت اور تجزیاتی صلاحیت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اور بھی طاقت بھر دے۔ اس بار کا اداریہ بہت حوصلہ افزا ہے۔

آپ نے پروف ریڈنگ پر توجہ کی ہے۔ جس کے سبب اس بار اغلاط بہت کم ہیں۔ بہت بہت مبارکباد۔ شکریہ۔

مخلص

**ڈاکٹرممتازاحمد خاں، حاجی پور**

☆ بھائی سیّد آلِ ظفر صاحب: سلام مسنون

''ساغرادب'' کا شمارہ نمبر۴ کرونائی وبا کے درمیان موصول ہوا۔ اس ادبی تحفہ کے لئے شکرگزار ہوں۔ کرونائی وبا سے زندگی جیسے تھم سی گئی ہے، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں بھی آپ اس حدتک متحرک اور فعال رہے کہ رسالہ شائع کر شائقین ادب تک بذریعہ ڈاک پہنچا بھی دیا۔ یہ کوشش آپ کے صحافتی جوش وجنون کا احساس کراتا ہے۔ اس شمارہ کے





تمام مشمولات لائق مطالعہ ہیں۔ پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر سید آل ظفر، ڈاکٹر مظہر کبریا، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر تحسین فاطمہ، اور ڈاکٹر تسنیم فاطمہ کے مضامین بطور خاص پسند آئے۔ پسند آنے کی وجہ یہ ہے کہ ان مضامین میں لکیر پیٹنے کے عمل سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ زیرنظر شمارہ میں خواتین قلمکاروں کی بڑی تعداد کی شمولیت دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ آپ نسائی ادب کے ساتھ ساتھ خواتین قلم کاروں کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں پر بھی خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ اردو ادب میں خواتین عام طور پر شعری اور نثری تخلیقی ادب میں زیادہ دلچسپی لیا کرتی تھیں، لیکن ان دنوں نئی نسل کی خواتین قلمکار تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہی ہیں، جو کہ لائق تحسین ہے۔ 'ساغرادب' کے مختلف شماروں کے مطالعہ کے بعد آپ کی یہ بات حق بجانب لگتی ہے کہ''.....نئی نسل سے ذوق ادب کا تازہ ظہور لے کر نکلنے والے ہجوم درہجوم ہماری محفل میں آرہے ہیں...''۔

ایک بات کہنے کی جسارت کررہا ہوں کہ اردو کے اساتذہ کرام اگر لکیر پیٹنے کے عمل کے بجائے نئے موضوعات پر توجہ دیں اور اپنے افکار واظہار کا وسیلہ بنائیں تو اردو ادب پر طاری ہوتے جمود کو توڑنے میں کامیاب ہونگے نیز اردو ادب میں گرانقدر اضافہ بھی کرینگے۔ آپ کی کوششوں سے 'ساغرادب' بڑے حلقے تک پہنچ رہا ہے، یہ بات مجلّہ کے آخری صفحات میں شامل بہت سارے خطوط سے ظاہر ہورہی ہے۔ آپ کے حوصلے، جرأت اور جنون کی داد دیتا ہوں اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے 'ساغرادب' کا سفر اسی طرح کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ

**ڈاکٹرسیّداحمد قادری، گیا**

☆ برادرِعزیز مکرم جناب ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب　سلام

آپ کا اُردو جریدہ ''ساغرِ ادبؔ'' کا شمارہ ۱رتا۴رد یکھا اور پڑھا دستیابی کرانے کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آپ فعالیت طالب علمی کے زمانے سے ناچیز نے دیکھا ہے۔ جب پہلی ملاقات آپ سے پروفیسر اشفاق احمد صاحب مرحوم کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔ آپ ان کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کررہے تھے۔ پہلی ملاقات ہی میں اندازہ ہوا کہ آپ بہت فعال اور متحرک ہیں۔ بینکرس کالونی، سعد پورہ میں میں نے اپنا مکان بنایا اور آپ بھی اسی کالونی میں رہتے تھے۔ چنانچہ بہت قریب سے آپ کو دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ آپ ایک علمی اور حکیمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے کئی بھائی ہیں۔ جو اعلیٰ عہدہ پر فائزہ ہیں۔ آپ سب سے چھوٹے ہیں۔ چنانچہ سبھی بھائیوں کا تعاون دامے، دِرمے، سخنے ملتا رہا اور آپ کامیابی کے زینوں کو پار کرتے رہے۔ آپ کی علمی صلاحیت کے بنا پر بہار یونیورسیٹی، مظفرپور میں آپ کا لکچرر کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا اور ملازمت کا آغاز آپ نے ایک ہی بار یونیورسیٹی پوسٹ گریجویٹ شعبہ سے شروع کیا۔ جبکہ ہم لوگوں نے کالج سے شروع کیا۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ بہرکیف یہ آپ کی کاوش لائق تحسین ہے۔

سِہ ماہی ''ساغرِ ادبؔ'' کا سرِ ورق بہت عمدہ، کمپوزنگ بہت صاف وشفاف ہے۔ ''خشت ثانی ازخشت اوّل بہتر'' والی کہاوت ہے۔ مجلس ادارت اور مجلس مشاورت میں ایسے اشخاص کو آپ نے جگہ دی ہے۔ جو اردو ادب کی دنیا میں

بہت شہرت رکھتے ہیں۔شائع ہونے والے مضامین کا انتخاب بھی آپ بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔آخری حصہ نئے لکھنے والے ریسرچ اسکالروں کے لئے آپ نے مخصوص کر دیا ہے۔یہ بہت عمدہ قدم ہے۔میری ناقص رائے ہے کہ اس میں فارسی زبان وادب پر اگر کوئی مقالہ آئے اور آپ اپنے اس جریدہ میں اس کو جگہ دیں تو اور بھی چار چاند لگ جائے گا۔اورآپ کی مقبولیت میں ایک اور اضافہ ہوگا چونکہ فارسی اور عربی پر بغیر عبور حاصل کئے ہوئے ایک اچھا اردوداں نہیں ہوسکتا ہے۔آپ نے ''ساغرِ ادبؔ'' نام رکھا ہے جو فارسی ترکیب کا نمونہ ہے۔میں صمیم قلب سے آپ کو دُعا دے رہا ہوں کہ اللہ آپ کی کاوِش کو برقرار رکھے اور یہ رسالہ خوب سے خوب تر ہو۔وقت پر اور پابندی کے ساتھ نکالنا جوئے شیر سے کم نہیں ہے۔شہر مظفرپور میں ایک معیاری رسالہ نکالنے کی بڑی کمی تھی۔جس کو آپ نے پورا کر دیا ہے۔یہ قدم لائق تحسین۔

آپ کا مخلص

**پروفیسر عید محمد انصاری، مظفرپور**

☆ محترم المقام زید مجد کم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''ساغرِ ادبؔ'' سِہ ماہی جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء موصول ہوا۔بے حد شکریہ اس شمارہ کے اداریہ کی نثری عظمت نے دل کو باغ باغ کر دیا۔جب میں نے اس شمارہ پر طائرانہ نگاہ ڈالا تو محسوس کیا کہ اس کا نثری گوشہ ہو،تبصراتی اوراق ہوں یا دیگر مشمولات، سب لائق تعریف ہیں۔

یہ شمارہ تلاش وتحقیق، ذکر وفکر اور علم وجستجو کے نقوش سے مزیّن ہے۔اداریہ کے بعد حمد اور نعت پاک، سورۂ کہف کا اعجاز میں شستگی، برجستگی اور معنی آفرینی ہے۔شروع کے مقالے نہایت معلومات افزا، عالمانہ اور تحقیقی نوعیت کا ہے۔باقی ماندہ مضامین بھی ساغرِ ادب کے تقاضوں کو حتیٰ المقدور پورا کرتی ہے۔

بہرکیف بہت وقیع اور معلوماتی مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔جو خصوصاً ادب کے طالب علموں اور اساتذہ کے لئے سودمند ثابت ہوں گے۔اس قیمتی اور وقیع سِہ ماہی ''ساغرِ ادب'' جرنل شائع کرانے پر سیّد آلِ ظفر صاحب صد ہا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ راہ کی دشواریوں کے باوجود وہ تسلسل کے ساتھ معیار ومزاج کو برقرار رکھتے ہوئے وقت مقررہ کے ساتھ شائع کرا رہے ہیں۔

بلاشبہ محنت اور محبت ہی بدلتے ماحول میں کامیابی کی شاہ کلید ہے......میری دلی آرزو ہے کہ رسالہ سدا اسی شان سے نکلتا رہے آمین۔آخر میں آپ کو ہر شمارہ کے تمام قلم کاروں کو دلی مبارک باد!

**ڈاکٹر محمد ممتاز عالم، مدھے پورہ**

☆ برادرم ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب

تسلیمات

''ساغرِ ادبؔ'' کا چوتھا شمارہ موصول ہوا۔اداریہ میں آپ کی حوصلہ مندی متاثر کرتی ہے۔یہ شمارہ پچھلے شماروں کی بنسبت زیادہ متنوع ہے۔عمدہ مضامین یکجا کر لئے ہیں آپ نے۔

ISSN : 2582 - 3612



پروفیسر قمر جہاں کا مضمون نسائی مطالعہ کی مثال ہے۔کرشن چندر کے تعلق سے ان کی دلیلوں کا معروضی جواب دیا جا سکتا ہے۔البتہ راجندر سنگھ بیدی کے تعلق سے ان کی تنقیدی رائے وزنی ہے۔پروفیسر علیم اللہ حالی کی نظم ''ہوا سے ایک گفتگو'' کا تنقیدی مطالعہ تجزیاتی نوعیت کا ہے۔حالی صاحب کی نظم کے وسیلے سے مضمون نگار نے اقبالؔ اور ییٹس سے بھی تھوڑی بحث کر لی ہے۔ییٹس کی نظم کا بھی تو انہوں نے باضابطہ حوالہ بھی پیش کیا ہے۔مضمون کے آخر میں ممتاز صاحب کی رائے کے غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ، ورڈز ورتھؔ، شیلیؔ، ییٹسؔ، چکبستؔ، فیضؔ، سردارؔ جعفری اور علیم اللہ حالی سب ایک ہی قبیلہ کے شعراء ہیں، ہضم ہونے والی بات نہیں۔یہ انتہائی سرسری انداز کی تنقید ہے۔

اقبالؔ کی نظم ''ساقی نامہ'' پر آپ کا مضمون متاثر کرتا ہے۔''ساقی نامہ'' مجھے بھی بے حد پسند ہے۔ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے حسین الحق کے ناول ''اماوس میں خواب'' کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔اور یقیناً یہ حاصل شمارہ مضمون کہا جا سکتا ہے۔نئی ادبی نسل میں جو چند فکشن کے نقاد سامنے آئے ہیں۔ان میں شہاب ظفر اعظمی امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر کبریا کا مضمون ''ابن صفی'' پر دلچسپی سے اس لئے پڑھا کہ مجھے ابن صفی کے ناول بہت پسند ہیں اور بلاشبہ ابن صفی کے ناولوں نے اپنے قارئین کا وسیع تر حلقہ پیدا کر لیا تھا۔بڑے بڑے ادیب اور شاعر ان کے ناول تکیے کے نیچے رکھا کرتے تھے۔اور انہماک کے ساتھ پڑھتے تھے۔

''عصرِ حاضر میں سرسیّد تحریک کی معنویت'' اچھا مضمون ہے۔طلبہ کے لئے یہ مضمون استفادہ کے لائق سمجھئے باقی مضامین بھی متوجہ کرتے ہیں۔گویا اس شمارہ میں بھرپور ادبی مضامین آپ نے اکٹھا کر لئے ہیں اور کامیابی کے ساتھ انہیں ایڈیٹ بھی کیا ہے۔اردو زبان کے اکابرین پر یہ مخصوص شمارہ کہا جائے گا۔

میری ڈھیر ساری مبارکباد قبول فرمائیں۔

آپ کا اپنا

**ڈاکٹر جمال اُویسی، دربھنگہ**

☆ مدیر محترم السلام علیکم

معمولاً رسالہ دستیاب کرانے کے لئے شکریہ۔

ایک عمدہ اور خالص ادبی رسالہ تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے آپ خصوصی طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔بلا شبہ ''ساغرِ ادب'' اپنے پہلے شمارہ سے ہی صوری اور مشمولات کے اعتبار سے توجہ طلب ہے۔اس لئے ادبی حلقہ میں پسند کیا جا رہا ہے۔چوتھا شمارہ زیر نظر ہے۔رسالہ کی روایت کے مطابق مشمولات کی ابتداء حمد اور نعتِ پاک سے ہوتی ہے اور چالیس مضامین کے ساتھ ''ساغرِ ادبؔ'' کے تیسرے شمارے کے تعلق سے اہلِ علم ودانش کے تاثرات، تسکین ذوق فراہم کرتے ہیں۔شمارہ دوسو آٹھ صفحات کو محیط ہے۔مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔ان میں دو چار کا ذکر اور بقیہ سے گریز مناسب نہیں معلوم ہوتا لہٰذا رسالہ ادبی حلقہ کے لئے ایک ادبی تحفہ سے کم نہیں ہے۔

فقط والسّلام

**ڈاکٹر عبدالبرکات، مظفرپور**

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

☆ برادرِ گرامی ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب! سلام و نیاز

''ساغرِ ادبؔ'' کا شمارہ ۴/ (جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء) موصول ہوا، شکریہ۔ حسب سابق اور حسب توقع آپ کا یہ تازہ شمارہ بھی گراں قدر اور لائق تحسین ہے۔ ''حمد'' اور ''نعت'' کے علاوہ چالیس مضامین پر مشتمل یہ شمارہ قابلِ استفادہ اور بصیرت افروز ہے۔ مشمولات کے کئی مضامین بے حد پسند آئے۔ سابق شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی متنوع نوعیت کا ہے۔ مختصر مدت میں ہی آپ نے ''ساغرِ ادبؔ'' کو جدید اردو رسالوں کی فہرست میں جو شناخت قائم کرادی ہے۔ وہ آپ کے یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے اصول پر کار بند رہنے کی غماز ہے۔ ''ساغرِ ادبؔ'' میں آپ نے نئے اور پرانے لکھنے والوں کا جو سنگم تیار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ رسالہ میں ایک کمی جو کھٹکتی ہے۔ وہ اس میں تبصروں کے کالم کے غیر موجودگی اور شعری حصے کی عدم شمولیت۔ امید کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر آپ اپنی مجلسِ ادارت اور مجلس مشاورت میں غور و فکر کر کے قارئین کے جذبات اور ان کی پسند کے تعلق سے کوئی مثبت فیصلہ لینگے۔ رسالہ کے اخیر میں اس کے تعلق سے دانشوروں کے تاثرات یقیناً آپ کے لئے حوصلہ افزا ہیں۔ میری بھی دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے رسالہ اور آپ کے تعلق سے جس نے بھی یہ شعر کہا ہو میں بھی اس پر آمین کہتا ہوں ۔

ادب کے ساگر میں ہے ساغرِ ادب روشن
خدا کرے کہ جنونِ ظفرؔ کمال کرے

نوٹ: ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر، مدیر (اعزازی)

خیر اندیش

**انوار الحسن وسطوی، حاجی پور**

☆ گرامیٔ قدر ایڈیٹر صاحب..........عقیدتیں

''ساغرِ ادبؔ'' نے ادبی و صحافتی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ مختصر و محدود وسائل کے باوجود اِس رسالے نے جو عالمی مقام و مرتبہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے، یہ ایک نیک فعال ہے۔

نامور لکھنے والوں کا بھرپور تعاون بھی اِس بات کا ثبوت ہے کہ ''ساغرِ ادبؔ'' اردو صحافت کی جدید تاریخ کا ایک اہم نام ہے۔ پروفیسر سید آلِ ظفر کی عالمانہ، دانشورانہ اور صحافتی صلاحیتوں کا معترف ہونا ہی پڑتا ہے۔

میرے خیال میں آج کے اِس مشینی دور میں رسالہ نکالنا جوکھم بھرا کام ہے۔ یہ صرف اردو کے ساتھ ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی کئی زبانوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اُردو رسالہ کو دیکھنا اور زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں خرید کر اور اگر ممکن ہو تو سالانہ خریدار بن کر اُردو زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ زبان پڑھنے والوں سے زندہ رہتی ہے۔

خادم اُردو

**ڈاکٹر جلال اصغر فریدی، مظفر پور**

☆ محترم جناب پروفیسر (ڈاکٹر) سیّد آلِ ظفر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی نوازشوں کے طفیل ''ساغرِ ادبؔ'' کے دو شمارے موصول ہوئے جس کے لئے میں بے حد ممنون و مشکور





ہوں۔ جزاک اللہ دونوں شمارے خوب سے خوب تر ہیں۔ جس قدر اس کے حسن ظاہری قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس سے ہزاروں گُنا اس کے حسن باطنی اپنی جانب اِرتکاز فکر کرتے ہیں اور کسی مجلّے کے لئے ان اوصاف کا پیدا ہو جانا اس کے مدیر کی علمی و فکری بصیرت کا بیّن ثبوت ہے۔ میں لاکھ کوششوں کے باوجود اس کا بالاستعیاب مطالعہ نہیں کر سکا مگر جن مضامین کو بھی دیکھ سکا خوب سے خوب تر پایا۔ خط لکھنے والوں میں پروفیسر نجم الہدیٰ، پروفیسر شارب رُدولوی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور پروفیسر عبدالمنان طرزی کے خطوط علمی و ادبی مباحث اور پذیرائی کو لئے ہوئے ہیں۔ آپ کے دونوں شماروں کے آغاز میں حمد اور نعت کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کے محسوسات نہایت ہی صالح اور پاکیزہ ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے ان کا دائرہ تیمناً و تبرکاً ہی رکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب! حمد و نعت عصرِ حاضر میں صرف ایک سرمایۂ اُخروی ہی نہیں بلکہ اصناف ادب میں یہ واحد صنف ہے جس پر کبھی کہنگی نہیں طاری ہوئی۔ اور نہیں صبح قیامت تک طاری ہوگی۔ آج بہت سے اصناف کے چراغ گل ہو چکے ہیں۔ یا چراغ صحری کی مانند ٹمٹما رہے ہیں۔ مگر نعت رسول مقبول ﷺ کی کل بھی تاب و تواں تھی اور کل بھی رہے گی۔

میری دلی خواہش ہے کہ آپ کے اس علمی و ادبی جریدے میں ''دبستانِ نعت'' کا تعارف ہو اگر کسی اسکالر سے کچھ لکھوا سکیں۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوگا کہ لوگ اس صنف ادب پر بھی اپنے فکر و فن کا اظہار ضرور کریں گے۔ اور یہ بھی ادبی مباحث میں جُڑ جائے گی۔ اگر اس مراسلے میں آپ کے طبیعت کے خلاف کوئی بات تحریری ہوگئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

خیر اندیش

**ڈاکٹر سراج احمد قادر، خلیل آباد، سنت کبیر نگر**

☆ برادرِ محترم۔ تسلیمات

''ساغرِ ادبؔ'' کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ

اس شمارے (شمارہ چار) کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ آپ شوق ادارت میں نہیں بلکہ ایک واضح مقصد کے تحت ''ساغرِ ادبؔ'' کے شمارے شائع کر رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید اور درسی مضامین کی اشاعت کی طرف آپ کی رغبت اس بات کی دلیل ہے۔ اس شمارے کا آغاز ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے حمدیہ اور پروفیسر عظیم الرحمٰن صاحب کے نعیہ کلام سے ہوا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ مناظر صاحب کی حمد و ثنا اور عظیم صاحب کی نعت گوئی سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔

پروفیسر عبدالواسع، پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر ممتاز احمد خان ہمارے بزرگ سینئر ادباء ہیں۔ ان کے مضامین ہمارے لئے بہت بیش قیمتی ہیں۔ دوسرے ادباء میں جمال اُویسی، شہاب ظفر اعظمی، مظہر کبریا، ذاکر حسین، ریحان حسن، ضیاء الحق، سمیع الحسن، شاہ فضل اللہ فاتح، دستگیر احمد، تسنیم فاطمہ وغیرہ نے اپنے مضامین کے ذریعے ہیچ مداں کے چلو بھر علم میں گاگر بھرا اضافہ کیا۔ اس ضمن میں آپ کے مضمون ''ساقی نامہ'' کی فنی و فنی خوبی کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔

آپ نے ریسرچ اسکالرز کے لئے بہترین پلیٹ فارم تیار کر دیا ہے۔ اب وہ یہاں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا

سکتے ہیں۔لیکن خیال رہے کہ نئے شعراء ادباء کو ابھی مضمون کا موضوع بنانا نہ صرف رسالے کو ہلکا کرنا ہے۔ بلکہ ان کے لکھنے والوں کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔ بہار میں ابھی بہت سے سینئر اور بزرگ ادباء وشعراء گوشۂ گم نامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ان پر قلم اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔فی الحال ایسی شخصیات پر ہی مضامین شائع ہوں تو بہتر ہے۔

''ساغرِ ادبؒ'' کے گذشتہ شمارے میں ہمارے ایک دوست نے لکھا ہے کہ اس میں شاعری کی بھی شمولیت ہونی چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں اس رسالے کا اپنا ایک انفراد اور نصب العین ہے۔ یہ خالص ریسرچ جرنل ہے اور اس میں مدیر نے بطور خاص تحقیق وتنقید اور تدریسی موضوعات کو ترجیحی حیثیت دی ہے۔اس لئے اس میں شاعری یا دیگر اصناف کی شمولیت پر اصرار مناسب نہیں۔اس سے رسالے کا متعینہ مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس لئے میرا مشورہ ہے کہ مدیر محترم رسالے کے موجودہ فارم کو ہی جاری رکھیں۔شاعری اور دوسری اصناف کے لئے بے شمار رسالے پٹے پڑے ہیں۔کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

''ساغرِ ادبؒ'' نے محض تین چار شمارے میں ہی جو مقام اردو دنیا میں بنا لیا ہے، میں سمجھتا ہوں رسالوں کی آمد و رفت کی دنیا میں ایسا کم ہی ہوتا ہے، اس کے لئے آپ کو بہت بہت مبارکباد۔شکریہ

**ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، بتیا**

☆ جناب سید آلِ ظفر صاحب......آداب

امید ہے مزاج بخیر ہونگے۔جیسے ہی 'ساغرِ ادب' کا شمارہ (جنوری تا مارچ) ملا دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ لاک ڈاؤن میں ایسے نامساعد حالات میں 'ساغرِ ادب' کیسے مل گیا؟ لیکن اتنا خوبصورت اور ضخیم رسالہ دیکھ کر خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ Blue کلر کے کور پیج کے ساتھ 'ساغرِ ادب' کا چوتھا شمارہ منظرِ عام پر آیا ہے۔اس سے پہلے بھی تین شمارے پابندی کے ساتھ شائع ہوئے ہیں جس کے لئے میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ جہاں ایک طرف احمد عثمانی کے انتقال کے بعد 'بیباک' جیسے معیاری پرچے بند ہو رہے ہیں وہی دوسری طرف 'ساغرِ ادب'، ادبی نشیمن، ادب گاؤں وغیرہ جیسے رسالے بھی جاری ہو رہے ہیں، حالانکہ بیباک بہت عرصے سے شائع ہو رہا تھا اور شاید ہی 'بیباک' جیسا رسالہ اب ہمیں پڑھنے کو ملے۔احمد عثمانی صاحب نے اس کے کئی ضخیم نمبر جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل رہے وہ بھی شائع کئے ہیں مثال کے طور پر خواتین نمبر، افسانہ نمبر وغیرہ لیکن 'ساغرِ ادب' اگر یوں ہی پابندی سے شائع ہوتا رہا تو واقعی ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد پہچان قائم کر لے گا۔اس وقت میرے سامنے 'جنوری تا مارچ' کا شمارہ ہے جس میں 31 مضامین شامل ہیں۔اتنی طویل فہرست بہت کم رسالوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اگر اِن سبھی مضامین کے نام ہی لکھ دیے جائیں تو اچھا خاصہ مضمون ہو جائیگا۔ایک سے بڑھ کر ایک معیاری مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔اس شمارے میں میرا بھی مضمون شامل کیا ہے جس کے لئے شکرگزار ہوں۔ مضامین میں قمر جمالی کا مضمون 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار اور عورت کا تصور' بہت پسند آیا۔اس مضمون میں انہوں نے اُن غیر مسلم افسانہ نگاروں کا بھرپور جائزہ لیا ہے جنہوں نے عورتوں کو موضوع بنا کر افسانے لکھے ہیں۔ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری بھی ہے۔اس مضمون میں قمر جمالی نے کئی متاثر کن اقتباس پیش





کئے ہیں۔۔امید کرتی ہوں کہ اگلا شمارہ بھی اسی طرح وقت پر ملے گا۔اس کامیاب شمارے پر مبارکباد۔

فقط

**استوتی اگروال، اگروال جیولرز، سرونج)، (ایم پی)**

☆ محترمی سید آلِ ظفر صاحب! سلام ورحمت

''ساغرِ ادبؒ'' کا چوتھا شمارہ پیش نگاہ ہے۔گذشتہ شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی لائق تحسین وقابلِ مبارک باد ہے۔مضامین کے انتخاب میں آپ کی فراخ دلی وادب دوستی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت آپ کو صحت وعافیت سے نوازے اور ''ساغرِ ادبؒ'' کا شمارہ در شمارہ یونہی منصۂ شہود پر آتا رہے۔

آپ کا

**ڈاکٹر محمد ارشاد علی، کولکاتا**

☆ ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عزیزم محمد امام الدین امام سلمہٗ سے سہ ماہی ''ساغرِ ادبؒ'' جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء موصول ہوا۔اس کی دلفریبی اور مشمول سارے مضامین سے متاثر ہو کر مندرجہ ذیل چار مصرعے عرض ہیں۔مبارکبادی کے ساتھ ۔

نازاں ہیں اس کو دیکھ کے سب ماہرِ ادب
خنداں ہیں اس کی دلکشی پہ شاعرِ ادب
آلِ ظفر کی کوشش نایاب و دلفریب
کوزے میں جیسے آ گیا ہے ''ساغرِ ادب''

**محفوظ عارف، مظفر پور**

☆ کرم فرما ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب تسلیمات!

''ساغرِ ادبؒ'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ شمارہ ظاہری وباطنی ہر اعتبار سے خوب ہے۔ ''ساغرِ ادبؒ'' کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر شمارے میں مشاہیر ادب کے ساتھ نئے نسل کے قلم کاروں کو بھی جگہ دی جا رہی ہے۔جس کے لئے آپ خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ ہر شمارے کو وقت پر شائع کر کے آپ نے اپنے فعالیت اور سلیقہ مندی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔خاکسار کو مجلس مشاورت میں شامل کر کے آپ نے میری توقیر میں اضافہ کیا ہے۔جس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔دور حاضر میں اُردو کا رسالہ نکالنا ایک دشوار کام ہے۔لیکن آپ نے اپنی ہنرمندی سے اسے آسان بنا دیا ہے۔دعا ہے کہ آپ اسی خلوص نیتی سے اُردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کرتے رہیں۔ تاریخ یقیناً آپ کے خدمات یاد رکھے گی۔

خادم اردو

**ڈاکٹر احمد معراج، کولکاتا**

☆ مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

آداب وتسلیمات!

''ساغرادب'' کا چوتھا شمارہ نظرنواز ہوا۔تمام مشمولات اچھے لگے۔آپ نے اس رسالے کی تزئین اور ترتیب میں جس خوش اسلوبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ کی ادب نوازی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بہرحال تمام مضامین معیاری اور عمدہ ہیں۔آپ کا اداریہ بھی ادب نوازوں سے بہت کچھ طلب کررہا ہے۔پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی حمد کے بیشتر اشعار دل کو چھورہے ہیں۔ پروفیسر قمر جہاں کا مضمون ''اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار اور عورت کا تصور'' کا مطالعہ اچھا لگا۔ پروفیسر نبی احمد صاحب کا مضمون ''لطف الرحمٰن کی نساخ شناسی پر ایک نظر''معلوماتی اور تحقیق طلب ہے۔انہوں نے نہ صرف لطف الرحمٰن کی نساخ شناسی کو پیش کیا ہے بلکہ تحقیق کے سلسلے میں ان کی انفرادیت کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی صاحب کا مضمون ''اماوس میں خواب: معاصر ہندوستان کا استعارہ'' اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔حسین الحق کے اس ناول کا اتنا فنکارانہ تجزیہ کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔گوشۂ ریسرچ اسکالر میں شامل شبنم مرزا اور محمد شبیر عالم کے مضامین قاری کو اپنی جانب متوجہ کررہے ہیں۔

**ڈاکٹر ارشاد شفق، رانی گنج، مغربی بنگال**

☆ ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر صاحب

آداب تسلیمات!

آپ کا سہ ماہی پرچہ ''ساغرِ ادب'' (مظفرپور) ڈاکٹر احمد معراج کے ذریعے دستیاب ہوا۔اس طرح اس بے حد معیاری جریدہ کو پڑھنے کا حسین موقع پروردگار نے فراہم کیا۔آپ کی نگاہ انتخاب کو سلام پیش کرتا ہوں کہ بزرگ قلم کاروں کے ساتھ کولکاتا کے نوجوان شاعر و ادیب ڈاکٹر احمد معراج کو مجلس مشاورت میں شامل کرکے آپ نے ایک قابلِ تحسین قدم اٹھایا ہے۔

اس سہ ماہی پرچے کی خصوصیات کا ذکر کروں تو اردو زبان و ادب کے کئی نامور شخصیتیں پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر نجم الہدیٰ، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر رئیس انور، پروفیسر حمید سہروردی، (گلبرگہ) پروفیسر قاضی حبیب احمد (چنئی)، ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی اور ڈاکٹر منظر حسین مجلس مشاورت میں نظر آرہے ہیں۔آپ کا جریدہ ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے منفرد ہے۔اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب و تذہین میں آپ نے بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ نئے لکھنے والوں کی تحریریں شامل کرکے آپ ان کی ذہنی تربیت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔آپ نے ''ساغرِ ادب'' میں جن ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا ہے ان میں سے بیشتر کی حیثیت ادب میں مستحکم ہے۔سب کے لئے میری نیک تمنائیں، دعائیں ساتھ ہیں۔ویسے تو سبھی خاص ہیں لیکن اب تک جن کی تحریر مطالعہ میں آچکی ہیں۔ان میں پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ڈاکٹر احمد معراج اور جناب ذکی ہاشمی وغیرہ اہم ہیں۔ان کے علاوہ ان تمام قلم کاروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں





جنہوں نے اپنے نوک قلم سے اس پرچے کو پروقار بنایا ہے۔مجھے امید ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ رسالہ روزافزوں ترقی کرے گا اور آنے والے دنوں میں **''ساغرادب''** مرکز نگاہ ادب بنے گا۔

**اشرف یعقوبی، کولکاتا**

☆ محترمی سید آل ظفر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''ساغرادب'' کا تیسرا شمارہ موصول ہوا۔میں تقریباً چار ماہ سے کافی مشغول رہا ہوں۔اس درمیان ادبی سرگرمیاں بھی معطل ہوکر رہ گئیں۔ جب آپ کا دوسرا شمارہ موصول ہوا تھا اس وقت بھی کوئی تبصرہ نہیں کرسکا تھا اور نہ آپ کو مبارکباد پیش کرسکا تھا۔کورونا وائرس نے دو دنوں سے گھر میں بند رہنے پر مجبور کردیا ہے۔اچانک آپ کا خیال آیا کہ کیوں نہ آپ کو اس موقع پر خط لکھ ڈالوں۔

محترمی آپ کا یہ ادبی رسالہ ایک گراں قدر اضافہ ہے اور بہار سے نکلنے والے رسالوں میں ممتاز بھی ہے۔ آپ کی اس کاوش پر میری جانب سے ڈھیر ساری مبارکباد قبول کیجئے۔

آپ نے حمد کے بعد ایک بزرگ استاذ، ادیب و شاعر جناب فاروق احمد صدیقی کے نعتیہ کلام سے اس کی ابتداء کی ہے اچھا لگا۔

مشمولات میں پندرہ خطوط شامل ہیں ان میں اکثر بڑے قلم کار ہیں جن کی تخلیقی بصیرت کی پوری دنیا قائل ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اس میگزین کے ذریعے دنیائے ادب میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے لئے آپ بھرپور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اگلے شمارہ کا انتظار رہے گا۔

آپ کا مخلص

**ڈاکٹر عالمگیر شبنم، دربھنگہ**

(تیسرے شمارہ کا مراسلہ)

☆☆☆